ماہنامہ
حکایت
لاہور
اپریل 2014ء
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
قیمت 75/- روپے

نُورِ مُبین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تم فرماؤ! کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور تمہیں کیا خبر کہ جب وہ آئیں تو یہ ایمان نہ لائیں گے

(انعام:109)

جلد :43 | اپریل 2014ء | شمارہ :8

قیمت -/75 روپے

مدیر : عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر فضل رزاق 0343-4300564
عرفان جاوید 0322-4847677

ہیڈ آفس: 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور۔
042-37356541
ای میل اس پتہ پر بھیجا کریں Monthly_hikayat@hotmail.com

اس شمارے میں

اس شمارے میں

کہنے کی بات

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے؟

قائداعظم محمد علی جناح کو قدرت اگر زندگی کے چند برس اور عطا کر دیتی تو یہ بات یقینی تھی کہ پاکستان کا وفاق ایک سو کے لگ بھگ انتظامی یونٹوں پر مشتمل ہوتا۔ جس میں مقامی حکومتوں کے پاس مکمل مال و انتظامی اختیارات ہوتے۔ حکومت ایک ایسے صدر کی ہوتی جسے قوم نے بلاواسطہ طور پر ایک شہری ایک ووٹ کی بنیاد پر منتخب کیا ہوتا۔ یقینی طور پر ایک پارلیمنٹ بھی ہوتی جس کا کام قانون سازی، احتساب اور عوام پروری کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔

پاکستان کو یقینی طور پر وفاق کی ہی حیثیت میں سامنے آنا چاہیے تھا جو درجنوں اکائیوں پر مشتمل ہوتا اور ہر وفاق خود مختار انتظامی یونٹ ہوتا۔ وہ یونٹ اپنی بہتری اور اپنے عوام کی فلاح کے لیے اپنی مدد آپ کے تحت کام کرتا۔ اس کو کسی بے فکر سیاسی قیادت اور نا اہل افسر شاہی کا محتاج نہ رہنا پڑتا۔ نا ہی تجربے سنگین حالات کا سامنا ہوتا۔ نا ظلم دن بدن طویل قامت ہوتا جاتا۔ انصاف کالے بادلوں میں گھرا نظر ناں آتا۔ آپس کی چپقلش سے عوام کا جینا دوبھر ناں ہوتا۔ مظلوم بے یارو مددگار ناں ہوتا۔ کوئی کتا بھی اس پاک سرزمین پر بھوکا نہ سوتا...... قصہ مختصر یہ حالات و واقعات اور صورت حال یہ ناں ہوتے جس سے آج ہم سب دوچار ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"ایمان والے ایک جسم کی طرح ہیں اگر آنکھ کو تکلیف ہو جائے تو سارا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

ہم جس پاک سرزمین کے باسی ہیں وہ بھی ایک جیتا جاگتا جسم ہے۔ اُس کے کسی حصے کی تکلیف پورے جسم کے لیے باعثِ تشویش ہو جاتی ہے۔ تھر میں مخدوش حالات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس قحط زدہ علاقے کا دورہ کرنا کسی ذی شعور کو نصیب نہیں ہوا۔ فاقوں کا شکار ہونے والوں کا کسی کو احساس نہیں ہوا۔ پیاس سے مرنے والوں کی تکلیف کو کوئی نا دیکھ سکا۔ آج وہ تکالیف ایک ناسور کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ان پر اس وقت ترس کھایا جاتا ہے...... امدادی ٹیمیں جب روانہ ہوتی ہیں...... کھانے پینے کا سامان تب مہیا کیا جاتا ہے جب سینکڑوں افراد انواع و اقسام کے کھانوں سے لطف اندوز ہونے والوں کے سامنے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

بڑے بڑے محلات میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والے اور ہر قسم کی نعمت سے سیر ہونے والے اس صحرا کی تپش، بھوک اور پیاس کو کیونکر محسوس کر سکتے تھے۔ اگر نظام حکومت انسان دوست ہوتو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ حکمران اگر احساس ذمہ داری اور عوامی حقوق سے آگاہ ہوتے تو انسان کیا وہاں کے حیوانات بھی تلف نہ ہوتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ "فرات کے کنارے اگر کوئی کتا بھی پیاس سے مرے گا تو عمر اللہ کے سامنے اس کا ذمہ دار ہوگا۔" یہ تھا ان کا احساس ذمہ داری، جذبۂ حکمرانی اور خدمتِ خلق کا معیار، روم اور ایران کے وفود اسلام کے اس عظیم سپوت کو حیرت حسرت سے دیکھتے جو اینٹ پر سر رکھ کر بغیر کسی پہرہ دار کے سوتا ہے۔ اس کے بیٹھنے کے لیے کوئی تخت اور رہنے کے لیے کوئی شاہی محل نہیں تھا اور وہ پھر بھی امیر وقت تھا۔ آج ہم خواہش کرتے ہیں کہ اچھے کہلائیں لیکن بے حسی نے ہم سب کے کردار کو گھن لگا دیا۔ لالچ ہماری شخصی کمزوری میں ڈھل گئی اور بددیانتی ہمارا روزمرہ کا معمول بن گئی ہے۔ اگر کچھ عرصے تک مزید یہ حالات رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہم سب اسی کشتی کے سوار ہوں گے جس کا شکار آج صحرائے تھل ہے۔

صالحہ شاہد بنت عنایت اللہ

دعائے مغفرت

مدیر حکایت عارف محمود صاحب کے والد گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ مرحوم محب وطن پاکستانی تھے۔ وہ حکایت اور محترم عنایت اللہ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔ (ادارہ)

گزشتہ سے پیوستہ

تُو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی!

ساقی چیمہ

اس وقت سارا پاکستان لال مسجد ہے اور اس ملک کے عوام دہشت گردوں کے یرغمال ہیں اس لیے پورے پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن آپریشن ہونا چاہیے۔

ہمارا عہد ایک ہمہ گیر کثیر الجہتی زوال سے گزر رہا ہے اور ایسے میں زندگی کا ہر شعبہ زوال پذیر ہے چاہے وہ اچھے سے اچھا ہو یا برا ہو حتیٰ کہ دینی لحاظ سے بھی اس کا شکار ہے۔ ایک زوال قدرتی ہوتا ہے جو مخصوص عرصہ کے بعد ضرور آتا ہے مگر انسانی کردار اس زوال کی رفتار کو کم یا زیادہ کرتا ہے۔ قدرتی زوال ایک خاص عرصے کے بعد بہر صورت اپنے انجام کو پہنچتا ہے مگر دانش مندانہ قیادت اس کی صورت گری سے نئے راستے نکال کر حالات پہ قابو پا سکتی ہے۔

20 ویں صدی کے وسط میں نصف سے زائد دنیا پر حکومت کرنے والے برطانیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ تمام مقبوضات چھوڑ کر بھی وہ عالمی سطح پر فیصلہ کن کردار کا حامل ہے۔ سیاست کو چھوڑیں ہم مذہبی لحاظ سے زوال کا شکار ہیں...... اس لیے کہ 1400 سال میں یہ دُنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے خصوصاً گزشتہ 200 سو سال میں اور ہمارے دینی رہنما ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے کہ کوا حرام ہے یا حلال ہے بلکہ یہ اُن کے لیے ایک علمی بحث کا موضوع ہے۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ جاہل ملاؤں نے دین کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ عام آدمی کے لیے اس کو گورکھ دھندہ بنا دیا ہے۔ مکمل اسلام کے جاہل عربوں کے رسوم و رواج اسلامی اصول اور مسخ شدہ تاریخ کو ملا کر ایک ملغوبہ بنا دیا ہے اور اس میں جاہل ملاؤں کے مفادات اور جہالت شامل ہونے کے بعد دین کی ایسی شکل سامنے آئی ہے جسے کوئی عقلمند شخص قبول کرنے سے ہچکچاتا ہے مگر عوام اپنی جہالت کے سبب اس کے پیچھے چلتے ہیں ایک سب سے اہم سبب یہ ہے کہ محض عبادات (جو کہ حقوق اللہ ہیں) ان کو سارا دین قرار دے دیا گیا ہے اور عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ پانچ وقت نماز ادا کرنے سے ان کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ یہ ایک حماقت اور جاہلیت ہے کہ محض حقوق

اللہ ادا کرنے سے انسان روز حساب بچ جائے گا۔ جناب آپ نماز کو لیں یہ ملا کہتے ہیں کہ ہر حالت میں نماز ادا کرو اور جو بھی ہو نماز قضا ناں کرو۔ درست ہے کہ نماز کا حکم جگہ جگہ بار بار آیا ہے اور نماز سے غفلت گناہ ہے مگر آپ اس بات پر غور کریں کہ نماز برائی سے روکتی ہے اور یہ کہ روز محشر سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا۔

قارئین فرقہ پرستی کس نے پھیلائی میں نے نہیں آپ نے نہیں ملاؤں نے پھیلائی۔ انسان کو کافر اور مسلمان میں تقسیم کس نے کیا؟ ملا نے کیا جبکہ قرآن کہتا ہے کہ جو قرآن کے مطابق چلے گا وہ جنت میں جائے گا چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ ہم نے اس ملک میں آنکھ کھولی جہاں ساری دنیا تفریح کے لیے آتی تھی جہاں کی سرسبز وادیاں پہاڑ اور آبشاریں مشہور تھیں جہاں کے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ مہمان نواز ہیں اور سیاح ہوٹل ناں جائیں تو کسی کے مہمان بن جائیں۔ جہاں چار موسم کھلتے تھے آج وہی چمن جل رہا ہے خوں خوار طالبان اس دیس میں اپنے خونی پنجے گاڑ چکے ہیں اور شہ رگ کی طرف بڑھ رہے ہیں ہر طرف نفرت کا بول بالا ہے ملا ہمیں فرقوں میں بانٹ رہے ہیں ملک بانٹ چکے ہیں۔ مہمان نواز پاکستانیوں کی جگہ انتہا پسند جاہلوں نے لے لی ہے۔ انتشار پسند اور دہشت گرد طالبان نے برداشت تحمل محبت سب کو ختم کر دیا ہے۔ دنیا کے 200 سے زائد ممالک میں 150 سے زائد نے اس ملک کو ممنوعہ قرار دیا ہے اور دنیا میں سب سے خطرناک ممالک میں یہ ملک دوسرے نمبر پر ہے یہ وہ چمن نہیں ہے جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی یہ وہ ملک نہیں ہے جہاں میں شیعہ تعزیہ کے ساتھ والی گلی میں اپنا تعزیہ لے کے چلتا تھا دہشت گردوں نے اسے جہنم بنا دیا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ ماتم تو صرف دسویں محرم کو ہوتا تھا آج ہر روز ماتم کیوں ہوتا ہے؟ کیا وقت کے یزید اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ حسینیت پہ چلنے والوں کا ذکر تک نہیں ہوتا کیا انسانیت ملائیت سے ہار گئی ہے؟ کیا عبادت پرستوں نے خدا کے نام پہ انسانوں کو جانور بنا کر ان کے گلے کاٹنا دین قرار دے دیا ہے؟ میری اس جنت میں یہ شیطان فرقہ پرست کافر کہاں سے آ گئے ہیں جو انسانیت کے درجے سے اس قدر گر گئے ہیں کہ دنیا کے کثیر ممالک نے اس کے علاقے کو انسانوں کے لیے منع قرار دے دیا ہے۔

جناب یہ ملا انسانیت کو گمراہ کر رہے ہیں مساجد میں لکھا ہے کہ روز قیامت سب سے پہلے نماز کا پوچھا جائے گا میرا سوال ملاؤں سے یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے پڑوسی کو قتل کر کے اس کا بچہ فروخت کر دیا اس کے گھر پہ اس کی بیوی پہ ناجائز قبضہ کر لیا اور یونہی کرتا رہا تو روز قیامت کیا اللہ اس سے سب سے پہلے یہ پوچھے گا کہ تم نے نماز پڑھی تھی یا نہیں اور اگر وہ کہے گا میں روزانہ پانچ نمازیں پڑھتا تھا تو کیا اس طرح وہ معافی کا حقدار ہوگا؟ ایک شخص روز شراب پیتا ہے مگر انسانوں سے اس کے تعلقات اچھے ہیں دوسرا روز نمازیں پڑھتا ہے مگر اس طرح کہ ایک صاحب جن کا مجھے پتہ ہے کہ 15 سال تک روز باجماعت نماز پڑھتے تھے پھر بیمار ہوئے تو بارہ دن تک کوئی ان کا پتہ کرنے نہیں آیا اور وہ اس کے بعد بھی مسجد نہیں گئے تو کیا اللہ ان نمازیوں کو معاف کر دے گا جو ٹکریں مارنے کے لیے مسجد میں آتے تھے۔ ان ملاؤں نے اپنی جنت کے چکر میں ہماری دنیا کو دوزخ بنا دیا ہے...... عرض ہے:

اوپر کوئی دنیا ہے جو حوروں سے بھری ہے
کیا گیسو و رخسار کیا جلوہ گری ہے
ہر شاخ گلستان تمنا کی ہری ہے
واعظ کا مصلا نہیں لالچ کی دری ہے
اک فکر ہے سب کو مصیبت کی گھڑی ہے
دوزخ میں ہے دنیا اسے جنت کی پڑی ہے

قارئین جنت آخری مقام نہیں ہے قرآن کے مطابق اس سے بھی آگے مقام ہے مگر 25 ٹی وی چینلو نے دکھایا کہ معصوم بچوں کو خودکش بمبار بنانے والے جاہلوں نے ان کو صرف اور صرف جنت کا لالچ دیا تھا اور جنت کی باتیں بتائی تھیں میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ملاؤں نے دین کی روح کو مسخ کر دیا ہے اور معصوم عوام کو جہالت کے راستے پہ ڈال دیا ہے۔ نبی پاک ﷺ کے ذریعے ہم تک قرآن پہنچا اور قرآن صرف سچ ہے۔ اور یہ ملا اپنی روزی روٹی کے لیے اپنے پیٹ کے لیے تمہیں دوسرے چکروں میں ڈال رہے ہیں۔ ابھی اس ہفتے فتویٰ آیا ہے کہ مریخ کا سفر حرام ہے اور مسلمان مریخ پہ نا جائیں اس لیے کہ زمین کا ایک چاند ہے جس کے مطابق یہ حج روزہ کرتے ہیں اور مریخ کے دو چاند ہیں اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں تو جس طرح پہلے ریڈیو ٹی وی حرام تھے اب ہر ملا کے گھر میں ہیں تو دس بیس سال بعد یہ جاہل ملا مریخ پہ بھی فرقہ وارانہ فساد کرانے کے لیے فتوے دے رہے ہوں گے اور جاہل عوام ان کی پیروی میں آپس میں قتل و غارت کر رہے ہوں گے۔

انسان پیدائشی طور پر کسی سے نفرت نہیں کرتا نفرت کرنا اسے سکھایا جاتا ہے والدین سکھاتے ہیں سکول کی کتابیں سکھاتی ہیں میڈیا اور ملا سکھاتے ہیں ورنہ انسان کی فطرت میں محبت کرنا۔ ہے میرے آقا رحمۃ العالمین نے تو محبت اور پیار کا درس دیا تھا جو کافر بستر پر پیشاب کر گیا تھا۔ میرے آقا نے خود اسے دھویا تھا اور آج یہ جاہل ملا اپنے مفاد کی خاطر لوگوں کا قتل عام کرانے کے لیے میڈیا پہ تقریریں کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے: ''ہم نے یہ کتاب تمہیں کھول کر بیان کر دی ہے ہر چیز کی وضاحت کر دی ہے اور رہنمائی کر دی ہے اور رحم اور خوش خبری ہے ماننے والوں کے لیے۔'' (16:89)

اور قرآن میں ہے: ''کیا میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو اپنا حاکم مان لوں جبکہ اس نے اپنی کتاب کھول کر بیان کر دی ہے کہ صاف اور واضح سمجھ میں آئے۔'' (6:114)

قارئین! تمام عبادات خود کوئی مقصد نہیں ہیں بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں یعنی عبادات خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ مقصد انسانیت اور پیار محبت کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے لیکن فرقہ پرست ملاؤں نے عبادت کو مقصد قرار دے کر لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ عبادات انسانیت اور محبت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اب اگر ملا یہ کہے کہ تم لوگوں سے نفرت کرتے رہو انسانوں کے ساتھ ظلم اور فریب کرتے رہو اور عبادت کرتے رہو تو تمہارے سب گناہ معاف ہوں گے تو یہ ایک جہالت ہے اور فرقہ پرست ملاؤں نے لوگوں کو اسی جہالت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسلام کی جماعت کے ایک امیر نے ساری دنیا کو اپنا مکروہ چہرہ دکھا کر ایک دفعہ پھر دین اسلام کو بدنام کر دیا ہے۔ 1400 سال سے ہر سمجھدار انسان جس میں غیر مسلم بھی ہیں واقعہ کربلا کو دین بچانے کا اور ظلم و جبر کے خلاف لڑنے کا درس قرار دیتے ہیں غیر مسلم بھی امام حسینؓ کو حق بجانب قرار دیتے ہیں اور اس ملا نے کربلا کے واقعہ کو اقتدار حاصل کرنے کی جنگ قرار دیا ہے دنیا تڑپ گئی ہے اور اس ملک میں ملائیت کی جہالت اس قدر گہری ہے کہ یزیدیت کے پیروکار اس ملا کو کسی نے کچھ ناں کہا ہے۔

قارئین! ملائیت آج سے نہیں بلکہ ہزاروں سال سے ظالموں اور جابروں کے غیر انسانی کردار کی سب سے بڑی مددگار اور انسانیت کے خلاف عظیم فتنہ ہے۔ اس وقت ساری دنیا دہشت گردی کے مسئلہ سے دوچار ہے اور انتہا پسند مذہبی جنونی کسی جگہ بال ٹھاکرے کے

روپ میں اور کسی جگہ طالبان کی شکل میں انسانیت کے خلاف جنگ آزما ہیں۔ ہمارا ملک اور معاشرہ اس وقت ایک بدترین خطرے سے دوچار ہے جو کہ طالبان کی شکل میں اس معاشرے میں اپنے پنجے گاڑ رہا ہے پاکستان آرمی کے سابق چیف جنرل کیانی نے ان کو حقیقی اور اصل خطرہ قرار دیا تھا اور بات تسلیم کی کہ ان کی طرف سے غفلت کی گئی یعنی کہ دُنیا کی ساتویں بڑی فوج نے اس خطرہ کی طرف دیر سے توجہ دی اور اور آج پاکستان آرمی کو اس خطرہ کو ختم کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے فوج اس کے خلاف ہر طرف جنگ کر رہی ہے۔

قارئین! ملائیت کے پیروکار یہ مذہبی جنونی پاک فوج کے خلاف عملی طور پر نظریاتی طور پر اور فریب کے ذریعے جنگ کر رہے ہیں اور یزیدیت کے پیروکار ملا نے کہا کہ پاک فوج کے جوان اس جنگ میں شہید نہیں کہلا سکتے اور طالبان کے مرنے والے شہید ہیں اور یہ لوگ اس ملک اس معاشرہ کو جہالت کی آخری منزل تک لے جانے کے لیے یہ کہہ رہے ہیں کہ طالبان سے مذاکرات کرو۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں علیحدگی پسند وہاں کی افواج سے جنگ کر رہے ہیں سری لنکا کی فوج نے پاک فوج کے تعاون اور مشورے سے تامل باغیوں کو شکست دی وہ تامل کئی سالوں سے اس ملک اور معاشرے کے خلاف جنگ کر رہے تھے اور خودکش حملوں کے لیے مشہور تھے ان کے خودکش حملہ آور طالبان کی طرح سے چھوٹے بچے اور عورتیں ہوتی تھیں۔ بات کو پورے سمجھیں یہ تامل باغی کہتے تھے کہ ہمارے علاقے میں ہمیں حکومت دو ہم اس علاقے کو الگ کرتے ہیں باقی ملک اور معاشرے کے متعلق بات نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح سے بھارت میں آسام اور ناگالینڈ میں علیحدگی پسند بھارتی فوج سے لڑ رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے علاقے میں ہم خود حکومت کریں گے لیکن باقی ملک اور معاشرے کے متعلق بات نہیں کرتے صرف اپنے علاقے اور آبادی کی بات کرتے ہیں۔ اسی طرح سے برطانیہ میں آئرش لوگ بھی وہاں کی فوج سے لڑتے رہے اور اپنے علاقے اور آبادی کی بات کرتے تھے قارئین یہ سب علیحدگی پسند فوج سے لڑتے اور اپنی آبادی اور علاقے کی بات کرتے ہیں لیکن ساری دنیا میں صرف طالبان ہیں جو سارے ملک سارے معاشرے حتیٰ کہ ساری دنیا پر اپنے جاہلانہ عقیدے اور خیالات نافذ کرنے کے لیے جنگ کر رہے ہیں۔ اب آپ بات سمجھ گئے ہیں کہ یہ لوگ اس ملک اس معاشرے کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے خطرہ ہیں۔ ان کے خیالات سے تو ساری دُنیا آگاہ ہے لیکن ہمارے اس ملک میں سب مذہبی گروہ ایسی ہی سوچ کے حامل ہیں کہ وہ سب انسانوں پہ اپنے خیالات اور اپنا عقیدہ مسلط کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور ملائیت نے فرقہ پرستی مذہبی جنونیت اور انتہا پسندی کے جو بیج بوئے تھے آج وہ تناور درخت ہیں اور ہمارا ملک ہمارا معاشرہ ہماری فوج اس کا شکار ہو رہی ہے۔

گزشتہ دنوں چند سیاسی لیڈروں نے فوج کو نظر انداز کر کے اپنی جہالت کے تحت ان جاہلوں سے مذاکرات کا کام شروع کر دیا لیکن اپنی جہالت کا مزہ چکھا اور ساری دنیا نے دیکھا کہ ان مذاکرات کا کیا حشر ہوا اور پھر فوج کا خیال ہی ٹھیک نکلا کہ ان سے مذاکرات کی بجائے جنگ کی جائے۔

میری اس ملک کے ہر فرد سے درخواست ہے کہ ہماری پاک فوج اس وقت انسانیت کے لیے ایک بڑے خطرے سے جنگ کر رہی ہے خدارا پاک فوج کا ساتھ دیں آپ جس جگہ بھی ہیں جس طرح کے بھی ہیں آپ پاک فوج کا اپنی ہمت کے مطابق ساتھ دیں اور نظریاتی محاذ پہ خاص طور سے ان دہشت گردوں کا مقابلہ کریں۔

یہ بات تو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ اس دنیا میں مذہبی جنونیت انتہا پسندی اور مذہب کے نام پہ جہالت کس کا کام ہے یہ جس معاشرے اور جس ملک میں ہیں چاہے یہ ہندو ہیں عیسائی ہیں یا مسلمان ہیں یہ انسانیت کے دشمن ہیں اور انسانیت کے لیے حقیقی خطرہ ہیں۔

اس دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام انسانیت کا قاتل ہے اور یہ لوگ ہر دین اور ہر ملک میں اس نظام اور اس سوچ کے مددگار اور ساتھی ہیں۔ سندھی بلوچی، پٹھان، پنجابی سب پاکستان کے نام پہ متحد ہیں ایک ہیں مگر مفاد پرستوں نے ان کو فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے اور آج میرا یہ دیس میری یہ دھرتی دہشت گردی کے عذاب میں جلتا ہے۔

یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے کہ چند ہزار جاہل طالبان پورے ملک اور پوری انسانیت پہ اپنے خیالات نافذ کرنا چاہتے ہیں اور یہ ملا ان کا ساتھ دے رہے ہیں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک فوج کے شہداء کو شہید ہی نہیں مانتے اور دہشت گرد طالبان کو شہید مانتے ہیں۔ فاٹا کے لوگوں نے ان دہشت گرد طالبان کو پناہ نہیں دی ہے قبائلی علاقوں کے معصوم عوام کو ان دہشت گردوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ وہاں کے لوگ طالبان کے حامی نہیں بلکہ مجبور ہیں۔ ہم اس وقت دہشت گردی کے عظیم خطرے کا شکار ہیں پاک فوج ان دہشت گردوں سے جنگ کر رہی ہے خدارا فوج کا ساتھ دیں اور میرا یہ مطالبہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف پاک فوج کا آپریشن صرف قبائلی علاقوں میں نہیں بلکہ کراچی سمیت پورے پاکستان میں ہونا چاہیے۔

قارئین! اس وقت سارا پاکستان لال مسجد ہے اور اس ملک کے عوام دہشت گردوں کے یرغمال ہیں اس لیے پورے پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن آپریشن ہونا چاہیے۔ میری اس ملک اس معاشرے کے سمجھدار لوگوں سے اپیل ہے کہ جہالت کو پہچانیں غربت وہ نہیں جو جوتوں اور کپڑوں سے ظاہر ہوتی ہے سوچ اور فکر کی کمی اصل غربت اصل جہالت ہے۔ اور تمام دنیا کے لیے مشعل راہ قرآن مجید میں اللہ نے 400 سے زائد آیات میں انسان کو حکم دیا ہے کہ "سوچ اور فکر کرو" بات عام ہے اور متعدد دفعہ کی دہرائی ہوتی ہے مگر پھر کہنا پڑ رہا ہے کہ جو غیر مسلم اس وقت ترقی یافتہ ہیں وہ قرآن کے اصولوں پر چل کر دنیا میں سب سے آگے ہیں اور ہم جو اس قرآن کو ماننے کے دعویدار ہیں سب سے پیچھے ہیں اور اس کی وجہ صرف اور صرف ملائیت ہے۔ اس سلسلہ کے پہلے مضمون کی اشاعت کے بعد سے آج تک متعدد ملا اور ملائیت کے درجنوں پیروکار مجھے فون کر کے اور پیغام بھیج کر یہ کہہ رہے ہیں کہ تم غلط لکھ رہے ہو دین اسلام کا ٹھیکہ تو ہمارے پاس ہے ہمارے بغیر تم دین کو کس طرح سمجھ سکتے ہو اور میرا جواب ہے کہ تمہیں کس نے یہ ٹھیکہ دیا ہے جبکہ میرے آقا آخری نبی پاک اور میرے معبود حقیقی میرے خدا نے ہر انسان کو پوری انسانیت کے لیے سوچنے اور عمل کرنے کا حکم دیا ہے پھر ہم کیوں ملائیت کو تسلیم کریں۔

اسلام دین فطرت ہے امن کا دین ہے اور میرے آقا آخری نبی پاک تمام انسانیت کے لیے نبی آخر ہیں اور میرے معبود اللہ پاک کا قرآن تمام انسانیت کے لیے ہے اور اسلام نے فکر اور سوچ کی غربت کو ختم کرنے اور اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا ہے اللہ کے حکم سے نظریاتی محاذ پہ یہ جنگ جاری رہے گی۔

عقل اور فکر سے کام نہ لینے والوں کو قرآن نے حیوانی درجہ پر قرار دیا ہے۔ جو لوگ عقل و شعور سے کام نہیں لیتے قرآن کی رُو سے وہ انسانوں کے زمرے میں شامل نہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔ قرآن تو بالکل صاف اور واضح نصیحت ہے ان کے لیے جو زندہ ہو (جن

میں زندہ رہنے کی خواہش ہو)۔
ایرانی صدر نے گزشتہ دنوں اپنے بیان میں کہا ہے کہ بلوچستان میں جو علیحدگی پسند دہشت گرد لڑ رہے ہیں ایرانی فوج بین الاقوامی سرحد کو پار کر کے پاکستانی علاقہ میں آسکتی ہے تاکہ ان دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کرے۔ اس سے صورت حال کا اندازہ کریں اور غور کریں کہ دہشت گردی کتنا بڑا خطرہ ہے اور یہ کہ ہم اس خطرہ سے کس حد تک دوچار ہو چکے ہیں۔ خود کش حملوں اور بم دھماکوں کے سب سے بڑے شکار پاکستان کے اہم اور بڑے شہر ہیں اور دہشت گرد انتہا پسند جنونی ہیں اس طرح کے مضامین جو حکایت سمیت دیگر پرچوں میں شائع ہوتے ہیں کہ دہشت گردی اور مذہبی جنونیت الگ الگ ہیں دراصل دہشت گرد طالبان اور دیگر گروہوں کے لیے حمایت حاصل کرنے کا طریقہ ہیں آپ اس بات پہ پھر غور کریں کہ طالبان دہشت گرد نظریاتی محاذ پر بھی سرگرم ہو گئے ہیں اور مذہبی جنونی فرقہ پرست ذہنیت اور سوچ کے حامل صحافی ان کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کے لیے عوامی حمایت اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے گمراہ کن اعداد و شمار اور خیالات پیش کرتے ہیں۔ درجنوں نیوز چینلو پہ ہر روز سیکڑوں نقاب پوش مسلح افراد جو خود کو طالبان کہتے ہیں اور دیگر مذہبی فرقہ پرست تنظیموں کے نام سے کام کرتے اور دہشت گردی کے حملوں کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں کیا وہ کسی اور سیارے سے آئے ہیں؟ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس وقت اس ملک میں جو دہشت گردی ہو رہی ہے وہ جنونیوں اور انتہا پسندوں کا کام ہے جو کہ خود بھی اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں پھر یہ بات کسی عام عقل کے فرد کو بھی غلط نظر آتی ہے کہ دہشت گرد اور مذہبی جنونی الگ الگ ہیں یہ ایک احمقانہ بات ہے جو ایسے لوگ ہی کر سکتے ہیں جن کا تعلق ان سے ہے یا جو ان سے متاثر اور ان کے حامی ہیں۔

میری تمام قارئین سے اپیل ہے کہ دین کے نام پر دہشت گردی کرنے والوں اور جہالت کے علمبرداروں کو پہچانیں اور ان کے خلاف ہر طرح سے فوج کی مدد کریں پاک فوج اس وقت حقیقی طور پر انسانیت کے دشمنوں سے لڑ رہی ہے اور انسانیت پہ یقین رکھنے والے ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ پاک فوج کی ہر طرح سے حمایت اور مدد کرے قلم سے کی جانے والی اس جنگ میں انسانیت پہ یقین رکھنے والوں سے مدد اور حمایت کی اپیل ہے خدارا جہالت کے خلاف ہر سطح پہ لڑیں جس طرح یہ مذہبی جنونی دہشت گرد انسانیت کے خلاف عملی اور فکری طور پر لڑ رہے ہیں ان کا اسی طرح سے دونوں محاذوں پہ مقابلہ کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ شہر قائد کراچی جو پہلے لسانی گروہی فرقہ پرستوں کے پنجے میں تھا اب وہاں بھی دہشت گرد اپنا تسلط جما چکے ہیں پولیس کے ایک اہم افسر اسلم چوہدری کی شہادت کی خبر اور اس کے تبصرے عالمی میڈیا پہ کئی دن تک آتے رہے ہیں اور اسلم چوہدری شہید کو بجا طور پر دہشت گردوں کا شکاری قرار دیا گیا ہے جو خود دہشت گردی کا شکار ہو گیا لیکن ہمارے اس ملک کے میڈیا نے جو کہ خود فکری زوال سے دوچار ہے اس واقعہ بارے پلٹ کر بات نہیں کی ہے واضح رہے کہ اسلم چوہدری کی شہادت سے پہلے دہشت گرد تین دفعہ اس پر ناکام حملے کر چکے تھے۔

شہر قائد پر مذہبی جنونی فرقہ پرست دہشت گردوں نے اپنے پنجے گہرے کر لیے ہیں اس وقت کی سیاسی قیادت اپنی پست سوچ کی وجہ سے دہشت گردی کے خلاف شکست خوردہ ذہنیت کے حامل ہیں اور کوئی واضح موقف اور رویہ اپنانے سے قاصر ہیں ان کو تیسرا موقع مل چکا ہے اور عوامی فلاح کے منصوبوں میں ان کی ترجیح صرف مال بنانے کے لیے ہے۔ اس ٹولے کی

نااہلی تو نااہل ترین افراد پہ بھی واضح ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے ان غلاموں کو کوئی احساس نہیں ہے کہ یہ قوم اور معاشرہ اس وقت تاریخ کے اہم ترین دوراہے پہ کھڑا ہے ایک راستہ دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن جنگ کی طرف جا رہا ہے اور دوسرا مذہبی انتہا پسند دہشت گردوں کی حمایت کی طرف جا رہا ہے۔ بدقسمتی سے یہ دوسرے راستے سے اتفاق کرتے نظر آ رہے ہیں۔ اک فوج نے انسانیت کے دشمنوں سے فیصلہ کن جنگ کا راستہ اختیار کیا ہے لیکن اس ملک کے ملا اور اہم سیاسی رہنما فوج کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں لمحوں کی خطا صدیوں کی سزا بن جاتی ہے اور یہ ملک خطا کار حکمرانوں کی گرفت میں آ گیا ہے۔ شہر قائد کا حال یہ ہو چکا ہے۔

تمام شہر بے آسرا و سامان نظر آتا ہے
سبھی لوگوں کا یہاں نقصان نظر آتا ہے
نام تھا جس کا کبھی روشنیوں کے شہر سے منسوب
ہر اک رستہ وہاں اب ویران نظر آتا ہے
کس لمحے کہاں بجھا دے کوئی چراغ حیات
ہر اک جگہ پہ قضا کا سامان نظر آتا ہے
ہر ایک شخص اپنے غموں میں ڈوبا ہے یہاں
ہر ایک شخص ہی پریشان نظر آتا ہے
کون جانے کہاں مل جائیں درندے سفاک
ہر گلی میں امکان نظر آتا ہے
شہر وحشت سے مجھے ہو گئی ہے وحشت ذیشان
جہاں بے لوث تھے انسان وہاں حیوان نظر آتا ہے

میری قارئین سے گزارش ہے کہ فکری محاذ پہ دہشت گردوں کے خلاف ہر طرح کا تعاون پاک فوج سے کریں اور عملی محاذ پر فوج مصروف عمل ہے ان شاء اللہ فتح پاک فوج کی ہو گی۔

***

ہم کو اپنی پریشانیوں، تکلیفوں اور مسائل کو حل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا چاہیے کیونکہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔

اک سجدہ

حبیب اشرف صبوحی

ہماری زندگی میں بے شمار مسائل آتے ہیں اور بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہم بڑی جدوجہد کرتے ہیں کہیں کسی سفارش کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور کہیں کسی کے احسانات کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کا بوجھ لیے پھرتے ہیں۔ اور کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا یہ احسان اتر جائے۔ اکثر اوقات مشکلات کو حل کرنے کے لیے رشوت کا بھی سہارا لیا جاتا ہے یا کسی پیر فقیر کے آستانوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں اور اُس ہستی سے عاجزی اور انکساری سے مانگیں تو اس در سے کبھی کوئی خالی نہیں جاتا۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے:

اک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

میری زندگی میں بے شمار مشکلات اور پریشانیاں آئیں اور بظاہر اُن کے حل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن جب میں بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوا تو معجزاتی طور پر تمام مسائل حل ہو گئے کچھ واقعات تحریر کر رہا ہوں۔

میں ایک ادارے میں پرچیز/ اسٹورز آفیسر کے طور پر کام کرتا رہا ہوں اور چالیس سال خدمات سرانجام دیتا رہا۔ اس دوران بے شمار نشیب و فراز آئے اور صرف اللہ کو یاد کرنے سے تمام مسائل اور مشکلات آسان ہو گئیں۔

ایک دفعہ ایک بھاری مالیت ٹینڈر اخبار میں دینا تھا اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے تین ممبر تھے۔ ان تین ممبر میں میرا نام بھی شامل تھا۔ چھتیس کمپنیوں نے اس ٹینڈر میں شرکت کی اس ٹینڈر کو فائنل کرتے ہوئے تقریباً 4 ماہ لگ گئے اور قواعد و ضوابط کے مطابق ایک کمپنی کو لاکھوں روپے کا آرڈر دے دیا گیا۔ اس کمپنی نے مال بھی سپلائی کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد پتہ چلا کہ جس

پارٹی کو ٹینڈر ملا ہے وہ درست نہیں ملا۔ چونکہ اس ٹینڈر میں باقی دوسری کمپنیاں بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اس کمپنی کو آرڈر مل گیا ہے جو اس کی اہلیت نہیں رکھتی تھی تو وہ ہمارے ادارے کے چیئرمین سے جا کر ملے اور ساری صورت حال بتائی۔ چیئرمین نے ہمارے منیجنگ ڈائریکٹر سے کہا کہ جن لوگوں نے اس کام میں نااہلی کا ثبوت دیا ہے ان سب کو کمپنی سے فارغ کرو اور جتنا نقصان ہوا ہے وہ ان کی تنخواہوں اور ان کے واجبات میں سے پورا کیا جائے۔ اتفاق سے جن تین افسروں نے اس ساری کارروائی میں حصہ لیا تھا اس میں سے ایک انتقال کر گئے تھے دوسرے آفیسر دو سال کی چھٹی لے کر امریکہ چلے گئے تھے اور پھندا میری گردن میں آ گیا تھا۔ چنانچہ مجھے چارج شیٹ مل گئی اور کہا گیا کہ کیوں نہ آپ کو کمپنی سے نکال دیا جائے اور تمام نقصان آپ کے واجبات میں سے کاٹا جائے۔ میں وقتی طور پر بہت پریشان ہوا اور جواب یہ دیا کہ یہ غلطی نادانستہ طور پر ہوئی ہے اور ارادتاً نہیں کی۔

اسی دوران میرے ایک بزرگ نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ اللہ کے کلام میں بڑی برکت ہے اگر میں سورۃ یٰسین 72 دفعہ پڑھواؤں اور اس کے بعد دعا کروں تو ان شاء اللہ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

ایک روز صبح فجر کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد میں نے خود سورۃ یٰسین پڑھنی شروع کر دی جو تقریباً اڑھائی گھنٹے میں ختم ہوئی اس کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگی اور اپنے مسئلہ کے باعزت طور پر حل ہونے کی دعا کی۔ دوسرے روز اتفاق سے جنرل منیجر کے سیکرٹری کا فون آ گیا۔ اس کا کوئی ذاتی کام مجھ سے تھا۔ میں نے اس سے اپنے مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ آپ نے جو جواب دیا تھا اس پر ایک کمیٹی بنا دی گئی تھی جو فیصلہ اس کمیٹی نے کرنا تھا اس کے مطابق عمل ہونا تھا۔ اس کمیٹی کے چیئرمین نے یہ جواب لکھا کہ یہ غلطی غیر دانستہ طور پر ہوئی تھی اور یہ ٹائپنگ کی غلطی تھی جس کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اس میں کسی کا قصور نہیں ہے۔ اس لیے تمام ممبران کو باعزت طور پر اس مقدمہ سے بری کیا جائے۔

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی وجہ سے ہوا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میری زندگی میں وقوع پذیر ہوا۔ پرچیز آفیسر کی حیثیت سے ایک دکاندار سے کافی رقم کا مال خرید لیا مال خریدنے کے بعد آڈٹ والوں نے اس خریداری پر اعتراض لگا دیا کہ یہ خریداری اُصول وضوابط کے مطابق نہیں ہوئی اور مہنگے داموں سامان خریدا گیا ہے۔ اس پر ایک انکوائری کمیٹی قائم ہو گئی۔ انکوائری کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی اس کی روشنی میں اعلیٰ آفیسر نے میری تنزلی کر دی اور گریڈ 17 سے گریڈ 16 میں میری تنزلی ہو گئی اور پرچیز ڈیپارٹمنٹ سے دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں میرا تبادلہ ہو گیا۔ یہ ایک بڑا تکلیف دہ عمل تھا۔ تمام محکمے میں یہ بات پھیل گئی کہ میں نے لاکھوں روپوں کا کرپشن کیا ہے اور اسی جرم میں میرا تبادلہ بھی ہو گیا ہے۔ نئے محکمے میں آئے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے اور میں ایک تکلیف دہ ماحول میں کام کر رہا تھا۔ کام میں بالکل دل نہیں لگتا تھا۔ طبیعت میں بے چینی تھی۔ ایک روز دفتر میں چند لوگ میرے پاس بیٹھے تھے اور وہ ایک دفتری کام کے سلسلے میں آئے تھے انہوں نے پانی مانگا۔ میں نے چپڑاسی سے کہا کہ ان لوگوں کو پانی پلاؤ وہ سنی ان سنی کر کے غائب ہو گیا۔ دوبارہ پھر اُس سے کہا۔ اس نے کہا کہ میں مصروف ہوں میں پانی نہیں پلا سکتا۔ کسی اور کو کہہ دو۔ میں نے جب اس سے سختی سے کہا تو اس نے کہا کہ آپ لوگ لاکھوں روپوں کی کرپشن کر کے دوسرے محکموں سے آ جاتے ہیں اور ہم پر حکم چلاتے ہیں۔ اس کے یہ الفاظ میرے اوپر تازیانہ ثابت ہوئے۔ کچھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں۔ بہر حال دوسرے چپڑاسی سے

کہا اس نے پانی پلا دیا لیکن دل کی عجیب کیفیت تھی۔ بلڈ پریشر بہت زیادہ ہو گیا۔ میں چھٹی لے کر گھر آ گیا۔

رات کو بستر پر لیٹا تو نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے نیند کی گولی کھائی اس سے نیند تو آ گئی لیکن رات کے پچھلے پہر آنکھ کھل گئی۔ سخت بے چینی اور طبیعت میں عجیب قسم کا اضطراب۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا وضو کیا اور تہجد کی نماز ادا کرنی شروع کر دی۔ میں سجدہ میں جا کر اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے لگا۔ میں روتا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر میں نے کرپشن اور بے ایمانی کی ہے تو اے اللہ "میرے ساتھ وہ سلوک کر جو میں زمانے کے لیے عبرت ہوں اور اگر میں سچا ہوں تو میرے ساتھ انصاف کر۔" انہی الفاظ کی تکرار کے ساتھ میں آہ و بکا کرتا رہا اور نفل پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح فجر کی آذان ہو گئی۔ میں نے فجر کی نماز با جماعت ادا کی اور دفتر پہنچ گیا۔

میرا قاعدہ تھا کہ میں دفتر جا کر تلاوت کرتا تھا۔ ابھی میں نے تلاوت کے لیے قرآن شریف کو سنبھالا ہی تھا کہ سینئر جنرل منیجر کا چپڑاسی آ گیا اور کہنے لگا کہ آپ کو بڑے صاحب فوراً بلا رہے ہیں۔ میرے قدم کانپنے لگے اور مجھے یقین ہو گیا کہ شاید اب مجھے کمپنی سے نکالنے کے احکامات ملنے والے ہیں۔ میں چپڑاسی کے ساتھ جب ان کے کمرے میں جا کر کھڑا ہوا تو وہ اس جنرل منیجر سے بات کر رہے تھے جس نے میری تنزلی (Down Grading) منظور کی تھی اس سے سینئر جنرل منیجر کہہ رہے تھے کہ آج صبح آتے ہی میں نے حبیب صاحب کا کیس پڑھا ہے۔ انکوائری کمیٹی نے یہ لکھا ہے کہ سامان خریدتے ہوئے انہوں نے کمپنی کا مالی نقصان نہیں کیا ہے البتہ معمولی سی ضابطہ کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور اس کی آپ نے اتنی بڑی سزا تجویز کی ہے۔ یہ سزا واپس لیں۔ جنرل منیجر اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ میں اصول کا آدمی ہوں جو لکھ دیا اس کو واپس نہیں لے سکتا۔ اس پر سینئر جنرل منیجر نے کہا کہ میں اختیارات میں آپ سے زیادہ ہوں۔ اگر آپ نے یہ سزا واپس نہ لی تو پھر میں اپنے اختیارات استعمال کروں گا۔ میں حیران اور پریشان ان دونوں اعلیٰ افسران کی باتیں سن رہا تھا جو میرے لیے لڑ رہے تھے جب سینئر جنرل منیجر نے جنرل منیجر کو قائل کر لیا کہ وہ میری سزا واپس لے لے گا تو فون بند کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ آپ کھڑے کیوں ہیں؟ تشریف رکھیں آپ بہت شریف آدمی ہیں اور رات آپ کس پیر کے پاس گئے تھے کہ اس نے مجھے ساری رات سونے نہیں دیا۔

میں نے کہا جناب آپ نے مجھے بستہ "ب" کا بدمعاش بنا دیا۔ میں پورے ادارے میں بدنام ہو گیا اور کل ایک چپڑاسی نے اٹھ کر یہ کہہ دیا کہ آپ لاکھوں روپوں کی کرپشن کر کے ہمارے محکمے میں آ گئے ہیں اور جہاں تک کسی پیر کے پاس جانے کا تعلق ہے تو میں نے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا تھا اور اپنا مقدمہ اُس کے دربار میں پیش کیا تھا اور اس نے آپ کو میرے بارے میں یاد دہانی کروائی۔ سینئر جنرل منیجر نے کہا کہ رات کے پچھلے پہر مجھے کسی غیبی طاقت نے میرا پائنچہ پکڑ کر ہلایا کہ "حبیب اشرف کا کیس پڑھو اور اس کے ساتھ انصاف کرو"۔ میں آرام سے سو گیا۔ دوبارہ پھر کسی نے میرا پائنچہ پکڑ کر ہلایا اور تاکید کی لیکن میں سوتا رہا۔ تیسری دفعہ کسی نے مجھے پکڑ کر پلنگ سے نیچے پھینک دیا۔ میں گھبرا کر اٹھ گیا صبح نماز پڑھی اور سیدھا دفتر آ کر تمہارا کیس پڑھا اور تم نے میری ساری باتیں سن لیں۔ اب تم فوری طور پر اس سزا کے خلاف اپیل کر دو۔ جنرل منیجر تمہاری پہلی پوزیشن کو بحال کر دے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ کس چپڑاسی نے تمہارے ساتھ بدتمیزی کی تھی؟ جب میں نے اس چپڑاسی کا نام لیا۔ اُس چپڑاسی کو بلوایا گیا۔ جب اس نے مجھے سینئر جنرل منیجر کے پاس بیٹھے ہوا دیکھا تو وہ خوف سے کانپنے لگا۔ انہوں نے چپڑاسی سے پوچھا کہ جو الفاظ تم نے ان آفیسر کے سامنے

کہے تھے وہ تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں دوسرے اس سوال کا جواب دو کہ تم چپڑاسی ہو تمہاری یونیفارم کہاں ہے؟ ان دونوں سوالات کے جوابات نہیں دیئے تو میں تمہیں ابھی کمپنی سے نکال رہا ہوں۔ انہوں نے متعلقہ جنرل منیجر سے کہا کہ اس چپڑاسی کو فوری طور پر میرے احکامات کے ساتھ نوکری سے نکال دو اور مجھے اطلاع کرو کیونکہ اس نے ایک آفیسر پر ایک ناجائز تہمت لگائی ہے اور دوسرے اس نے دفتری اوقات میں یونیفارم نہیں پہنی ہوئی ہے۔ جو الزامات اس پر لگے ہیں اس کا یہ جواب بھی نہیں دے سکا ہے۔

اُس کے بعد انہوں نے مجھے چائے پلائی اور کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔

جب میں اعلیٰ آفیسر کے کمرے سے نکل کر اپنی سیٹ پر پہنچا تو اُس دوران اس چپڑاسی کے نوکری سے برخاست کرنے کے آرڈر ہو چکے تھے۔ اس چپڑاسی کی ساری اکڑ ختم ہو گئی تھی۔ وہ زار و قطار روتا ہوا میرے پاس آیا اس کے ساتھ دوسرا اسٹاف بھی تھا۔ وہ سب کہہ رہے تھے کہ اس کو معاف کر دیں اس کو اپنی غلطی کی بہت بڑی سزا مل گئی ہے۔ آئندہ اس کی کئی نسلیں کسی سے بدتمیزی نہیں کریں گی۔ سب لوگوں کے اصرار پر میں نے متعلقہ چپڑاسی کو معاف کر دیا اور اس کی سزا کو معطل کروا دیا۔ وہ میرا بہت شکر گزار ہوا۔ اور جب تک میں ملازم رہا وہ میرے قدم دھو دھو کر پیتا رہا۔

میں نے بھی فوری طور پر اپنی سزا کے خلاف اپیل کی اور اللہ کے حکم سے میری سزا بھی ختم ہو گئی اور میں بحال ہو گیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا نتیجہ تھا۔ ہم کو اپنی پریشانیوں، تکلیفوں اور مسائل کو حل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا چاہیے کیونکہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔ وما علینا الا البلاغ

***

اندر کا چور

احمد عدنان طارق
پولیس انسپکٹر

میرے دوست اور گروپ والے بعد میں ہمیشہ مجھے بزدلی کا طعنہ دے کر میرا مذاق اڑاتے رہے لیکن مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ میں اپنی راہیں تبدیل کر چکا تھا۔

گاؤں میں پیدا ہوئے گاؤں میں ہی پلے بڑھے۔ اب میری عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے۔ یہ اُس عمر کا قصہ ہے جب ابھی میرے منہ پر داڑھی مونچھ نہیں آئی تھی جو آج کل مکمل سفید ہو چکی ہیں۔ اُس دور کے گاؤں بھی شہروں سے اتنے دور تھے کہ دو دن پہلے بیٹھ کر فیصلہ کیا جاتا تھا کہ شہر جانا ہے تو جو جائے گا وہ سارے گاؤں کے کام نپٹا کر ہی آئے گا اور میرا گاؤں تو اُتھاڑ میں تھا یعنی دریا کے بالکل کنارے۔ سڑکوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ گاؤں سے شہر جانے کے لیے واحد سواری گھوڑے کی پشت تھی سفر بے شک میلوں میں ہوتا یا کوسوں میں سواری کا بہترین ذریعہ یہی سمجھا جاتا تھا۔

بچپن میں لُکن چھپی کھیلنے کے بعد لڑکپن میں قدم رکھا تو ہم سب کے ساتھ یہ کھیل ابھی جڑا ہوا تھا لیکن اب یہ کھیل ذرا تبدیل ہو گیا تھا۔ یعنی اب رات کے اندھیرے میں ہم نے ایک دوسرے کو نہیں ڈھونڈنا تھا بلکہ صبح علاقے میں گھوم پھر کر جس ڈنگر کی ریکی کی ہوتی اُس کو باڑے سے نکال کر ایسی جگہ پہنچانا تھا جہاں آرام سے اس کے دام کھرے کیے جا سکیں۔ میرا گروپ الیاس اور ثناء اللہ کے ساتھ تھا۔ الیاس میرا سگا چھوٹا بھائی اور ثناء اللہ میرا چچا کا بیٹا تھا۔ یہ رشتے ایسے تھے جو قابل اعتبار تھے اور ان پر ناقابل اعتباری کی گنجائش نہیں تھی ہمارے پہلے ایک دو ایڈونچر کامیاب ہو چکے تھے۔ جس سے ہماری خود اعتمادی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بلکہ ایک چوری کے دوران تو مالک بھی جاگ اٹھے مگر ہمارے جسم میں جان بھی تھی اور دماغ میں فتور بھی اس کے علاوہ گناہ ثواب کی بھی تمیز نہیں تھی۔ لہذا ایک دو چوٹیں مار کر ہی ڈنگروں کے رکھے زخمی کر دیے اور ان کو بوبو کرنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔

سارا دن اپنے مال مویشیوں کو چرانا اُن کو ادھر اُدھر لے کر گھومتے رہنا۔ سارے علاقے کے ایک ایک

وٹ بنے سے ہماری واقفیت تھی۔ ایک شادی کی کا نیوتا آئی اور میں اور ثناء اللہ اپنے گاؤں سے دس بارہ میل دور اپنی گھوڑی پر شادی میں شامل ہونے کے لیے گئے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک بھینسوں کے باڑے پر ہماری نظر پڑی۔ بیوپاریوں نے مال مویشی کو خریدنے کی نظر سے دیکھنا ہوتا ہے کہ کتنا نفع ہو سکتا ہے چوروں نے محل وقوع کو۔ مالک کتنے تگڑے ہیں حویلی پکی ہے کتنی مضبوط ہے اور چوری کیسے کرنی ہے۔ کہاں سے مویشی نکالنا ہے۔ کہاں باندھنا ہے اور پھر کہاں بیچنا ہے؟ مال مویشیوں کی صحت اور خوبصورتی دیکھ کر ہم دونوں کی رال ٹپک پڑی۔

ایک دوسرے سے بات کیے بغیر ہی ہم دونوں جوان اس بات پر قائل تھے کہ ان میں سے ہمارا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ شادی کے دوران بھی ہم مضطرب اور پریشان ہی رہے کہ کب واپس جا کر پروگرام بنائیں اور کسی اندھیری رات یہاں سے مویشی چوری کریں۔ شادی کے دوران البتہ ہمارے پاس ضروری معلومات اکٹھی ہو گئیں۔

معلوم ہوا کہ کوئی کرنی والے سید ہیں۔ اچھے خاصے رقبے کے مالک ہیں بہت سادہ طبیعت کے ہیں۔ امارت کی کوئی بو اُن میں نہیں ہے۔ مال کی حفاظت بھی اتنی نہیں ہے مال مویشی کو اللہ کی دین سمجھتے ہیں۔ جانوروں کو کھلاتے پلاتے اس لیے ہیں کیونکہ وہ بے جان ہوتے ہیں۔ ایک دو دفعہ چوری ہوئی ہے مگر ہر دفعہ چوروں کو معاف کر دیا گیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہمارے پیشے میں اتنی چھوٹ، کہیں اور کہاں ملتی تھی۔ گھر پہنچے تو طبیعت ایسی مکدر تھی جیسے شادی والے گاؤں میں دل دے آئے ہیں۔ شام کو صلاح میں الیاس بھی شامل ہو گیا ابھی چاندنی راتیں تھیں انتظار کرنا تھا۔ ہمارے پیشہ میں راتیں اندھیری ہونی چاہئیں۔ پھر وقت آ گیا ہم سر شام ہی گھر سے نکل پڑے تا کہ بروقت منزل پر پہنچیں اور پھر ہمارے پاس اتنا وقت ہو کہ مال کو کسی مناسب مقام پر پہنچا سکیں۔

گاؤں پہنچے تو رات ہو چکی تھی لوگوں کے سونے کا انتظار کیا گاؤں کے باہر کی طرف باڑہ تھا۔ اپنے آپ کو چھپا کے ہم باڑے کے قریب پہنچے۔ ہم نے چادروں کی بکل اوڑھی ہوئی تھی تا کہ باڑے میں ہماری شناخت نہ ہو۔ مگر باڑے میں پہنچ کر جیسے ہم شرمندہ ہو گئے۔ وہاں مویشیوں کی حفاظت کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ اچھی طرح کھا پی کر مویشی بھی جگالی کر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر بڑا دیکھا مگر یقین ہو گیا کہ چادروں کی بکل کی کوئی ضرورت نہیں اور ہمیں دیکھنے اور روکنے والا کوئی نہیں تو ہم نے باڑے سے بہترین ڈنگر ایک گائے اور ایک بھینس جس کے ساتھ ایک کٹی بھی تھی کھولے اور لے کر روانہ منزل ہوئے۔ بظاہر اندھیری رات میں سفر کرنا بھی ہمارے لیے کوئی مشکل نہ تھا کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ سارا علاقہ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ البتہ یہ تھا کہ اُن دنوں زیادہ علاقے پر کھلی فصلیں تھیں اور تقریباً منظر ایک سا ہی نظر آتا تھا۔ خصوصی طور پر اندھیری رات میں ہم کوشش کر رہے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے چوری والی جگہ سے ڈنگر جتنی دور لے جا سکیں لے جائیں۔ ساری رات ہم تاروں بھرے آسمان کے نیچے سفر کرتے رہے۔ میرے خیال سے قریب میں کلو میٹر سفر ہم نے طے کیا ہو گا تھکاوٹ وغیرہ کا تو اُن دنوں سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔

صبح ہونے کو تھی اور ہم سب اپنے رات کے کام پر مطمئن تھے اور اگلے تانے بانے بن رہے تھے کہ ان ڈنگروں سے آمدن کتنی ہوتی ہے اور کون سا میلہ کتنے دنوں بعد کہاں لگ رہا ہے۔ وہاں کون سا سوٹ سلوا کر جانا ہے کون سی کبڑی کا اکھاڑہ لگنا ہے اور ہمارے پاس اس اکھاڑے میں اتنی رقم ہونی چاہیے کہ کسی اور چوہدری کو اکھاڑے میں سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ لیکن

پچھلے دس پندرہ منٹ میں ہمارے چہروں پر اضطراب جھلک رہا تھا اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ سوال جو ہم ایک دوسرے سے پوچھنا چاہ رہے تھے اس میں پہل کرنے میں سب ہی ہچکچا رہے تھے لیکن وہ سوال آخر ہمارے لبوں پر آ ہی گیا میں نے چپ کا روزہ توڑا اور الیاس سے پوچھا کہ مجھے اب سمجھ نہیں آ رہی کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔ اگرچہ علاقہ دیکھا بھالا ہے مگر پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہم بھٹک گئے ہیں۔ الیاس اور شاہ اللہ کا بھی یہی حال تھا۔ ایک ڈھاری پر ایک شخص جاگا ہوا تھا ہم نے راستے میں رک کر اُس سے پوچھا کہ قریبی کون سا گاؤں ہے وہ گاؤں کے بالکل نزدیک ڈھاری پر اپنے مال کی حفاظت کے لیے سویا ہوا تھا۔ مگر جب اُس نے ہمیں گاؤں کا نام بتایا تو ہم بے اختیار ہنس پڑے۔

ہم نے سمجھا کہ شاید وہ ہم سے مذاق کے موڈ میں ہے یا پھر وہ ہمیں صحیح راستہ بتانا نہیں چاہتا کیونکہ ہو سکتا ہے وہ ہم پر شک کر رہا ہے۔ میں نے اسے سنجیدگی سے دوبارہ پوچھا کہ بھائی ہمارا تمہارا کوئی مذاق تو ہے نہیں مہربانی فرما کر ہم مسافروں کو صحیح بتاؤ کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔ تو اس نے بھی اسی سنجیدگی سے ہمیں جواب دیا کہ اسے کون سی ضرورت ہے راہیوں کو غلط راہ لگانے کی۔ یہ واقعی وہی گاؤں ہے جو اُس نے پہلے بتایا ہے۔ اب اسے ہماری بدقسمتی سمجھئے یا جو بھی۔ بہرکیف ساری رات ہم سفر میں ضرور رہے تھے مگر ساری رات ہم راستہ بھولے رہے تھے اور گھوم پھر کر تقدیر ہمیں وہیں لے آئی تھی اسی گاؤں میں جہاں سے ہم نے ڈنگر چوری کیے تھے اس بات کا یقین کرتے ہمارے ذہنوں نے اچھا بھلا وقت لے لیا۔ شاہ اللہ اکیلا آگے گیا اور اُس نے واپس آ کر ہمیں بتایا کہ ہم بالکل اسی باڑے کے نزدیک ہیں جہاں سے ہم نے ڈنگر چرائے تھے رات کی ظلمت کو صبح کی روشنی آہستہ آہستہ ختم کرنے لگی اور اندھیرے میں نظر آنے لگا۔ نمازی نماز کے لیے اٹھنے لگے ہم الٹے پاؤں واپس مڑے اس سے پہلے کہ گاؤں کا کوئی نمازی دیکھے بھالے ڈنگروں کے ساتھ ہمیں دیکھ لیتا ہم گاؤں سے باہر نکلے اب ہمارے حوصلے جواب دے گئے تھے۔

ہم تو جتنا تھکے تھے ہم سے زیادہ برا حال مویشیوں کا تھا وہ بھی ساری رات چل چل کر تھک چکے تھے۔ میرے بزرگوں کے تعلق والا ایک شریف آدمی شہر جانے والی سڑک کے قریب ڈھاری بنا کر رہتا تھا۔ ہم جلدی سے اس کے پاس پہنچے اور اسے اپنی بپتا سنائی۔ لیکن اُسے یہ بتایا کہ مال تو چوری کا ہے مگر ہم اسے کوئی بیس میل دور سے لے کر آئے ہیں۔ ورنہ ہم اگر یہ بتا دیتے کہ یہ مویشی اُس کے گاؤں کے چوروں کے ہیں تو کوئی پاگل ہی ہوتا جو یہ مویشی اپنی ڈھاری پر باندھتا۔ اُس نے مہربانی کی اور مویشی ایک دن کے لیے اپنی ڈھاری پر باندھ لیے۔ ہم بھی آرام کرنے کے لیے ساتھ والے گاؤں چلے گئے وہاں بھی ہمارا ایک جاننے والا چوہدری رہتا تھا۔ جو خود چوری نہیں کرتا تھا لیکن چوری کا مال باندھ لیتا تھا۔ ہم اُس کے پاس گئے تو اُس کے گھر بھی شادی کا فنکشن چل رہا تھا۔ اس سے بات کی تو مال باندھنے کے لیے فوراً راضی ہو گیا ہم نے عافیت بھی اور مطمئن ہو کر لمبی تان کر سو گئے۔ شام کو ہماری نیند پوری ہوئی اور ہمیں ہوش آیا ہم چوہدری سے اجازت لے کر اپنے اُس عزیز کے پاس پہنچے جہاں ہم نے مویشی چھوڑے تھے وہ ہمارے علی الصبح مویشیوں سمیت اُسے ملنے پر پریشان تھا کہ راستہ میں لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا ہوگا اور وہ مویشیوں کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔

اگر ان مویشیوں کو ڈھونڈنے پیچھے کوئی وار آ جاتی۔ اس لیے ہمارے جاتے ہی اُس نے سب سے پہلا کام ہی یہی کیا کہ مویشی وہاں سے نکالے اور انہیں

نزدیک فصلوں میں باندھ آیا۔ ہمیں اُس نے جب مویشیوں کے بارے میں بتایا تو ہمیں سمجھ آنی شروع ہو گئی کہ معاملہ کچھ خراب ہے اور ہمارے ہر کام میں مشکلیں آرہی ہیں کیوں؟ اس سوال کا جواب ہمارے پاس ابھی نہیں تھا۔ ہم اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تو بے چارے مویشی گرمی میں بھوکے پیاسے کھڑے تھے ہمیں اُن کی شکلوں سے بھی ہول آیا۔ کہ شاید ان بے زبانوں کی آہ ہمیں لگی ہے بہرکیف ہم نے اُنہیں کھولا تو گائے خاصی غضب ناک ہوچکی تھی اُس نے ہمیں بڑی مشکل سے اپنی کمر پر ہاتھ رکھنے دیا اور بڑے جتن سے ہم ان مویشیوں کو لے کر چوہدری کے پاس پہنچے۔

چوہدری کے بیٹے کی شادی تھی مویشیوں کو باندھ کر ہم بھی شادی میں آئے مہمانوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہوگئے شام کو چوہدری صاحب جو صبح ہی مضطرب دکھائی دے رہے تھے نے دل کی بات زبان پر رکھ دی انہوں نے ہمیں شادی میں آئے مہمانوں کی تعداد گنوائی اور پھر ڈنگروں میں سے ایک ڈنگر مانگ لیا تا کہ اُسے ذبح کر کے ایک ڈنگ بنایا جا سکے۔ ان دنوں گاؤں کی شادیاں کئی کئی دن چلتی تھیں۔ مہمان دور سے آئے تھے۔ ایک دوسرے سے بڑی مشکل سے ملاقات ہوتی تھی۔

لہٰذا کئی کئی دن عورتیں زنان خانوں میں گپیں ہانکتی اور مرد حضرات باہر چارپائیوں پر حقے کے ارد گرد بھی گپیں ہانکنے والا کام کرتے۔ یہی وقت اُن کا آپس کے مسائل حل کرنا کا ہوتا اور دین دنیا کے باقی مسائل بھی تبھی زیرِ غور آتے۔ ظاہر ہے کہ ہم چوہدری کو انکار نہیں کر سکتے تھے فوراً ہاں کردی اور رات کا کھانا ہم نے خود اپنے لائے ہوئے ڈنگر کے سالن کا کھایا۔ ہاں چوہدری صاحب نے سالن میں آلو اپنی طرف سے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ تو خیر کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا۔ جتنا بڑا مسئلہ ہمارے لیے چوری کی گائے نے پیدا کیا ہوا تھا۔ وہ اتنی غضب ناک ہوچکی تھی کہ ہماری شکلیں دیکھتے ہی اتنی شوکر سے ہماری طرف لپکتی جیسے کوئی کالا ناگ اپنے شکار کو ڈسنے کے لیے لپکتا ہے کھانا اُس نے چھوڑ دیا تھا۔ ہم اسے چارہ بھی دیوار کے اوپر سے پھینک رہے تھے۔ جو ویسے ہی پڑا رہتا۔

اب ہم نے مجبوراً سوچنا شروع کر دیا کہ دوسرے بھی چوری کرتے ہیں ہم نے ایسا کیا کیا ہے کہ جب سے مویشی ہمارے قبضے میں آئے ہیں ہر بات انہونی ہو رہی ہے ہم تو ویسے ہی چور تھے لیکن ہمارے اندر کا چور ہمیں مجبور کر رہا تھا کہ اب اس انہونی کا بھی کھوج لگائیں۔ میں اگلے دن اپنے اُسی مہربان کے پاس چلا گیا جس نے ہمارے مویشی پہلے دن اپنے پاس باندھے تھے۔ اس کا نام نذیر تھا اور وہ جٹ تھا میں نے باتوں باتوں میں موضوع چوری کی طرف موڑا تو نذیر نے پیروں کی چوری کی بات شروع کر دی۔ میرا مقصد بھی یہی تھا اور نذیر کا بھی گلہ کرنا چاہتا تھا۔ کہ ہم نے اسے پھنسانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ابھی اسے یہ علم نہ تھا کہ وہ مویشی اسی کے گاؤں کے پیروں کے تھے ورنہ وہ تو مجھے سے اکھڑ جاتا۔ اس نے بتایا کہ وہ پیر صاحبان کی چوری کے بعد افسوس کرنے اُن کے ڈیرے پر گیا تو سبھی لوگ بہت رنجیدہ تھے۔ کہ پیر صاحب جیسے اللہ لوک بندے کو بھی ظالموں نے نہیں بخشا حالانکہ ایک گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔

نذیر نے بتایا کہ پیر صاحب کی ایک دفعہ پہلے بھی چوری ہوئی تھی تو پیر صاحب (جو شاہ صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے) نے اپنی چوری کی کوئی پیروی نہیں کی تھی تب بھی سبھی لوگوں نے شاہ صاحب کو مشورہ دیا کہ شاہ صاحب کھوجیوں کو بلوا کر کھرا نکلوائیں مگر شاہ صاحب نے منع فرمایا اور کہا کہ وہ خدا پر چھوڑتے ہیں۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو میرے مویشی واپس آجائیں گے پتا

نہیں چوروں کو کتنی ضرورت ہوگی۔ میں نے نذیر سے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ تو نذیر نے مجھے بتایا کہ جو چور شاہ صاحب کی بھینس چوری کر کے لے گئے تھے وہ دو تھے گاؤں سے کوئی دس کوس دور ایک چور کو راستے میں سانپ نے کاٹ لیا۔ دوسرا چور اتنا دہشت زدہ ہوا کہ خود بھینس واپس چھوڑ گیا شاہ صاحب نے نہ صرف اُس کو معافی دے دی بلکہ جو چور سانپ کے کاٹنے سے قریب المرگ تھا اُس کا علاج بھی کروایا۔

نذیر بات کر رہا تھا اور میرے اندر کا چور بے چینی سے کلبلا رہا تھا اور باتیں سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ نذیر نے مجھے بتایا کہ اب بھی شاہ صاحب نے کوئی کھرا رواں نہیں کیا نہ کسی کھوجی کو بلوایا ہے بلکہ یہی کہتے رہے کہ پتا نہیں چور کتنا ضرورت مند تھا جسے چوری کی ضرورت ہوئی۔ بہرکیف جو خدا کو منظور تھا وہی ہو گیا اگر مجھے مال واپس ملنا ہوا تو ضرور مل جائے گا۔

پریشانی تو مجھے پہلے دن سے لاحق تھی اب اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی میں نے ذہن میں فوراً ایک فیصلہ لیا میں نے نذیر سے بات چلائی کہ مجھے کہیں سے کوئی مخبری ہوئی ہے کہ پیر صاحب کے چوروں کا معلوم ہو سکتا ہے نذیر نے کہا کہ شاہ صاحب کے ڈنگر ضرور تلاش کرو۔ اللہ ثواب دے گا میں نے نذیر کو دوبارہ کہا کہ چوروں کی معافی کی درخواست بھی کرنی ہے تو نذیر نے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ شاہ صاحب کسی کو سزا نہیں دلواتے۔ میں نے دوبارہ نذیر کو کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شاید اُن کے ڈنگروں میں سے ایک کٹی ذبح کر لی گئی ہے تو نذیر نے کہا کہ اگر بات پکی ہو تو میں شاہ صاحب سے بات کروں میں نے کہا اگر تم مناسب سمجھو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ تو وہ مجھے ساتھ لے جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ مویشیوں کو چارہ ڈال کر نذیر فارغ ہوا تو ہم دونوں شاہ صاحب کے ڈیرے پر پہنچے نماز کا وقت تھا اور وہ خدا کے حضور سجدہ ریز تھے میں نے ہمیشہ رعب داب والے پیر صاحبان دیکھے تھے جن کا لوٹا اٹھانے والا ایک علیحدہ ملازم ہوتا تھا تو پاؤں دبانے والا دوسرا۔ مگر یہ شاہ صاحب تو کوئی اور ہی چیز تھے انتہائی سادہ مزاج دبلے پتلے چہرے پر نور۔ باریش چہرہ۔ سادہ لباس۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے انہیں سلام کیا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے ہم نے مدعا بیان کیا تو کہنے لگے کہ میں نے تو چور کو پہلے ہی معاف کر دیا ہے اور سزا سوچنے والا میں کون ہوتا ہوں اور ایک آدھ ڈنگر اگر ذبح ہو گیا ہے تو پتا نہیں وہ شخص کتنا ضرورت مند ہوگا جس نے اپنی ضرورت کے مطابق اسے ذبح کیا ہے۔ اس سے آگے شاہ صاحب سے چھپانے والی کوئی بات نہیں تھی۔

شاہ صاحب کے مویشیوں کو چارہ ڈالنے والا میں نے ساتھ لیا اور چوہدری کی ڈھاری پر پہنچا۔ الیاس اور شاہ اللہ کو ساری بات بتائی تو انہوں نے بھی مجھے کہا کہ میں نے اچھا کیا ہے شاہ صاحب کے پاس سے ہمارے ساتھ آنے والے بندے نے ڈھاری کا دروازہ کھولا تو ہم نے اسے گائے کی غضب ناکی کے بارے میں بتایا تو وہ ہنسنے لگا۔ ہمیں سمجھ نہ آئی کہ وہ کیوں ہنس رہا ہے لیکن جب وہ اکیلا ڈھاری میں گیا اور گائے نے کوئی اڑی نہیں کی بلکہ اس کے ہاتھ سے چارہ بھی کھایا اور پھر آرام سے اُس کے آگے آگے چلنے لگی اُسے اب معلوم تھا کہ وہ شاہ صاحب کے پاس جا رہی ہے اور میں جانتا تھا کہ شاہ صاحب کا ساتھی ہم پر کیوں ہنس رہا تھا اور میں جان گیا تھا کہ چوری اگر ایسی ہی ہوتی ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میرے دوست اور گروپ والے بعد میں ہمیشہ مجھے بزدلی کا طعنہ دے کر میرا مذاق اڑاتے رہے لیکن مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ میں اپنی راہیں تبدیل کر چکا تھا۔

٭٭٭

غزل

ریاض عاقب کوہلر

سچائی چھپ ہی جاتی ہے دلیلوں سے وکیلوں کی
کہ خوشبو کم نہیں ہوتی کبھی چوری کے پھولوں کی

وکیل اپنا بھی تگڑا تھا مگر کچھ غیر سے کم تھا
کہ رکھی لاج نہ منصف نے کچھ اس کی دلیلوں کی

کہا منشی کو افسر نے لکھی جب رپٹ غربأ کی
بڑے گدھے ہو جو تم رپٹ لکھتے ہو ذلیلوں کی

ادب ان کا چلن ان کا زبان ان کی لباس ان کا
صدر صاحب ثقافت دیکھ لو انگلش سکولوں کی

مقدمہ مختصر اور فیصلہ بھی اپنے حق میں تھا
گیا پھنس کہ شرارت ہے رقیبوں کی اپیلوں کی

نہیں شرم و حیا باقی تو پابندی شریعت کیا؟
کہ جس نے بھاگنا ہو کیا فکر اس کو فصیلوں کی

صداقت شرم و حق گوئی گئے وقتوں کی باتیں ہیں
ابھی تک بات کوہلر کر رہے ہو اِن اصولوں کی

آدمی مسلمان

ایک سکھ خاندان کی نوجوان لڑکی کی عجیب کتھا۔ وہ دورے کی حالت میں قرآن پڑھتی تھی۔

محمد رضوان قیوم

یہ کہانی جس بزرگ شخص نے مجھے سنائی تھی وہ آج اس دنیا میں نہیں ہے۔ دراصل اس کتھا کے راوی میرے ایک قریبی دوست کے نانا تھے۔ ان کا نام تو وزیر محمد تھا۔ لیکن ان کا نام بگڑ کر وزیرا پڑ چکا تھا۔ لوگ تو انہیں وزیرا ہی کہہ کر پکارتے تھے لیکن میں اپنے دوست کے رشتہ کی وجہ سے انہیں نانا کہا کرتا تھا۔ موصوف اخلاق کے بہت اچھے اور بچوں سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ میری جب ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس وقت لگ بھگ 80 کے پیٹے میں تھے۔ میں اکثر جب اپنے دوست فہیم کے گھر جاتا تھا تو ان سے لازمی ملا کرتا تھا۔ درحقیقت میں ان سے ان کے بیتے دنوں کے تجربات کی کہانیاں سن کر اخبارات و رسائل میں لکھا کرتا تھا۔

ایک دن انہوں نے کہا:

''بیٹا رضوان! میں تمہیں ایک ایسی مافوق الفطرت کہانی سناتا ہوں جس کے کردار 1942ء یعنی تقسیم ہند سے پہلے کے ہیں۔''

جو کہانی نانا وزیرا نے مجھے سنائی میں قارئین حکایت کے لیے من و عن پیش کر رہا ہوں۔ اس کے بارے میں ہر کوئی اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد ہے۔

1940ء میں پونہ جو بھارت کا مشہور تاریخی شہر ہے۔ وہاں سے راولپنڈی بوجہ روزگار اپنے ماموں کلیم اللہ کے پاس آیا۔ بلکہ آیا کیا تھا انہوں نے میری ماں کو پونہ چٹھی ڈالی تھی کہ وزیر احمد کو میرے پاس پنڈی بھیج دو کیونکہ یہ پڑھائی سے ٹلا ہوا بے زار ہے۔ سارا دن آوارہ دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر سرگشت کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا میں اسے اپنے شہر میں کسی نہ کسی دھندے میں لگا دوں گا۔

میں ان کے پُرزور اصرار پر راولپنڈی شہر جولائی 1940ء میں آ گیا۔ میرے ماموں کی رہائش ان دنوں باغ سرداراں کے اس محلہ میں تھی جہاں سکھوں کی زیادہ تر آبادی تھی۔ میرا ماموں یہاں ایک بہت مالدار سکھ گلاب سنگھ کے ہاں اس کی جائیداد کی دیکھ بھال کے کام لیے چھوٹا موٹا منشی گیری کا کام کرتا تھا۔ گلاب سنگھ کی بہت وسیع جائیداد کا سلسلہ تھا۔ اس زمانہ میں ماموں کی تنخواہ 1000 روپے تھی۔ جو اس وقت کے لحاظ سے بہت اچھی تھی۔ گلاب سنگھ نے ماموں کی فیملی کے رہنے کے لیے رہائش اپنی حویلی کے ملحقہ بغلی کوارٹر میں دے رکھی تھی۔ ماموں اگرچہ شادی شدہ تھے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ لہٰذا مجھے بلانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح رکھنا چاہتے تھے۔ میری ممانی سکینہ بی بی انتہائی پارسا اور رحم دل خاتون تھیں۔ انہوں نے مجھے بہت لاڈ دیا۔

گلاب سنگھ کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام لکشمی کور جو بڑی تھی اور چھوٹی کا نام سونم تھا۔ اس کی بڑی بہن یعنی لکشمی لاہور کے کسی رئیس سکھ خاندان میں بیاہی ہوئی تھی۔ جبکہ سونم جس کی عمر جب میں نے اسے دیکھا تھا اس وقت 16 سے 17 سال تھی۔ وہ انتہائی خوبصورت نیلی آنکھوں اور بڑے دلکش جسمانی خدوخال کی دوشیزہ تھی۔ ایک تو باپ کی انتہائی دولت دوسرے خوبصورتی نے اس کی شخصیت کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ اس زمانہ میں سونے پر سہاگہ یہ کہ بہت چست کپڑے پہنا کرتی تھی۔ اس کے جسمانی اعضاء واضح ہو جاتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ علاقے کے منچلے لڑکے اس پر مرتے ہیں۔ لہٰذا وہ انہیں تڑپانے، جلانے کے لیے بہت بھڑکیلے کپڑے پہنتی تھی۔ لیکن کیونکہ گلاب سنگھ کا اپنا رعب، مرتبہ تھا اس لیے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اسے چھیڑے یا اظہار محبت کر سکے۔ وہ جہاں سے گزرتی قیامت ڈھاتی تھی۔ میری طرح اور کئی نوجوان اسے دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔

گلاب سنگھ کی کیونکہ وہ لاڈلی تھی لہٰذا اسے وہ پھولوں کی سیج میں رکھتا۔ اس کے کھانے، پینے، رہن سہن اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس کے باپ نے نوکروں کی پوری فوج تیار رکھی تھی۔ جن میں زیادہ تر تعداد مسلمانوں کی تھی جن میں، میں اور میرا ماموں بھی شامل تھے۔ مجھے ماموں نے گلاب سنگھ کی حویلی میں چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے دو سو روپے ماہوار پر نوکر کروا دیا۔

سونم کبھی کبھار میرے ساتھ اپنی مخصوص بگھی میں بیٹھ کر موتی بازار درزی کے پاس جاتی۔ میں اور ایک نوکر بگھی کی چوکیداری کے لیے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ بھاگا کرتے تھے۔

حرام زادے اُلو کے پٹھے نہ جانے کیا کیا اول فول گالیوں، القاب سے وہ ہمیں نوازتی تھی۔

سچی بات ہے وہ مجھے اتنی خوبصورت اور دلکش لگتی تھی کہ دل کرتا تھا کہ اسے کھینچ کر سینے سے لگا لوں۔ اس کے چہرے پر عجیب سی حکمت اور رعب تھا...... لیکن بحیثیت نوکر اور ماموں کی عزت کی خاطر اپنی ہی آگ میں جلا کرتا تھا۔

اگرچہ اس کے لیے بڑے مالدار سکھ فیملی کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے رشتے آ رہے تھے لیکن گلاب سنگھ کہتا تھا کہ:

"میری بیٹی سونا ہے۔ اسے ہیرے کے ساتھ ہی بیاہوں گا۔"

ادھر سونم بھی اپنے حسن پر اتنی نازاں تھی کہ اپنی مثال خود آپ دیا کرتی تھی۔

ایک دن صبح کے وقت میں حکیم بہاری لال کے پاس گلاب سنگھ کے لیے دوائی لینے جا رہا تھا کہ حویلی کا پرانا بوڑھا نوکر بھاگتا ہوا آیا وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور اس کی ٹانگیں پریشانی کے عالم میں لڑکھڑا رہی تھیں۔

میں نے بھی متفکرانہ انداز میں پوچھا:

"او بابا کیا ہوا ہے......؟"

"وہ جی...... سونم بی بی نہا کر چھت پر گئی تو انہوں نے اپنے بال سکھانے کے لیے جیسے ہی اپنی چٹیا کھولی ...... نہ جانے کیوں...... انہوں نے اتنی بھیانک چیخ ماری اور...... وہ اس وقت سے لے کر اب تک بے ہوش ہے۔"

میں اور وہ جب گلاب سنگھ کی حویلی بھاگ کر گئے تو وہاں واقعی سونم بے ہوش پڑی ہوئی تھی اس کے گرد کئی حکیم اور ڈاکٹرز کھڑے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے فوراً اٹھا کر ہسپتال لے جایا گیا۔ اسے میں نے اٹھایا ہوا تھا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تصور کر رہا تھا لیکن اس کا وزن بہت زیادہ تھا یعنی وہ اس وقت کوئی نرم، نازک حسینہ روئی کا پھویا نہیں بلکہ وزنی پتھر لگ رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے گلاب سنگھ کو تسلی دی کہ اسے کوئی شاک ہو گیا ہے۔

اس کے تمام سکھ رشتہ داروں اور دیگر لوگ اس کے ہوش میں آنے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ گلاب سنگھ اور اس کی بیوی پرارتھنا کرنے لگی۔

تقریباً دوپہر کے وقت اسے ہوش آیا۔ اس نے بڑے ڈراؤنے انداز میں مردانہ آواز نکال کر کہا:

"سب کو السلام علیکم۔" جو مسلمان وہاں کھڑے تھے، جن میں میرے ماموں اور میں بھی تھا اور بھی مسلمان تھے۔ سب نے چونک کر وعلیکم السلام کہا۔ سکھوں کے لبوں سے بھی بے اختیار وعلیکم السلام نکلا۔

سونم نے پاگل پن میں اپنے بیڈ کی چادر کھینچی اور اسے اپنے سر پر ڈال کر حیرت انگیز انداز میں قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔ اس کی یہ ادا دیکھ کر سکھ دہل گئے۔ پریشانی کا شکار ہو گئے یہ کیا ماجرا ہے......؟

گلاب سنگھ نے لڑکی کے ہوش میں آ جانے کی خوشی کے بجائے الٹا اسے برہمی کے عالم میں ڈانٹتے ہوئے کہا:

"یہ کیا بکواس کر رہی ہے......؟ تو سردارنی ہے مُسلی (مسلمان) نہیں۔"

سونم نے ایک زوردار تھپڑ گلاب سنگھ کے منہ پر رسید کرتے ہوئے زور زور سے قرآنی آیات پڑھنا شروع کر دیں۔

"او ...... جی ...... یہ تو مسلمان ہو گئی ہے۔" میرے قریب کھڑے ایک مسلمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کر۔" گلاب سنگھ نے اپنے گالوں پر کھایا ہوا تھپڑ اس شخص کے منہ پر منتقل کر دیا۔

سونم دیوانوں کی طرح عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی۔ اس نے وہی ہسپتال کے بیڈ کی چادر اٹھائی اور اسے جائے نماز بنا کر اسے فرش پر بچھایا اور بے ترتیب نماز پڑھنے لگی۔ اس کی آواز نسوانی نہیں رہی تھی، رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اب وہ مکمل مرد کے لہجے میں بول رہی تھی۔

"بیٹی یہ تجھے کیا ہو گیا ہے......؟" اس کی ماں نے ملائم انداز میں اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"تم سب کافر ہو۔ جہنم کی آگ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

اس کی دل ہلا دینے اور کان پھاڑنے والی آوازیں ہسپتال کے در و دیوار میں گونجنے لگی۔

"لگتا ہے۔ اس پر کوئی جناتی اثر ہو گیا ہے......؟" ایک بزرگ سکھ نے اس کا مرض خود تشخیص کیا۔

گلاب سنگھ خاموش، سہا ہوا بیٹی کی بدلتی صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

"اب کیا، کیا جائے......؟" اس نے اپنے ہم عمروں سے مشورہ کیا۔

مشورہ یہ طے پایا کہ۔ سونم کو کسی ماہر عملیات، جن اتارنے والے کو دکھایا جائے۔

اسے جب کئی سکھ، ہندوؤں، جناتی، عملیات اور جادو کی کاٹ کے ماہرین نے دیکھا تو۔ ان میں سے تقریباً سب نے متفقہ طور پر یہ تشخیص کیا کہ: سونم کے اندر کوئی مسلمان جن داخل ہو گیا ہے۔

گلاب سنگھ کی حالت بیٹی کی وجہ سے ناقابل دید ہو رہی تھی۔ وہ اس طرح لگ رہا تھا جیسے کوئی مچھلی ساحل پر تڑپ رہی ہو۔

ہندو ماہر عملیات پورم کا ان دنوں راولپنڈی، گجر خان، مری اور گرد بڑا طوطی بولتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے قبضہ میں ایسے عامل موجود ہیں جو کہ بڑے سے بڑے جن کو پلک جھپکنے سے پہلے ہی نکال باہر کر دیتے ہیں۔ پورم کو بلوا لیا گیا۔ اس نے آتے ہی سونم کے کولہوں پر زوردار ڈنڈا مارتے ہوئے کہا:

"جاتا ہے کہ نہیں تو......؟"

"نہیں جاؤں گا۔" جن بہت ضدی انداز میں مردانہ آواز نکال رہا تھا۔

"تو کون ہے......؟"

"میں مسلمان ہوں۔"

"زندگی چاہتا ہے تو چلا جا۔"

"نہیں جاؤں گا۔"

پورم نے اپنا پورا زور لگایا۔ بالآخر ایک شرط پر سونم کے اندر سے جن نکلنے کو راضی ہوا۔ وہ شرط یہ تھی کہ اگر سونم مسلمان ہو جانے کا وعدہ کرے تو وہ نکل جائے گا۔ ورنہ نہیں۔

"ہاں ...... ہاں وعدہ۔ سونم مسلمان ہو جائے گی۔" پورم نے کہا۔

"ابے! یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔ ہمارے کٹر سکھ

خاندان کی لڑکی کو تو مسلمان کر رہا ہے۔ میں تیری گردن اتار دوں گا۔" گلاب سنگھ کا چچا چلایا۔

"وہ سردار جی! میں وقتی طور پر اس اڑیل مسلمان جن کو چکمہ دے رہا ہوں کہ لوٹڑیا مسلمان ہو جائے گی۔ ایک دفعہ اسے نکل جانے دو۔ پھر کون مسلمان ہوتا ہے۔" اس نے سردار کے کانوں میں ہلکی سی کانا پھوسی کی۔

"تو وعدہ کر سونم مسلمان ہو جائے گی.....؟" جن نے کہا اور پھر جن نکل گیا۔ پورم نے اپنے کارنامہ یعنی سونم کے جسم سے مسلمان جن نکالنے کا گلاب سنگھ سے منہ مانگا معاوضہ طلب کیا۔

☆☆☆

چند دنوں کے بعد سونم نارمل ہو گئی۔ اس نے اپنے باپ، ماں اور اپنے دیگر سکھ رشتہ داروں سے اپنے گزشتہ رویوں کی معافی مانگی۔ وہ پھر سے ماڈرن اور مغرور ہو گئی۔

گلاب سنگھ کو اس کے بڑوں نے مشورہ دیا کہ اس کی جلد از جلد کسی اچھے پڑھے لکھے نوجوان سے شادی کر دی جائے۔

لہٰذا گلاب سنگھ نے ایک سرکاری افسر گورو سنگھ (جس کا تعلق سوٹ سے تھا) سے سونم کی شادی کر دی۔ دونوں میں ہی بہت پیار تھا۔ گورو سنگھ شریف النفس، رحم دل انسان تھا۔ ان کے دو بچے ہوئے ایک لڑکا اور دوسری لڑکی۔

☆☆☆

ایک دن گلاب سنگھ میرے ماموں سے اپنی جائیداد کے کرایہ داروں اور دیگر معاملات کا حساب لے رہا تھا اور میں ان کی حویلی کے استعمال کا ضروری سودا سلف لے کر وہاں پہنچا ہی تھا کہ گورو سنگھ وہاں غصے اور برہمی کے عالم میں آیا۔ اس کے سر پر تازہ زخم ہونے کی وجہ سے پٹی بندھی ہوئی تھی اور سر کے عین اوپر چلے ہوئے کا نشان تھا۔

گلاب سنگھ، میرے ماموں اور وہاں موجود سب نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا کہ:

"یہ کیا ہوا ہے......؟"

اس نے پہلے تو خلاف توقع بڑی بڑی گالیاں دیں اور گلاب سنگھ کو مخاطب ہو کر کہا:

"چل دیکھ! تیری بیٹی نے پورے گھر کا کیا حال کیا ہے......؟ اس نے اپنی بیٹی کو شدید زخمی کر دیا ہے۔"

"پر کیوں۔ کیسے......؟" گلاب سنگھ نے اپنے اعصاب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تو چل تو سہی۔" اس نے پہلی دفعہ گستاخی اور بدتمیزی کی تھی۔ وہاں کھڑے ماموں اور باقی لوگ اسے ہرا چھڑانے کے لیے آگے بڑھے لیکن گلاب سنگھ نے سب کو اپنے ہاتھ کے اشارے کی مدد سے روک دیا۔

"کیا ہوا......؟ بتاتا کیوں نہیں۔ اب پہیلیاں بجھوائے گا تو......؟"

"ارے پھر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ کوئی جن پھر گھس گیا ہے اس کے اندر۔ تم نے ہم سے دھوکہ کیا ہے۔ پاگل جنوں کے سائے والی لڑکی ہمیں پکڑا دی۔" وہ چلایا۔

گلاب سنگھ نے ماموں کو کہا۔

"چل کلیم اللہ! بگھی پر گھوڑے کس۔"

گلاب سنگھ، اس کی بیوی، میرے ماموں اور میرے سمیت 10 سے 15 افراد جب گورو سنگھ کے گھر پہنچے تو واقعی وہاں سونم مردانہ آواز میں قرآن مجید کی سورتیں پڑھ رہی تھی۔ تقریباً وہی حرکتیں کر رہی تھی۔ جو اس نے پہلے کی تھیں۔ اس نے پورے گھر کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اپنے خاوند اور بیٹی کے جسم پر شدید گھاؤ ڈال دیے تھے۔

وہ اس وقت دیکھنے میں بالکل پاگل لگتی تھی اور عجیب عجیب حرکتیں کر رہی تھیں۔ کبھی کلمہ پڑھتی، کبھی زمین پر چادر بچھا کر الٹی سیدھی نماز پڑھتی تھی۔

اس میں اتنی طاقت آ گئی تھی جسے کئی آدمی سنبھالنے سے قاصر تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کے ماں باپ نے اسے پکڑنا چاہا تو وہ غضب ناک ہو گئی۔

"ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔" وہ حج اور عمرہ کرنے کی باتیں کرتی رہی۔ وہ مردانہ آواز میں کبھی ہنستی اور سینہ کوبی کرتی۔

سب سکھ رو رو کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ۔ بیٹی ہوش میں آ۔

لیکن اس کا مچلنا، چیخنا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"اسی پورم کو پھر بلا۔" گلاب سنگھ نے ماموں کی طرف چلاتے ہوئے کہا۔

پورم آیا تو تمام سکھوں نے اس پر چڑھائی کر دی۔

"اب! وہ مسلمان جن تیرا نکالا ہوا پھر آ گیا ہے۔ اگر نہیں نکالا تو تیری خیر نہیں۔ اب نکال اسے۔"

پورم نے اپنا مخصوص بھجن پڑھا سونم کے اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ پورم پورا گھنٹہ اپنا جاپ (ورد) کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔

گلاب سنگھ کے آدمیوں نے دھکے، مکے مار کر بھگا دیا۔

سونم کا دیوانہ پن ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تنگ آ کر اسے رسیوں سے اس طرح قابو کیا جس طرح قصائی ذبح سے پہلے گائے کی ٹانگیں باندھتے ہیں۔ چند لمحوں بعد ہی رسی ٹوٹی۔ وہ فوراً بھاگ کر اپنی زخمی بچی کے اوپر چڑھ گئی۔ صرف چڑھی نہیں بلکہ اس کی مضبوطی کے ساتھ گردن دبائی کہ اس کی سانسیں برابر کر دیں۔ وہ مر گئی تھی۔

گورو سنگھ، اس کی ماں، بیٹا یہاں تک کہ گلاب سنگھ سب دھاڑیں مار مار رونے لگے اب سکھ خاندان ماتم کدہ اور پریشان گھروندا بن کر گیا۔

بہت تھک ہار کر بالآخر گلاب سنگھ نے ایک مسلمان عامل کو دہلی سے بلوایا۔ اس نے سونم کے اندر مسلمان جن سے پوچھا۔

"بتلاؤ تم کیا چاہتے ہو......؟ تم نے اس کے ذریعے اس کی بچی کو کیوں مروایا......؟ خاوند کو شدید زخمی کیا۔"

"یہ جھوٹے لوگ ہیں۔" جن بولا۔ "انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ مسلمان ہو جائے گی۔ لیکن اس نے اپنا مذہب نہیں بدلا۔ لہٰذا اسے کوئی نہ کوئی سزا تو دینی تھی۔"

"تم نکل جاؤ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ یہ مسلمان ہو جائے گی۔"

"نہیں...... نہیں اب میں کبھی بھی اس کے جسم سے جدا نہیں ہوں گا۔"

کہانی لمبی ہے۔ الغرض آخر میں یہی ہوا کہ سونم کے خاوند نے تنگ آ کر اسے طلاق دے دی اور بچہ چھین لیا۔ گلاب سنگھ ہارٹ فیل ہو جانے کے ذریعے سے مرا۔ جبکہ سونم حویلی کے باہر چوک پر بیٹھی ہر وقت الٹے سیدھے کلمے، نمازیں پڑھتی رہتی تھی۔

مسلمان اسے آدھی مسلمان، ہندو اور سائیں کہا کرتے تھے۔

ایک رات سونم کی گلا کٹی لاش نالہ لئی کے کنارے ملی۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ اسے ہندوؤں یا سکھوں نے اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ سکھنی، سردارنی ہو کر مسلمانوں کا کلمہ اور عبادت کیوں کرتی ہے۔

* * *

دھوپ کے پگھلنے تک

امجد جاوید

قسط نمبر:4

تلوار کے وار کو لاٹھی پر نہیں روکا جاتا اور نہ ہی گولی کو ہاتھ روک سکتے ہیں۔ جنگ جیتنے کے لئے دشمن کے ہتھیار سے بڑا ہتھیار رکھنا پڑتا ہے۔ اور وہ ہتھیار ہے میرے پاس۔

دن کی تیز روشنی میں سراج اپنے ٹریکٹر پر آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ راستے میں چوراہے پر کوئی جیپ لے کر اس کے راستے میں یوں کھڑا تھا کہ سراج کو اپنا ٹریکٹر لازماً روکنا پڑتا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا تو سامنے ماکھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس نے ٹریکٹر روکا اور ماکھے کو مخاطب کر کے پوچھا

"کیا بات ہے ماکھے، یوں راستہ کیوں روکا ہوا ہے۔ خیر تو ہے نا تجھے؟"

"تم خود سمجھدار ہو۔ میرا نہیں خیال کہ تجھے چھوٹی موٹی بات سمجھانا پڑے گی۔" ماکھے نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"کھل کر بات کرو کیا کہنا چاہتے ہو۔ یا پھر میرا راستہ چھوڑ دو۔" سراج نے تحمل سے کہا۔

"رستہ تو ہم دیں گے آج۔ لیکن تم جانتے ہو کہ ہم جب چاہیں تمہارا راستہ روک لیں اور تمہارا ہر رستہ بھی بند کر دیں۔ اس لئے ذرا دھیان سے رہو۔" ماکھے نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا

"دیکھو ماکھے۔ تم میں اتنی جرات نہیں ہے کہ تو کسی کا راستہ روک لے یا بند کر دے۔ نوکر بندے کا کیا ہوتا ہے۔ ہاں! اگر تو اپنے چوہدریوں کا کوئی پیغام لے کر آیا تو صاف صاف کہہ، پہیلیاں کیوں ڈال رہا ہے۔" سراج نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا لیکن طنز پھر بھی اس کے لہجے میں گھل گیا تھا۔ تبھی ماکھے نے غصے میں کہا

"تو پھر سن، یہ جو فہد شہر سے آیا ہے نا۔ اس کی وجہ سے اپنی قسمت خراب مت کر لینا۔ تم جانتے ہو کہ کے چوہدری نے تیرے بھائی امین کے ساتھ کیا کیا تھا۔ وہ حال تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔"

اس کے یوں کہنے پر سراج تڑپ اٹھا۔ اس نے انتہائی غصے میں اونچی آواز میں کہا

"چوہدریوں کو یہ بات جا کر کہہ دے ماکھے۔ فہد یہاں آتا یا نہ آتا۔ میں نے اپنے بھائی کا انتقام ضرور لینا ہے۔ اور آئندہ مجھے کوئی دھمکی نہیں دینا۔ میں نے فہد کا ساتھ ہر صورت میں دینا ہے۔ اب راستہ چھوڑ دو۔"

ماکھے نے سراج کی بات سنی اور اپنی کسی دھمکی کا اثر نہ ہوتے دیکھ کر اپنی گن سیدھی کر کے بولٹ چڑھایا اور اس کی طرف سیدھی کر کے بولا

"سراج، میں ابھی تمہیں گولی مار سکتا ہوں لیکن کے چوہدری کا حکم ہے کہ تمہیں صرف سمجھانا ہے۔ ورنہ تو موت مانگے گا۔ اور وہ نہیں ملے گی۔ کیا تجھے اپنے بھائی کو دیکھ کر عبرت نہیں ملی۔"

"بکواس بند کرو اوئے، اسی کو دیکھ کر چوہدریوں سے انتقام لینے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ تم اس کے نوکر ہو۔ اتنی بڑی بات مت کرو۔ تیری اوقات ہی نہیں ہے۔ جاؤ، کے چوہدری کو بھیجو وہ مجھ سے بات کرے۔ چلو راستہ چھوڑ دو ورنہ......"

یہ کہتے ہوئے سراج نے بھی گن نکال لی۔ ماکھا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چونک گیا اور اس وقت وہ حواس باختہ ہو گیا جب فہد کی گاڑی وہاں آن رکی۔ اس میں سلمٰی گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے لئے یہ منظر بہت دہشت ناک تھا۔ فہد نے ایک نظر سلمٰی کو دیکھا اور نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے حوصلہ دے کر کار سے باہر آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ماکھے نے حیرت سے سلمٰی کی طرف دیکھا جو کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں جا بیٹھا۔ تبھی سراج نے اونچی آواز میں کہا

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے فہد۔ تم چلو، میں آتا ہوں۔"

فہد گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سلمٰی بہت خوف زدہ تھی۔

اس نے ایک نگاہ سلمیٰ کی طرف دیکھا اور کارگاڑی کی طرف بڑھادی۔ فہد سمجھ رہا تھا کہ یہ منظر کیا کہہ رہا ہے۔

فہد والان میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سلمیٰ پانی لے کر آ گئی۔ اس نے جگ قریب پڑے چھوٹے میز پر رکھا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی

"فہد، یہ میری کیسی قسمت ہے...... ذرا سی خوشی ملتی ہے تو، ساتھ خوف کے مہیب سائے کیوں منڈلانے لگتے ہیں۔ ادھوری خوشی کیوں ہے میرے نصیب میں۔"

"تم ایسے کیوں سوچ رہی ہو؟" فہد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تو تیز انداز میں بولی

"ٹھیک ہے آپ کے آنے سے مجھے تحفظ کا احساس ہوا ہے۔ لیکن آپ سے جو چوہدریوں کی دشمنی بڑھ رہی ہے۔ ان حالات میں اور کیا سوچا جا سکتا ہے۔"

"یہ تو ہونا ہی ہے۔ کون چاہتا ہے کہ اس کی حکمرانی ختم ہو۔ ہر وہ بندہ جو اُن کی حکمرانی ختم کر سکتا ہے۔ وہ اس کے دشمن بن جائیں گے۔" وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو وہ تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

"وہ آپ کو...... نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ دیکھا نہیں کس طرح وہ......"

"سلمیٰ! کسی بھی غلط فہمی میں نہیں رہنا۔ دشمنی میں جان بھی جا سکتی ہے اور ہر اس بندے کو خطرہ ہے، جس کا تعلق میرے ساتھ ہے۔ اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔" فہد نے ایک دم سے حتمی لہجے میں کہا

"اس کا مجھے پوری طرح احساس ہے۔ ہم تو پہلے ہی گھٹ گھٹ کر جی رہے ہیں۔ ہماری زندگی بھی کیا زندگی ہے، مگر آپ یہ سب کچھ چھوڑ کر اچھا مستقبل اپنا سکتے ہیں۔ کیوں اپنی جان برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" سلمیٰ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

"یہ سب بھول جاؤ سلمیٰ!! اور یہ یاد رکھو کہ میں نے اپنا سب کچھ وہیں شہر چھوڑ دیا ہے۔ اب میرا جینا مرنا یہیں ہے۔ یہاں سے چلے جانا بہت آسان ہے۔ مگر کیا چوہدریوں کو یونہی ظلم کرنے کے لئے چھوڑ دوں۔ نہیں سلمیٰ! جتنا میرے بس میں ہے۔ میں وہ کروں گا۔ اس راہ میں کوئی میرا ساتھ دے یا خوف زدہ ہو کر میرا ساتھ چھوڑ دے۔" اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا

"میں اپنے لئے خوف زدہ نہیں ہوں۔ مجھے آپ کی فکر ہے۔ میرا کیا ہے، میرا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ مٹی تھی، مٹی ہوں اور مٹی رہوں گی۔" سلمیٰ نے انتہائی مایوسانہ انداز میں کہا

"نہیں سلمیٰ! تم مٹی نہیں ہو۔ تم تو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہو۔ اپنے دماغ سے یہ خیال نکال دو کہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ تم پڑھی لکھی ایک باشعور لڑکی ہو۔ جس میں یہ صلاحیت ہے کہ جو دوسروں کو بھی شعور بانٹ سکے۔" فہد نے اسے احساس دلاتے ہوئے زوردار انداز میں کہا تو سلمیٰ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک عزم سے کہا

"کیا میں ایسا کر سکتی ہوں۔ کیا میرا وجود، آپ کے کسی مقصد میں کام آ سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں پوری جان سے حاضر ہوں۔ مجھے بتائیں کیا کرنا ہوگا۔"

"اب تک یہی بات تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ یہاں کا ہر فرد میرا مددگار ہو سکتا ہے اور سلمیٰ تم، ایک تمہی تو میرا حوصلہ ہو۔ تم وہ کچھ کر سکتی ہو جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا کیونکہ ایک تمہی ہو جسے میں پہلے سب سے زیادہ قریب سمجھتا ہوں۔ اس سفر میں میری ہم سفر ہو۔" وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولا۔

"مجھے بتائیں فہد! میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟" سلمیٰ حتمی انداز میں پوچھا۔

"خود میں اتنی ہمت پیدا کر لو کہ خوف کے چنگل

بھی سائے پھیل جائیں۔ تم ہر حال میں حوصلہ مند رہو۔ جتنا بڑا طوفان آ جائے۔ تم ثابت قدم رہو۔۔ اور تم جانتی ہو ایسا کیسے ممکن ہے۔" فہد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سکون سے کہا تو وہ فہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی

"محبت، یہ محبت ہی ہے جو طوفان سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟"

"محبت لفظوں کا کھیل نہیں، ثابت کر دینے کا نام ہے سلمٰی۔" فہد نے ٹھہرآ گیں لہجے میں کہا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہر دم، ہر گھڑی، ہر جگہ۔ ثابت کر دوں گی۔" سلمٰی عزم سے بولی۔

"تو میرا یقین رکھو! ان چوہدریوں کا خوف ذہن سے اتار کر جیو۔ اپنی سہیلیوں سے ملو۔ ہر کسی کے دکھ درد میں کام آؤ۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر حوصلہ دیتے ہوئے بولا تبھی اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کہا۔

"میں آپ کے لئے کھانا لگاتی ہوں۔"

سلمٰی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس کا شرم سے سرخ چہرہ دیکھ کر فہد مسکرا دیا۔ وہ تیزی سے کچن میں چلی گئی۔

کھانے کے دوران ہی سلمٰی کی کچھ سہیلیاں آ گئیں۔ فہد کھانے کے بعد اپنے گھر جانے کے لئے اٹھ گیا۔ جہاں سراج اور امین آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں چھاکا چائے لا کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"لو بھئی! میں نے تو اپنی طرف سے کڑک چائے بنائی ہے اب جیسی بھی ہے پی لینا۔"

"اوئے ٹولا تو سہی، باتیں ہی کرتا رہے گا۔" سراج نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس پر چھاکا شوخی سے بولا۔

"او سراج اک ہی تو چھاکا ہے پنڈ میں، جس کی پورے علاقے میں دس وِچھ ہے۔ اسے چائے بھی بنانی نہیں آئے گی۔"

"تیری دس وِچھ تو ہے لیکن چھاکے یارا تو کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟" فہد نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس کے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے جذباتی ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا کام کروں ہتا۔ چند جماعتیں پڑھی ہیں، کون سا افسر لگ جانا ہے۔ کرنی تو یہی محنت مزدوری ہے نا۔ باپ بھی یہی کرتا آیا ہے اور اب میں بھی، روٹی پوری کر لیں یہی بڑی بات ہے۔"

"کیوں! کیا تیرے سر میں بھیجہ نہیں ہے؟" یہ کہتے ہوئے خود ہی سوچتے ہوئے بولا۔ "انہیں یہ شعور ہی نہیں کہ ملک کے وسائل پر ان کا بھی حق ہے۔ ان کے وسائل تو کسی اور کے قبضے میں ہیں۔ یہی بات تو ان گاؤں والوں کو سمجھانی ہے۔ سراج! تم میری ایک مدد کرو۔ یہاں گاؤں میں کوئی خالی زمین اگر کوئی فروخت کر رہا ہے تو میں وہ خریدنا چاہتا ہوں۔"

"زمین ...... چاچا عمر حیات بیچنا چاہتا ہے۔ اس کے خاندان والے خود خریدنا چاہتے ہیں۔ چوہدریوں کے پاس پنچایت بھی چل رہی ہے ان کی۔ مگر تم اس کا کرو گے کیا۔" سراج نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں اسے کسی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مقصد کیا ہے۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہ کام کرو۔" فہد نے حتمی لہجے میں کہا تو سراج بولا۔

"سمجھو۔ تمہارا یہ کام کل ہی ہو جائے گا۔"

"اور پرسوں کاغذی کارروائی کے بعد رقم بھی ادا کر دوں گا۔ اور چھاکے تم یہ آوارہ مت پھرا کرو بلکہ میرے ساتھ رہا کرو۔ بہت سارے کام ہوتے ہیں کرنے کے لئے۔ اور تم امین پورے دھیان سے، ادھر ادھر کا خیال کر کے رہا کرو۔" فہد نے تیزی سے کہا۔

"نہیں فہد! مجھے اس وقت تک سکون نہیں ہوگا جب تک میں اپنے دوست کے قتل کا بدلہ نہ لے لوں۔ تم دونوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا، کیا ہوا وہ؟ کیسا اندھیر ہے یار، میں قتل کا چشم دید گواہ ہوں، اور میری کہیں شنوائی نہیں۔"

"فکر نہ کر امین، کل ہی تیری ایف آئی درج ہوگی، تم کل تیار رہنا، تھانے چلیں گے۔" فہد نے اسے یقین دلایا۔

"میں ہر وقت تیار ہوں فہد۔" امین نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ تبھی سراج تشویش سے بولا۔

"یار! ایک بات میرے دماغ میں کھٹک رہی ہے۔ ماکھا اگر میرا راستہ روک سکتا ہے تو ہمارے ہی کسی اپنے کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ میری مانو تو اب رات یہاں نہ رہا کرو۔ استاد جی کے گھر رہو یا میرے پاس۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ چلو ایسا ہی کرتے ہیں۔ ابھی یہ چائے تو پیئیں۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" فہد نے کہا اور چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چائے پینے کے بعد سراج اٹھ گیا۔

"فہد میں تمہاری کار لے کر جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے لے جاؤ۔" فہد نے کہا اور امین سے باتیں کرنے لگا۔ چھاکا بھی سراج کے ساتھ باہر نکل گیا۔ گاؤں کے چوک میں جا کر چھاکا اتر گیا۔ اس نے حنیف دوکان دار سے اپنے مرغے کے لئے بادام لئے اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ چھاکے کے گھر میں وہی ویرانی تھی۔ چاچا سوہنا گھر پر نہیں تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنے مرغے کو پکڑ لیا۔

چھاکا اپنے مرغے کو لیے چارپائی پر بیٹھا ہوا، اسے بادام کھلا رہا تھا اور ساتھ میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"دیکھ شہزادے، میں نے تیری ٹہل سیوا میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس لیے اب تو نے مقابلہ جیت کر دکھانا ہے۔ میری کنڈ نہیں لگنے دینی۔" اس پر مرغا یوں بول اٹھا، جیسے وہ اس کی بات سمجھ رہا ہو۔ تبھی چھاکا اپنی دھن میں کہتا چلا گیا۔ "ہاں! شاباش، تو میری گل سمجھتا ہے۔ تجھے تو پتہ ہے اک ہی تے میں ہوں اس پنڈ میں جس کی دس پچھ ہے...... اگر تو ہار گیا نا تو پھر میری کیا عزت رہ جائے گی بھلا۔"

اس کی باتوں کے دوران چاچا سوہنا گھر آ گیا۔ وہ صحن میں آیا اور قریب پڑی چارپائی پر خاموشی سے آ کر لیٹ گیا۔ چھاکے نے اپنے باپ کو حیرت سے دیکھا۔ ہر وقت اپنے آپ کو خوش رکھنے والا چاچا سوہنا آج اتنا خاموش کیوں ہے۔ چھاکے نے دھیرے سے پوچھا۔

"ابا، خیر تو ہے نا، بڑا چپ ہے۔ نہ مجھے کچھ کہا نہ میرے شہزادے کو۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، کہیں کسی عشق میں ناکام تو نہیں ہو گیا۔"

"اوئے چپ، ٹھیک ہے میری طبیعت۔ اب میں نے کیا عشق کرنا ہے یار۔ اب تو بس آگے کی فکر ہے۔ وہ جس طرح میاں محمد بخش سرکار نہیں کہتے۔ سدا نہ باغیں بلبل بولے۔ سدا نہ باغ بہاراں...... سدا نہ ماپے حسن جوانی سدا نہ صحبت یاراں۔" چاچے سوہنے کی آواز میں نہ جانے کیوں سوز در آیا تھا۔ چھاکا ایک دم سے جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے مرغے کو ایک طرف اچھالا اور اپنے باپ کے پاس جا کر بیٹھ گیا، پھر بڑے پیار سے پوچھا

"ابا! خیر تو ہے نا، ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟"

"او پتر اس قسمت گھر کی قسمت پتہ نہیں کیا ہے...... پہلے تو صرف چوہدریوں کا خوف تھا۔ اب فہد کے آنے سے خوف بڑھ گیا ہے پتہ نہیں کیا ہوگا۔" چاچا سوہنا تشویش سے بولا تو چھاکے نے کہا

"فہد ان کی طرح ظالم تو نہیں ہے ابا۔ وہ تو خود

چوہدریوں کے ظلم کا شکار رہا تھا۔"

"اوئے چھاکے، اگر فہد کوئی تیرے اور میرے جیسا عام سا بندہ ہوتا نا تو کوئی ڈر نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ مضبوط ہیں تو وہ ان چوہدریوں سے ٹکر لینے آ گیا ہے۔ مجھے ڈر یہ ہے پتر کہ جب دو ہاتھی آپس میں لڑ پڑیں نا تو نقصان اس بستی کا ہوتا ہے جہاں ان کی لڑائی ہو، پتہ نہیں اب اس قسمت نگر کا کیا ہوگا۔" اس کے لہجے میں سے خوف چھلک رہا تھا۔

"او ابا، رب سائیں چنگا کرے گا تو ایویں خوف نہ کھا۔ بلکہ حوصلے کا انجکشن لگوا، قسمت میں جو ہونا ہو وہ ہو کر رہتا ہے۔ وہ پارگاؤں کی بیوہ بارے پتہ کیا تھا میں نے......" چھاکے نے مذاق میں کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر اکتاہٹ سے بولا

"او جا، جا کر اپنے گڑ کو بادام کھلا۔ میرا سر نہ کھا۔ مجھے کچھ دیر آرام کرنے دے۔" چاچے سوہنے نے جیسے ہی کہا تو مرتا بول اٹھا۔ چھاکا پہلے تو اپنے باپ کو بڑی گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر کاندھے اچکا کر ایک طرف جا بیٹھا۔ چاچا سوہنا ہلکے ہلکے گنگنانے لگا۔

"ٹوٹے لوئے...... بھر لے کڑیے...... بے کر بھانڈا ابھرنا۔"

اس کی آواز میں سوز نجانے کہاں سے آ گیا تھا۔

سراج کچھ دیر بعد ہی چاچے عمر حیات کو اس کے کھیتوں میں جا ملا۔ اس نے سڑک کنارے کار روکی تو وہیں دونوں ایک کھیت کی منڈھیر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

"چاچا، سنا ہے کہ تو اپنی زمین بیچ رہا ہے؟ کیا یہ سچی بات ہے؟" سراج نے صاف لفظوں میں پوچھا۔

"ہاں پتر! مگر میرے بھائی بیچنے ہی نہیں دے رہے۔ وہ خواہ مخواہ مجھے اذیت دے رہے ہیں۔ زمین بیچنا میری مجبوری بن گئی ہے پتر۔" عمر حیات نے بتایا۔

"ایسی بھی کیا مجبوری چاچا، تمہاری زمین ہے، تم خود کاشت کرو۔ بیچنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا مجبوری بن گئی ہے۔" سراج نے پوچھا تو عمر حیات نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"کاش پتر، کوئی تیرے جیسا میرا پتر ہوتا تو میں بھی سر اٹھا کر اپنے بھائیوں کا مقابلہ کر لیتا۔ تو جانتا ہے کہ میری ایک ہی بیٹی ہے، میرے بھائی صرف جائیداد کی خاطر اسے مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو ساری عمر کے لیے اذیت میں نہیں ڈال سکتا۔"

"ایسے کیسے چھین لیں گے وہ تجھ سے، اتنی بھی اندھیر نگری نہیں ہے۔" سراج نے کہا۔

"ہے، اندھیر نگری ہے پتر، تو یہاں نہیں رہا، تجھے نہیں پتہ۔ یہ تیرے بھائی کے ساتھ جو ہوا، وہ تو نہیں جانتا؟ چوہدری میرے بھائیوں کے ساتھ ہے۔ کسی دن چپکے سے مجھے قتل بھی کر سکتے ہیں۔ میری دھی اس دنیا میں تنہا رہ جائے۔ نہیں پتر، میں اس کی جلد از جلد شادی کر کے، اسے اپنے گھر کی کرنا چاہتا ہوں۔ یہی زمین میری دشمن بنی ہوئی ہے۔ میں اب اسے نہیں رکھنا چاہتا۔" چاچے عمر حیات نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو اس نے پوچھا۔

"کیا اس لیے نہیں بک رہی زمین؟"

"ہاں، خریدار کسی بھی پھڈے سے ڈرتے ہیں، میرے بھائی اور چوہدری ان کا جینا حرام کر دیں گے۔" چاچے نے کہا تو سراج نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔

"چاچا تم اس کی جو رقم مانگتے ہو، میں دیتا ہوں۔ کر لو سودا، اگر تمہارا دل مانے تو، پھڈے میں دیکھ لوں گا۔"

"تم یا فہد؟" عمر حیات نے حیرت سے پوچھا۔

"فہد ہی سمجھ لو۔" سراج نے صاف گوئی سے کہا۔

"یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ کل چوہدریوں

نے اس زمین کے معاملے میں پھڈا ڈالنا ہے اور میں تمہیں جانتا ہوں، تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔" چاچے عمر حیات نے کہا تو سراج غصے میں بولا۔

"یہ ہم دیکھ لیں گے۔ بس تو ثابت قدم رہنا۔"

"جہاں چاہے جان لے لینا۔" چاچے عمر حیات نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آج شام اپنی رقم لے کر لکھ پڑھ کر لینا۔ میں اور فہد آ جائیں گے۔" سراج نے حتمی انداز میں کہا تو چاچے عمر حیات نے کہا۔

"میں انتظار کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں اس بارے باتیں کرنے لگے۔ قسمت نگر میں اک نیا باب لکھا جانے والا تھا۔

☆......☆......☆

چوہدری کبیر صوفے پر بیٹھا ہوا اور ماکھا اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ اس نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا

"ہوں تو اس کا مطلب ہے سراج سیدھے طریقے سے نہیں سمجھا۔ اب اسے اچھی طرح سمجھانا پڑے گا۔"

"اس کا تو رنگ ڈھنگ ہی بدلا ہوا ہے چوہدری صاحب! اب تو وہ اپنے ساتھ اسلحہ بھی رکھتا ہے۔ پہلے ان میں اتنا حوصلہ نہیں تھا۔" ماکھے نے بتایا۔

"کیا اسلحہ بھی؟...... اسے یہ حوصلہ ملا کیسے؟"

"فہد نے، یہ حوصلہ انہیں فہد ہی نے تو دیا ہے اور وہ بھی وہیں آ گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے جیسے اسے یاد آ گیا، تبھی اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اور ایک بات اور بتاؤں کے چوہدری جی......"

"ایسی کیا بات ہے ماکھے؟" کبیر نے حیرت سے پوچھا

"فہد کے ساتھ کار میں سلمٰی بھی تھی چوہدری جی۔ لگتا ہے وہ بھی فہد کا حوصلہ پا کر گھر سے باہر نکلی ہے۔ اکیلی اس کے ساتھ تھی۔"

یہ سنتے ہی کبیر حیران رہ گیا۔ وہ حیرت اور غصے میں بولا۔

"سلمٰی...... فہد کے ساتھ؟ اس کا مطلب ہے سلمٰی بھی...... وہ بھی اپنے پر نکالنے لگی ہے۔ نہیں چھوڑوں گا، اب فہد کے دن قریب آ گئے ہیں، اب اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

"تو پھر اس سارے فساد کی جڑ، فہد ہی کا کام کر دیں؟" ماکھے نے پوچھا۔ "ہاں! وہ اب جہاں بھی ملے۔ اس کا کام......" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رک گیا پھر سوچتے ہوئے مسکرا کر سفاکانہ لہجے میں بولا۔

"لیکن نہیں۔ پہلے سلمٰی کو اٹھا کر پار ڈیرے میں پہنچا دو۔ میں کچھ دن فہد کا تڑپنا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"جیسے حکم چوہدری صاحب! میں آج رات ہی اسے اٹھا لیتا ہوں۔ یہ کام ہو گیا سمجھیں۔" ماکھے نے یوں کہا جیسے اس کی اپنی مرضی بھی اسی میں ہو۔ وہ اپنا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ تبھی کبیر نے کہا

"اور دیکھو! گاؤں میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے کہ سلمٰی ہے کدھر! میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ فہد اسے کیسے تلاش کرتا ہے۔ یہ کھیل بھی کھیل کر دیکھتے ہیں یار۔ مارنا تو اسے دینا ہی ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا چوہدری جی۔" ماکھا خوشی سے بولا۔

"چل اب جا، تم صبح وہیں پار والے ڈیرے پر میرا انتظار کرنا وہیں آؤں گا۔" کبیر نے کہا تو ماکھا تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ چوہدری کبیر سوچ میں گم تھا اور اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔

☆......☆......☆

اس وقت رات کا پہلا پہر ختم ہو چکا تھا۔ ماسٹر دین محمد کے گھر صحن میں فہد بستر پر پڑا ہوا تھا کہ اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے آہٹ کا احساس ہوا تھا۔

اسے خطرہ محسوس ہوا تو اس نے سرہانے کے نیچے سے پسٹل نکالا اور آہستگی سے باہر کی جانب لپکا۔ اسے ایک سایہ صحن عبور کرتا ہوا دکھائی دیا۔ جیسے ہی وہ سایہ اس کے پسٹل کی رینج میں آیا تو اس نے کڑک کر کہا

"رُک جاؤ! ورنہ گولی مار دوں گا۔"

وہ سایہ ایک دم سے ٹھٹک گیا پھر پلٹ کر گن سیدھی کی ہی تھی کہ فہد نے فائر کر دیا۔ وہ سایہ پلٹ کر گرا۔ فہد تیزی سے اس کے سر پر جا پہنچا۔ وہ ماکھا تھا اور اوندھے منہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ وہ اپنی ٹانگ پر ہاتھ رکھے ہوئے تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ فہد کو آگے بڑھتے دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایسا یہ تاثر پھیل گیا جیسے موت کو اپنے سامنے دیکھ کر سر جھکا چکا ہو۔ فہد نے اس کے سر پر پسٹل کی نال رکھ دی۔ پھر اس کی گن پکڑ کر سرد لہجے میں بولا

"کیوں آئے ہو؟ سچ بتانا، ورنہ......"

یہ کہتے ہوئے فہد نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا تو ماکھا کراہتے ہوئے بولا

"س...... س...... سلمیٰ کو اٹھانے، کے چوہدری نے حکم......"

وہ بتا رہا تھا کہ اتنے میں سلمیٰ کمرے سے نکلتی ہوئی یہ بات سن لی۔ وہ ایک دم سے خوف زدہ ہو گئی۔ فہد نے اس سے کہا۔ "کیا سمجھا ہوا ہے تم لوگوں نے اس گھر کو۔ تم اور تیرے چوہدری کو معلوم نہیں کہ اس گھر کی حفاظت کرنے والا آ گیا ہے، پھر بھی پاگل پن کیا ہے تم لوگوں نے؟"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ماسٹر دین محمد اندر سے باہر نکل آیا۔ وہ باہر کی صورت حال دیکھ کر گھبرا گیا۔

ایسے میں ماکھا دہشت زدہ لہجے میں بولا۔

"میں چلا جاتا ہوں۔ پھر آئندہ کبھی اس گھر کی طرف منہ نہیں کروں گا۔"

"ماکھے! تیری زندگی اور موت کے درمیان بس ایک لمحہ ہے۔ میں چاہوں تو اس چار دیواری کا تقدس پامال کرنے پر تمہیں ابھی سزا دے دوں۔ لیکن تُو کسی کا نوکر ہے۔ تیرے مر جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ تیری جگہ کوئی اور آ جائے گا۔" فہد نے کہا تو ماکھا چونک گیا۔ چند لمحے سر جھکائے رہا پھر عجیب سے لہجے میں بولا

"مجھے معاف کر دے یا پھر مجھے گولی مار دے۔ میرا مر جانا ہی اچھا ہے۔"

"میں نہیں...... تجھے وہ ماریں گے، جن کے لئے اب تُو بے کار گھوڑا ہے۔ میں تم پر گولی بھی ضائع نہیں کروں گا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔" فہد نے اپنا پاؤں اس پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ماکھے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو ماسٹر دین محمد کی آواز آئی۔

"اس سے پوچھا نہیں کہ یہ کس لئے رات کے اندھیرے میں یہاں آیا ہے؟"

"یہ مجھے مارنے آیا تھا استاد جی، پوچھ لیں اس سے۔" فہد نے اونچی آواز میں بتایا تو ماکھا پھر سے چونک گیا۔ پھر ہکلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں...... ہاں......"

"جاؤ یہاں سے، پھر پلٹ کر بھی نہ دیکھنا۔ بتا دینا انہیں میں ابھی جاگ رہا ہوں۔" فہد نے کہا تو ماکھا اٹھا اور لنگڑاتا ہوا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ فہد نے پلٹ کر ماسٹر دین محمد سے کہا۔

"آپ آرام کریں استاد جی، صبح بات کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔ سلمیٰ اور ماسٹر دین محمد حیرت زدہ سے واپس پلٹ گئے۔ فہد پھر سے

اپنے بستر پر آ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔
فہد منہ ہاتھ دھو کر صحن میں دھری کرسی پر آن بیٹھا۔
جس کے پاس ہی چارپائی اور ایک کرسی خالی پڑی تھی۔
درمیان میں میز تھی۔ سلمٰی نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور اس کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ فہد نے کپ اٹھایا تو سلمٰی نے کہا۔
"رات آپ نے ماکھے کو یہ کیوں نہیں کہنے دیا کہ وہ مجھے اغواء کرنے آیا تھا؟"
"اس لئے سلمٰی! کہ استاد جی پہلے ہی بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ بات انہیں مزید خوف زدہ کر دے۔" فہد نے آہستگی سے کہا۔
"کیا وہ اس پر خوف زدہ نہیں ہو سکتے کہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو، کسی کو جان سے ختم کر دینا، کیا زیادہ بھیانک نہیں ہے؟" سلمٰی نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا
"سلمٰی تم کیوں نہیں سمجھتی ہو۔ عزت کا معاملہ مر جانے سے بھی زیادہ مار دیتا ہے۔ تم نہیں جانتی ہو کہ وہ اپنی ذات پر ہر طرح کا ظلم سہہ کر صبر کرتے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیوں کیا۔ صرف اسی لئے......" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"میں جانتی ہوں فہد! لیکن اگر آپ کو ہماری وجہ سے کچھ ہو گیا۔ تو پھر ہم کیا کریں گے۔ یہ خود غرضی نہیں ہے بلکہ احسان کا ایسا بوجھ ہو گا۔ جو نہ ہمیں جینے دے گا اور نہ ہی ہمیں مرنے دے گا۔" سلمٰی نے ایک دم جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو فہد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
"تم ایسا کچھ بھی نہ سوچو، میں اگر یہاں پر ہوں تو یہ میرا اپنا مقدر ہے۔ جس کے لئے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ چکا ہوں تم پر یا استاد جی پر احسان نہیں بلکہ میں تو اس احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہا ہوں جو استاد جی نے مجھ پر کیا۔"
"اس بار تو ان کا وار خالی چلا گیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کیا آئندہ وہ ایسی اوچھی حرکت نہیں کریں گے۔ وہ ہمیں یونہی معاف کر دیں گے؟" سلمٰی کے لہجے سے خوف نہیں جا رہا تھا۔ اس پر فہد نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔
"وہ آئندہ بھی ایسی ہی اوچھی حرکت کریں گے۔ انہوں نے ہمیں معاف کیا کرنا ہے۔ ان کا بس چلے تو ہمیں اس دنیا سے ہی نکال دیں لیکن تم بتاؤ، کیا ہم مر جائیں؟"
"میں آپ سے وعدہ کر چکی ہوں فہد۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں۔ چاہے میری جان چلی جائے۔" وہ عزم سے بولی تو فہد نے مضبوط لہجے میں سمجھایا۔
"تو پھر یہ بات جان لو سلمٰی، ہم ایک جنگل میں رہ رہے ہیں۔ اور جنگل کا قانون صرف اور صرف طاقت ہوتا ہے۔ بچتا وہی ہے جسے اپنی حفاظت کرنا آتا ہو۔ جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے وہی پستے ہیں۔ انہی پر ظلم ہوتا ہے۔ انہی کا خون بہایا جاتا ہے۔ خود کو مضبوط کرو سلمٰی۔"
"میں واقعی خود کو کمزور سمجھتی رہی ہوں لیکن جب سے آپ آئے ہیں۔ میں نے خود کو بہت مضبوط کر لیا ہے۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔" اس نے فہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سچائی بیان کر دی۔
"اپنوں کو آزمایا نہیں کرتے۔ میں تو گہری اندھیری رات سے سورج نکالنے آیا ہوں۔ جس نے میرا ساتھ دینا ہے، وہ آ جائے۔۔۔ اور بس۔" فہد نے مسکراتے کہا اور سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھا۔ سلمٰی نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، جذباتی انداز میں کچھ کہنے کے لئے لب وا کئے، مگر کچھ نہ بولی، لبوں پہ آئے لفظوں کو اپنے اندر ہی محفوظ کر لیا۔ شاید اس نے لفظوں میں اظہار کرنا مناسب خیال نہ کیا ہو۔ پھر بولی۔
"آپ کے لئے ناشتہ لاؤں۔ ابا جی تو نہ جانے کہاں بیٹھ گئے ہوں گے؟"
"نہیں، وہ آئیں گے تو کر لوں گا۔ تم چائے ایک

کب جائے اور لے آؤ۔" فہد نے سوچتے ہوئے کہا تو سکنی مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔

ناشتہ کرنے کے بعد فہد اپنے گھر جانے کی بجائے سراج کے گھر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے امین کو اپنے ساتھ لیا اور نور پور کی جانب چل پڑا۔ اس نے امین سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ تھانے میں ایف آئی آر ضرور درج ہو گی۔

وہ نور پور تھانے جا پہنچے۔ انسپکٹر فون پر بات کر رہا تھا۔ فہد اور امین اس کے پاس جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر نے ایک بار ان کی طرف دیکھا پھر جان بوجھ کر ان کی طرف توجہ نہیں دی اور بات کرتا رہا۔

"سنا پھر، تیرے لالے کا کیا حال ہے، سنا ہے کافی مال بنا رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دوسری طرف سے چند لمحے سنتا رہا، پھر فہد کی طرف دیکھ کر بولا: "ہاں کچھ لوگ بڑے ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ انہیں الف کی طرح سیدھا کرنا ہی تو ہمارا کام ہے۔"

فہد اس کی طرف غصے سے دیکھا اور ریسور چھین کر کریڈل پر رکھ دیا۔ اس حرکت پر انسپکٹر نے بھنا کر دیکھا۔ فہد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کچھ لوگ باتوں سے نہیں مانتے، انہیں منانا پڑتا ہے۔"

"لگتا ہے تیرا دماغ ٹھیک کرنا ہی پڑے گا۔" انسپکٹر نے سرد سے لہجے میں کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے انسپکٹر کہ میرا دماغ ٹھیک ہے اور دوسری بات یہ کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ میرے دماغ کے بارے سوچ سکو۔ خیر! امین کی ایف آئی آر درج کرو۔" فہد نے سکون سے کہا۔

"کیسی ایف آئی آر؟" وہ انجان بنتے ہوئے بولا

"وہی جس بے جا کی، جو یہ لکھوانے آیا تھا۔ پھر سن لو، چوہدری کبیر نے اسے اپنے ڈیرے پر رکھا، تشدد کیا اور پھر تم نے اسے حوالات میں رکھا۔" فہد نے اسے جتایا۔ تو انسپکٹر قہقہہ لگا کر بولا۔

"بہت معصوم ہو تم یار۔ میں اپنے خلاف ہی ایف آئی آر لکھوں گا۔"

"اب نہیں لکھو گے تو چند دن بعد لکھو گے۔ وہ بھی اپنے ہاتھوں سے۔ وہ قتل جو کبیر نے کیا اور جسے تم چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ اندھا قتل بن کر داخل دفتر نہیں ہو گا۔ یہ سن لو انسپکٹر۔" فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اتنا قانون نہ جھاڑ، وہ کیس عدالت نے ختم کر دیا ہے۔" انسپکٹر نے حقارت سے کہا

"وہ کیس ری اوپن بھی تو ہو سکتا ہے۔" فہد نے اطمینان سے کہا تو انسپکٹر چونک گیا۔ جبکہ وہ کہتا چلا گیا: "خیر! وہ تو ری اوپن ہو گا۔ تم حبس بے جا کی ایف آئی آر ابھی درج کرو، چوہدری کبیر کے خلاف۔"

انسپکٹر نے بھی سکون سے سنا اور پھر لاپروائی سے بولا "ٹھیک ہے اپنی درخواست دے دو، میں اس پر کارروائی کرتا ہوں اور اگر اس میں تشدد بھی لکھوانا ہے تو اس کا میڈیکل ہو گا، یہ تو پتہ ہو گا تمہیں۔"

"میں تمہارے حیلے اور بہانے جانتا ہوں کہ یہ تم کیوں کر رہے ہو۔ میرے کہنے پر ایف آئی آر لکھو گے تو اچھا ہے ورنہ یہ تو لکھنا تو پڑے گی۔ یہ تو پتہ ہو گا تمہیں۔" فہد نے طنزیہ لہجے میں کہا

"ٹھیک ہے، لکھتا ہوں، خیر پہلے میں تفتیش کروں گا کہ یہ تم سے رقم لے کر چوہدری پر الزام تو نہیں لگا رہا۔" انسپکٹر ہنستے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو، ہاں یہ بتا دو عدالت کا حکم ماننا ہے، یا اپنے کسی آفیسر کا۔" یہ کہہ کر فہد اٹھنے لگا تو انسپکٹر ایک دم سے ہنس دیا پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"چل لکھوا، میں بھی دیکھتا ہوں کہ تو کیا تیر مار لے گا۔"

جس پر فہد نے امین کو اشارہ کیا تو وہ اپنا بیان لکھوانے لگا۔

☆......☆......☆

چوہدری کبیر کی گاڑی ڈیرے پر آ کر رک گئی۔ وہ تیزی سے گاڑی میں سے نکل کر دالان کی جانب بڑھا۔ ملازمین آگے بڑھ کر اسے سلام کرتے چلے گئے۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا۔ "سلام چوہدری صاحب۔"

اس پر چوہدری کبیر نے دھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"اوئے، یہ ماکھا کدھر ہے؟"

"ادھر ہی ہے چوہدری صاحب۔ آپ تشریف رکھیں میں ابھی لاتا ہوں اسے......" اس نے جلدی سے کہا۔ "جا جلدی کر......اس لے کر آ میرے سامنے۔" کبیر نے غصے میں کہا تو ملازم پلٹتے ہوئے بولا۔ "جی ......میں ابھی لایا۔"

ملازم چلا گیا اور چوہدری کبیر دالان میں مضطرب سا ٹہلنے لگا۔ پھر اس وقت رک کر دیکھا جب ماکھا اسی ملازم کے سہارے اس کے سامنے آ گیا تو اس نے پوچھا

"اوئے ماکھے، ساری رات گزر گئی تمہارا انتظار کرتے ہوئے۔ تجھ سے کام تو کیا ہونا تھا۔ خود گولی کھا کر ادھر بیٹھے ہو۔"

"میں گیا تو تھا۔ لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ فہد پہلے ہی میرے انتظار میں ہے۔ عین وقت پر اس نے......" اس نے کہنا چاہا تو چوہدری کبیر نے غصے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

"تو پھر تم نے اسے گولی کیوں نہیں ماردی۔ خود گولی کھا کر یہاں کیوں آئے ہو۔ دل کرتا ہے اب تجھے گولی ماردوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پاس کھڑے ملازم سے گن پکڑلی۔ انہی لمحوں میں ماکھے کو فہد کی بات یاد آ گئی۔ ماکھے نے خوف زدہ اور حیرت زدہ سے انداز میں کہا

"آپ بے شک گولی ماردیں، مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ وہاں پر ہے۔ ورنہ میں اسی حساب سے جاتا۔"

تبھی چوہدری کبیر غصے میں پاگل ہو کر اور گن کا بولٹ چڑھاتے ہوئے دھاڑا۔

"ماکھے۔ تُو مان لے کہ تو بے کار ہو گیا ہے۔ تو اب کچھ نہیں کرسکتا۔"

"ایک موقع اور دے دو چوہدری جی۔ پھر چاہے گولی ماردینا۔" ماکھے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ماکھے! تو ہمارا پرانا وفادار ملازم ہے۔ اسی لیے تجھے معاف کیا، جا، تجھے ایک موقع دیتا ہوں۔ اب فہد کو ختم کرنا ہے۔ دفع ہو جا، ورنہ میں پہلے تیرا ہی کام نہ کر دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے کبیر نے گن ملازم کی طرف اچھال دی۔ جسے ملازم نے دبوچ لیا۔ پھر آگے بڑھ کر کار کی جانب چلا گیا۔ ماکھے نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ چوہدری کبیر کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

حبیب الرحمٰن ڈرائنگ روم میں بیٹھا فون سن رہا تھا کہ مائرہ چائے کا ٹرے اپنے ہاتھوں میں لے کر آ گئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھا اور ایک کپ اپنے پاپا کو دے کر اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ حبیب الرحمٰن فون بند کر کے اس کی جانب متوجہ ہوا تو لاڈ سے بولی۔

"پاپا! آج صبح بڑی خوشگوار ہے۔ بڑے دنوں بعد آپ کے ساتھ یوں چائے پینے کا موقع ملا ہے۔"

حبیب الرحمٰن نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج مجھے آف ہے نا، ویسے وہ تمہاری رپورٹ کی بہت تعریف کی جارہی ہے۔ مجھے بہت فون ملے ہیں۔ اب بھی یہی بات ہو رہی تھی۔"

"بالکل پاپا، مجھے بھی بہت فون آئے ہیں۔ اصل میں پاپا لوگ تنگ آچکے ہیں ایسے سیاست دانوں سے، وہ اس ماحول سے نکلنا چاہتے ہیں، تبدیلی چاہتے ہیں۔" مائرہ نے کہا تو اس کے پاپا بولے۔

"مائرہ! سیاست پر روایتی جاگیرداروں اور صنعت کاروں کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ حکمرانی سے لے کر معیشت تک یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ اور وہ جو حقیقی عوام ہیں۔ وہ جذباتی نعروں، تصوراتی سبز باغوں اور فلاحی مملکت کے خواب دیکھتے دیکھتے اپنی دوسری نسل بوڑھی کر چکی ہے۔"

"پاپا! آپ کا تعلق تو بزنس کمیونٹی سے ہے۔ آپ لائن کے کس طرف ہیں عوام میں سے ہیں یا تاجروں کے ساتھ؟" مائرہ نے فوراً سوال کر دیا۔

"بات یہ نہیں کہ میں کس طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ بات یہ کہ میرے دل میں اپنی وطن کے لیے کتنا مثبت جذبہ ہے۔ میں اپنے ملک کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں اگر بزنس کر رہا ہوں تو اس ملک کی عوام ہی میں سے ہوں، جبکہ ہوا یہ ہے کہ روایتی سیاست نے ہمارے وطن کو کس جگہ لا کھڑا کیا ہے۔ کیا ترقی کی ہے ہم نے؟ بلکہ خود کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔" پاپا نے دکھ سے کہا۔

"ہم اسے یوں بھی دیکھ سکتے ہیں پاپا کہ مادیت پرستی میں دولت کمانے کی دھن نے کرپشن کی راہ دکھائی اور ہم فقط اپنے لیے سوچتے ہیں۔ ملک کا نہیں سوچا۔" وہ بولی۔

"بالکل! اب دیکھو۔ ملک کی مجموعی ترقی کس طبقے کے کھاتے میں جاتی ہے وہی نا، جو حکمران رہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس وقت ہمارا وطن ترقی یافتہ ہوتا یا کم از کم ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم وہیں کھڑے ہیں۔ فلاحی مملکت کے خواب کو ہم نے چھوا بھی نہیں۔ یہ کتنی تکلیف دہ بات ہے۔" پاپا نے اسی دکھ میں لپٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں یہ بات سمجھ سکتی ہوں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ عوام آج بھی بنیادی سہولیات کو ترس رہے ہیں۔" مائرہ نے اپنے باپ کی تائید کی۔

"عوام پس رہے ہیں۔ جب تک ایوانوں میں ان کی رسائی نہیں ہوگی۔ ان کے مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ کون کرے گا حل؟" اس نے کہا مائرہ تیزی سے بولی۔

"سوری پاپا۔ آپ بھی تو محض طاقت کے حصول کی جنگ لڑ رہے ہیں، سیاست کا کھیل۔"

"میں مانتا ہوں روایتی سیاست محض طاقت کا کھیل ہے۔ لیکن جب ایک طبقہ ہی تمام تر وسائل پر قابض ہو جاتا ہے تو پھر ایسی جنگ کا اخلاقی جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتی اس ملک کا اصل مسئلہ کیا ہے؟" حبیب الرحمٰن نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"غربت، جہالت، بے روزگاری......" اس نے کہا۔

"نہیں! حق دار کو اس کا حق نہ ملنا ہے۔ کیا عوام کا حق نہیں کہ انہیں، تعلیم، روزگار، صحت، ان سب کی سہولیات ملیں، انصاف ملے۔ خیر! یہ ایک لمبی بحث ہے ایسے میں ہم جیسے لوگوں کو اب میدان میں آنا چاہیے۔ ورنہ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہماری داستاں نہ ہوگی داستانوں میں۔" حبیب الرحمٰن نے اپنا موقف بتایا۔

"حق تو عوام کو بھی حاصل ہے۔ ایک جمہوری حکومت عوام ہی سے تو بنتی ہے۔" مائرہ نے کہا۔

"یہ فقط نظریہ ہے، حقیقت میں اس ملک کی اکثریت غریب عوام ہے اور ایوانوں میں کتنے فیصد ان کے نمائندے ہوتے ہیں؟" پاپا نے کہا تو مائرہ بولی۔

"جی پاپا! جس طبقے کو شعور آ جاتا ہے۔ وہی اپنی

بقاء کی جدوجہد کرتا ہے۔ اگر عوام کو شعور آ جائے اور وہ اپنے جیسا نمائندہ چن لیں تبھی یہ ممکن ہے۔"

"تو بس۔ ! بات تمہاری سمجھ میں آ گئی۔ اور جو میں نے کہا تھا کہ تجھے دیکھ کر مجھے سیاست کا خیال آیا تو یہ غلط نہیں۔ آپ میڈیا کے لوگ بہت بڑا کام کر رہے ہو، شعور دے رہے ہو، لیکن نرا شعور کیا کرے گا، جب اس شعور کو درست سمت ملے۔" پاپا نے اسے سمجھایا۔

"تھینک یو پاپا۔ مجھے اب بہت زیادہ حوصلہ مل گیا۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"اب میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میڈیا دانشور لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ان پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عوام کو درست شعور دیں، ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہ بتائیں۔ ایک قوم بن جانے کی جدوجہد کریں۔ ایک جمہوری ملک میں اصل طاقت عوام ہی ہیں۔ یہ شعور اجاگر کریں کہ وہ اپنی طاقت کو کیسے استعمال کریں کہ یہ ملک ایک فلاحی مملکت بن جائے۔ فلاحی مملکت ہی ہمارا خواب ہے۔" پاپا نے یوں کہا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔

"میں سمجھ گئی پاپا کہ آپ مجھ سے کیا چاہ رہے ہیں۔ میں پوری کوشش کروں گی۔" مائرہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"گڈ! آپ جہاں پر بھی ہو۔ اپنے دائرہ کار میں کوشش کرو۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔" یہ کہتے ہوئے پاپا نے کپ میں سے سپ لیا۔ اس کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ بہت سارا وقت گزر گیا۔ تبھی مائرہ آفس جانے کے لئے اٹھ گئی۔

چینل جاتے ہی باس کا بلاوا آ گیا۔ اس لئے کچھ کہے بغیر وہ باس کے آفس چلی گئی۔ وہ جب سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تو باس نے کہا۔ "کل آپ کی رپورٹ آن ایئر ہو جانے کے بعد مجھے بہت فون ملے۔ بہت سراہا گیا ہے آپ کی رپورٹ کو۔ لوگوں نے بہت تعریف کی ہے آپ کی۔ مائرہ! بہت خوشی ہوئی۔ آپ اسی محنت اور لگن سے کام کریں۔"

"تھینکس سر، یہ میرے لیے اعزاز ہے۔ سر! میں سمجھتی ہوں کہ یہ آپ کی وجہ سے ہوا۔ میں نے آپ سے بہت سیکھا ہے۔" مائرہ دھیمے سے کہا۔

"وہ ٹھیک ہے، لیکن یہ تمہاری محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔ اور بہت سارے لوگ بھی تو ہیں۔ وہ تمہاری طرح کیوں نہیں سیکھے!

اصل میں تم اپنے کام کو پوری دیانت داری سے کرتی ہو۔ اسی لیے تمہارے کام میں جان ہوتی ہے۔ اور تم نے ان لوگوں کو بے نقاب کیا ہے، جنہیں ہم بہت طاقتور خیال کرتے ہیں۔" باس نے اعتراف کیا۔

"سر! میں سمجھتی ہوں کہ آپ جو کر رہے ہیں یا اسے پوری توجہ سے کریں یا پھر نہ کریں۔" اس نے کہا۔

"ایسا ہی ہونا چاہیے اور ہاں۔ ! اب اسی کامیابی کو اپنی منزل نہ سمجھ لینا۔ ابھی تم نے اس سے بہت آگے جانا ہے۔" باس نے سمجھاتے ہوئے کہا، پھر ایک لمحے کے لئے رُک کر بولا۔ "آپ کو بتا دوں کہ اب رضوی صاحب آپ کے ہیڈ نہیں ہوں گے، انہیں نیوز شعبے کا ہیڈ بنا دیا گیا ہے، آج سے آپ اپنے شعبے کی ہیڈ ہیں۔ ابھی آپ کو لیٹر مل جاتا ہے۔ مبارک ہو آپ کو۔"

اس اچانک خوشی پر مائرہ ایک دم سے چونک گئی، تاہم خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "تھینک یو سر! میری محنت اور وقت دونوں، میری کامیابی، میرے پاس لے آئیں گے۔ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میں آپ کی توقعات پر پورا اتروں گی۔"

"بس یہی جذبہ رہنا چاہیے۔ کامیابی نہیں، کامیابیاں تمہیں ملتی رہیں گی۔ بہرحال جو ذمہ داری بھی لو اسے بھرپور انداز میں نبھاؤ۔ او کے۔ وش یو گڈ لک۔"

باس نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
"تھینک یو سر...... آپ مجھے بہت حوصلہ دیتے ہیں۔"
اس پر باس مسکرا دیا تو وہ باہر نکلتی چلی گئی۔
مائرہ اپنے آفس میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر اپنا سیل فون نکال کر جعفر کے نمبر پش کر دیے۔ اس کے چہرے پر خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف جعفر اپنے آفس میں ایک فائل دیکھ رہا تھا۔ اس کا سیل فون بجا تو اس نے اسکرین پر دیکھا۔ تب اس کے چہرے پر شگفتہ بھری مسکراہٹ آ گئی۔ جعفر نے فون پک کر لیا۔
"ہیلو جعفر...... کیا ہو رہا ہے؟"
جعفر نے کام چھوڑ کر کرسی سے ٹیک لگائی اور خوشگوار انداز میں بولا۔ "کہنے کو تو کہہ سکتا ہوں کہ میں فٹ بال کھیل رہا ہوں۔"
اس پر مائرہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "تم بھی نا......"
"مائرہ، لگتا ہے آج تم بہت خوش ہو۔" اس نے خوشی سے کہا تو مائرہ نے پوچھا۔
"تمہیں کیسے پتہ کہ میں بہت خوش ہوں آج؟"
"بہت عرصے بعد تمہارے لہجے میں کھنکناہٹ سنی ہے۔ بہت اچھا لگا مجھے۔" جعفر نے مخمور لہجے میں کہا۔
"ہاں، خوش تو ہوں۔ ایک بہت ہی اچھی خبر ہے اور سب سے پہلے تمہیں سنانا چاہتی ہوں۔" اس نے جعفر کے لہجے پر غور کیے بنا کہا۔
"بولو۔" وہ آہستگی سے بولا۔
"میرے کام کو بہت سراہا گیا ہے اور میری ترقی ہو گئی ہے۔" وہ پُرجوش انداز میں تیزی سے بولی۔
"بہت مبارک ہو، بہت ہی اچھی بات ہے۔ تم اس کی حقدار ہو اور مجھے یقین ہے۔ بہت ساری کامیابیاں تمہارے قدم چومیں گی۔" جعفر نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔"
مجھے یہ بتاؤ کہاں ہو تم؟"
"میں گھر پہ ہوں۔" اس نے بتایا۔
"اچھا پھر میں آ رہی ہوں۔ ہم اس اچھی خبر کو مل کر سیلی بریٹ کریں گے۔ اس میں تم بھی پوری طرح شریک ہو۔" مائرہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔
"میں منتظر ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں آپ جیسی عظیم صحافی......" اس نے مصنوعی عاجزی سے کہا تو مائرہ اس کی بات ٹوکتے ہوئے بولی۔ "اوکے...... اوکے مہاجوی سے مت اترو۔"
یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور پھر اس کی بات کو سوچتے ہوئے ایک دم سے خوش ہو گئی۔ پھر اس سے زیادہ دیر بیٹھ کر کام نہیں ہوا۔ وہ اٹھی اور جعفر کے پاس جانے کے لیے نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جعفر کے گھر پہنچ گئی۔ وہ اکیلا ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ مائرہ کے ہاتھوں میں دو بڑے بڑے بیگ تھے، جن میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ جتنی دیر میں اس نے وہ سارا سامان پھیلایا، جعفر چائے بنا کر لے آیا۔ اس وقت جعفر اور مائرہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر کھاتے ہوئے، باتیں کر رہے تھے۔ تبھی مائرہ نے کہا۔ "کتنی سادہ سی سیلی بریشن ہے میری کامیابی کی، لیکن مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔"
"ہوں! اصل میں انسان انہی میں خوش رہتا ہے، جہاں اسے سراہا جائے، جن کے ساتھ وہ اپنائیت محسوس کرے۔ یہ حالات ہی ہیں جن سے انسان خود اپنے لیے خوشی کشید کرتا ہے۔" جعفر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
"جعفر! یہ کیسے حالات ہیں۔ میں فہد کے لیے اپنے دل میں اتنی محبت رکھتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ تو پھر میری محبت اپنا آپ کیوں نہیں منوا پا رہی ہے۔ کیا میری محبت میں کوئی

قوت، کوئی کشش نہیں ہے؟" اس نے انتہائی دکھ سے پوچھا۔

"اسی بات کو دوسرے پہلو سے سوچو۔ اگر کسی دوسرے کے دل میں بھی اتنی ہی بے لوث اور خالص محبت ہو تمہارے لئے تو؟" جواب دینے کی بجائے اس نے سوال کر دیا۔ مائرہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں نے ایک بات کی ہے تم سے۔ ممکن ہے فہد کے دل میں ایسی ہی محبت کسی دوسرے کے لئے ہو یا میرے دل میں تمہارے لئے ہو۔ ایسے میں ہم کس کو کیا الزام دے سکیں گے۔" جعفر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو مائرہ فرار کے طور پر جھنجھلاتے ہوئے بولی "مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ مجھے۔ مجھے نہیں معلوم تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔"

"میں تم سے فقط اتنا کہنا چاہتا ہوں۔ کسی پر بھی شک مت کرو۔ نہ اپنی محبت پر اور نہ کسی کے خلوص پر۔ یہ دل کے معاملات ہیں۔ جن پر اختیار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اپنا اختیار بھی نہیں رہتا۔" جعفر نے وضاحت کی۔

"دل ہی تو ہے جو اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ ایسے میں زندگی ایک بوجھ لگنے لگتی ہے نا۔" اس نے تائید چاہی۔

"مائرہ! زندگی کو بوجھ بھی ہم خود بنا لیتے ہیں۔ جب ہم اپنی ذات پر شک کرتے ہیں۔ تم بس خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔ زندگی کب اور کہاں سے محبت دیتی ہے۔ اسے مت سوچو! نچھاور ہونے والی محبت کا احساس کرو۔" جعفر نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"ہاں! زندگی سے محبت تو خود حاصل کرنا پڑتی ہے۔" یہ کہہ کر محبت پاش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اچھا چلو، کھاؤ پیئو۔ اور کچھ نہ سوچو۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو اس نے قہقہہ لگا دیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "مجبوری ہے......"

پھر ایک دم سے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

☆......☆......☆

چوہدری جلال حویلی کے ڈرائینگ روم میں تنہا بیٹھا فون پر بات کر رہا تھا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے جناب۔ اس اجلاس پر آپ کا کام یقیناً ہو جائے گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔ لیکن آپ بھی تو خیال رکھیں نا؟" انہی باتوں کے دوران منشی اور انسپکٹر آ گئے۔ چوہدری کو فون پر بات کرتے دیکھ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ وہ بات کرتا چلا جا رہا تھا۔ "ہاں! بالکل ٹھیک ہے۔ میں کر دوں گا سفارش۔" چوہدری نے ان کی طرف دیکھ کر انسپکٹر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گیا۔ "ہاں بس! اجلاس سے دو دن پہلے مجھے مل لیں۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر چوہدری نے ریسور رکھ دیا پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد منشی فضل دین سے پوچھا

"ہاں بھئی انسپکٹر...... کیا حال ہے تمہارا، کیسے آنا ہوا؟"

"میرا حال تو ٹھیک ہے چوہدری صاحب، مگر لگتا نہیں ہے کہ اب حالات ٹھیک رہیں گے، بہت مشکل سا معاملہ بن گیا ہے چوہدری جی۔" انسپکٹر نے مایوسانہ لہجے میں کہا تو چوہدری نے پوچھا۔

"ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو تُو اتنا مایوس لگ رہا ہے۔"

"جس جن کو بڑی مشکل سے بوتل بند کیا تھا نا، وہ

جن دوبارہ بوتل سے باہر آگیا ہے۔" وہ اسی لہجے میں بولا

"اوئے پہیلیاں نہ ڈال انسپکٹر، سیدھی بات کر۔" چوہدری نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"فہد آیا تھا آج تھانے، امین ارائیں کو لے کر، جس بے جا کی ایف آئی آر لکھوانے۔ چوہدری کبیر کے خلاف۔" انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا تو چوہدری جلال نے حیرت اور استعجاب بھرے انداز میں کہا۔ "تو؟"

"اوپر سے ڈی ایس پی صاحب کا فون بھی کروا دیا اس نے، درخواست دی تھی اس نے اوپر۔ مجھے وہ ایف آئی آر درج کرنا پڑی۔" انسپکٹر نے یوں کہا جیسے اسے بہت ندامت ہو رہی ہو۔ چوہدری جلال نے چونکتے ہوئے انتہائی غصے میں کہا

"اور تُو نے ایف آئی آر لکھ دی؟ مجھ سے پوچھے بغیر۔ کیا میں تیرے دماغ میں گولی اتار کر ابھی تیری اوپر جانے کی ایف آئی آر نہ لکھ دوں؟" چوہدری جلال نے غصے اور حیرت سے کہا تو انسپکٹر خاموش رہا تو اس نے پھر پوچھا۔ اوئے بول اوئے بک، بکتا کیوں نہیں ہے؟"

تبھی انسپکٹر نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"جی، میں اور کیا کرتا۔ بتایا نا جی کہ اس نے ڈی ایس پی کو فون کر دیا۔ اب مجھے ان کا حکم تو ماننا تھا نا چوہدری صاحب۔ اب اللہ جانے آپ کے ڈی ایس پی صاحب سے کیسے تعلقات ہیں؟"

"اوئے انسپکٹر، اوئے بے وقوف تجھے میرے تعلقات کی کوئی عقل سمجھ نہیں ہے۔ تیری یہ جرأت، میرے اس سے تعلقات جیسے بھی ہوں، پر تُو اپنے اوپر غور کر۔ تُو اپنا بھی بوجھ برداشت نہیں کر سکا اور فوراً ایف آئی آر درج کر دی۔ لگتا ہے اب تیرا دانہ پانی یہاں سے ختم ہو گیا ہے۔ تُو اس قابل ہی نہیں رہا۔"

"او نہ چوہدری صاحب۔ میں تو آپ کا خادم ہوں نوکر ہوں آپ کا۔ کیا کچھ نہیں کیا میں نے آپ کے لیے۔ اب یہ فہد آپ کے بھی قابو نہیں آ رہا تو میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔" انسپکٹر نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر چوہدری جلال کا غصہ اور زیادہ غضب ناک ہو گیا۔

"تُو اکیلا، پہلے کیا کرتا تھا اس علاقے میں۔ کس کے بل بوتے پر دندناتا پھرتا تھا۔ کوٹھیاں، بنک بیلنس کیسے بنا لیا تو نے ...... یہ سب کچھ اب تیرے کسی کام کا نہیں۔ تیرے لیے بس ایک اشتہاری بندہ ہی کافی ہے۔"

"خدا کے لیے ایک موقع دیں چوہدری صاحب، ابھی تو ایف آئی آر ہی کی ہے نا۔" انسپکٹر نے منت بھرے لہجے میں کہا تو چوہدری جلال نے ایک لمحہ کو سوچتے ہوئے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، جا، میں دیکھتا ہوں۔"

"بہت شکریہ چوہدری صاحب۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھا اور اسی تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ تبھی چوہدری جلال نے منشی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "منشی، یہ فہد کچھ زیادہ ہی پَر نکالنے لگا ہے۔"

"تو پھر پَر کاٹ دیں نا جی اس کے۔" منشی نے یوں کہا جیسے اس نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

"تُو ایسا کر، اسے کسی طرح اپنی زمین لینے پر اُکسا۔ بندہ لگا اس کے پیچھے...... جو اُسے غیرت دلائے کہ وہ ہم سے اپنی زمین لے لے۔" چوہدری نے سوچتے ہوئے کہا تو منشی سمجھتے ہوئے بولا۔

"سمجھ گیا چوہدری صاحب، سمجھ گیا۔ میں ابھی کسی کے ذمے لگا دیتا ہوں۔" منشی فضل دین نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ چند لمحے ایسے ہی گزرا رہا تو چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں کھڑے ہو؟"

"ایک اطلاع ہے چوہدری صاحب!" اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو چوہدری جلال لاپروائی سے بولا۔

"کیسی اطلاع۔ا کوئی خیر کی ہے یا......"

"خیر کی نہیں لگتی چوہدری صاحب۔ اوہ، عمر حیات ہے نا۔ جس کا اپنے بھائیوں کے ساتھ جھگڑا تھا زمین کے معاملے میں......" منشی نے بتایا

"ہاں ......کیا ہوا اُسے؟" چوہدری جلال نے پوچھا۔ "عمر حیات نے اپنا گھر اور زمین بیچ دی ہے۔" منشی نے بتایا تو چوہدری جلال نے پوچھا

"کسے بیچ دی۔ اوہ تو ہم خریدنا چاہ رہے تھے۔ کس نے خرید لی۔"

"فہد نے......سودا طے ہو گیا ہے۔ کچھ رقم دے دی ہے اور باقی کاغذات مکمل کر ہونے پر ادا ہو جائے گی۔" منشی نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا جیسے اسے خود یہ اچھا نہ لگا ہو۔

"یار یہ فہد کر کیا رہا ہے۔ جہاں ہمارا مفاد ہوتا ہے۔ یہ وہیں پر آ کر وار کرتا ہے۔ خیر! میں دیکھتا ہوں وہ کس طرح زمین لیتا ہے۔ عمر حیات کے بھائیوں کو پیغام دے دو کہ وہ مجھے آ کر ملیں۔" چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"جی، میں ابھی بندہ بھجوا دیتا ہوں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"اور سنو! اس معاملے پر گہری نگاہ رکھنی ہے۔ فہد کہیں زمین کا قبضہ نہ لے لے۔" چوہدری جلال نے کہا

"جی میں آپ کو پوری طرح باخبر رکھوں گا۔" منشی نے ادب سے کہا تو چوہدری جلال سوچتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولا

"اب اس فہد کے بارے میں پتہ کرنا پڑے گا۔ آخر اتنے دھڑلے سے ایسا سب کچھ کیسے کر رہا ہے۔ جا منشی تو جا۔"

"جی چوہدری، جاتا ہوں۔"

جیسے ہی اس نے کہا تو چوہدری جلال نے اُسے جانے کا اشارہ کیا اور فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ منشی باہر کی جانب چلا گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا اظہار تھا۔ چوہدری جلال نے فون اٹھایا، نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ "ہاں جنید کیسے ہو؟......اچھا تمہارے ذمے ایک کام لگا رہا ہوں۔ وہ فوراً کر کے مجھے اطلاع دو......ہاں ہاں بتا رہا ہوں نا، فہد نامی لڑکا ہے ادھر۔ ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے...... زمین خریدی ہے اس نے یہاں...... وہ تمہارے آفس تو آئے گا نا......بس اس سے اگلی پچھلی معلومات لینی ہے، کوئی سرا پتہ چل گیا تو اس کے بارے سب معلوم ہو جائے گا...... ہاں ہاں فوراً، میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر چوہدری نے فون کریڈل پر رکھ دیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے زیادہ موقع نہیں دینا ہوگا۔

☆......☆......☆

دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چوپال میں فہد، امین، چھاکا اور چند دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بڑی گرما گرمی میں باتیں چل رہی تھیں۔ تبھی ایک بندے نے تیز لہجے میں کہا۔

"ماکھے نے جو سراج کو دھمکی دی ہے نا۔ یہ چوہدری جلال کی طرف سے نہیں چوہدری کبیر کی طرف سے ہے۔ یہ ماکھا، کے چوہدری کا کارندہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔"

"کارندہ کسی کا بھی ہو۔ دھمکی تو ان لوگوں کی طرف سے ملی ہے نا۔ کیا یہ گاؤں کے لوگوں کو انسان نہیں سمجھتے۔ جس طرح ان چوہدریوں کا جی کرتا ہے۔ کیا یہ سارے لوگ اسی طرح چلیں۔ انسان نہ ہوئے بھیڑ بکریاں ہو گئیں۔" فہد نے کہا تو امین بولا۔

"میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ میں خود ان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اور یہاں میرے جیسے کئی ہوں گے علاقے میں جو اپنے دلوں میں یہی خواہش چھپائے بیٹھے ہیں۔"

"وہ وقت بڑی جلدی آنے والا ہے امین۔ جب یہ ظالم خود منہ چھپاتے پھریں گے۔ انہوں نے صرف کمزوروں پر ظلم کرنا سیکھا ہے۔" فہد نے وہاں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ایک بندہ بولا۔

"یہ تمہاری بھول ہے فہد! اگر کوئی سیدھی طرح ان کی بات نہ مانے تو وہ دوسری طرح اس سے بات منوا لیتے ہیں۔ انہوں نے تمہیں خود ڈھیل دے رکھی ہے۔"

"کیا مطلب؟" فہد نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بندہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"مطلب یہ ہے، تم نے اپنا گھر تو اچانک لے لیا۔ اب وہ انتظار کر رہے ہیں کہ اپنی زمین واپس لو۔ اگر تم میں ہمت تو اب زمین لے کر دکھو۔ تمہیں نہ صرف چوہدریوں کی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ بلکہ یہ بھی جان لو گے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ ہے تم میں ہمت؟" فہد نے چونک کر دیکھا اور پھر تحمل سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ چوہدری کیا چاہتے ہیں۔ مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ زمین بھی یہیں ہے، چوہدری بھی اور میں بھی۔ یہ وقت بتائے گا۔ زمین کیسے لی جاتی ہے۔"

"اوئے میرے بھائی! چوہدری انتہائی بزدل بندہ ہے۔ اگر فہد اس کے راستے کی دیوار بن گیا ہے تو وہ اس دیوار کو گرا کیوں نہیں دیتا۔ زمین تو بعد کا معاملہ ہے۔ اب اگر اس میں ہمت ہے تو دوبارہ اپنے ڈنگر باندھ کر دکھائے۔" امین نے غصے میں کہا تو بندہ بولا۔

"میں نے کہا نا، وہ تم لوگوں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اب اگر اپنی زمین لے گا نا فہد تو اسے لگ پتہ جائے گا۔"

"اصل میں قصور چوہدری کا نہیں کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ قصور لوگوں کا ہے جو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کا ظلم سہے جا رہے ہیں۔ اس تک بات پہنچا دو اب ظلم کے دن تھوڑے ہیں۔" فہد نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بندہ بولا۔

"میں اب بھی کہتا ہوں فہد ان کے سامنے تم کچھ بھی نہیں ہو۔ اپنا آپ بچا کر یہاں سے چلے جاؤ۔ یہی تیرے لیے بہتر ہوگا۔"

"اور تم یہ جان لو۔ اب ان کی یہاں حیثیت کچھ نہیں رہے گی۔ یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔" امین نے جذباتی لہجے میں کہا تو فہد بولا۔ "تلوار کے وار کو لاٹھی پر نہیں روکا جاتا اور نہ ہی گولی کو ہاتھ روک سکتے ہیں۔ جنگ جیتنے کے لئے دشمن کے ہتھیار سے بڑا ہتھیار رکھنا پڑتا ہے۔ اور وہ ہتھیار ہے میرے پاس۔ چوہدری یا اس کے حواری کسی بھول میں نہ رہیں آ تو چلیں۔"

فہد نے کہا اور اٹھ کر گاڑی کی جانب چل دیا۔ امین اس کے ساتھ جا بیٹھا تو گاڑی چل دی۔ چوپال میں خاموشی چھا گئی تھی۔ فہد نے امین کو گھر چھوڑا اور خود سراج کے ڈیرے کی طرف چل دیا۔

وہ سہ پہر ڈھل کر شام کی جانب بڑھ رہی تھی۔ فہد اور سراج آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ چوراہے میں ہونے والی بات سن کر سراج نے بتایا۔

"میں آج ملا تھا چاچے عمر حیات سے۔ منشی پہنچ گیا تھا اس کے پاس، اور اپنی آفر کروا دی۔"

"کیا کہا چاچے عمر حیات کو منشی نے۔ پوری بات معلوم کی؟" فہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو سراج بولا۔ "ہاں کی۔ وہ منشی آیا تھا اسے اکسانے کے لیے۔

بلکہ اسے بے ایمانی پر مجبور کرنے آیا تھا۔ جب منشی اس سے مل کر گیا تو چاچا عمر حیات میرے پاس گھر آ گیا۔ اس نے مجھے ساری بات بتا دی۔ اس نے منشی کو انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اب میں زبان دے چکا ہوں۔ رقم وصول کر لی ہے۔ وہ زمین فہد کو ہی دے گا۔"

"انکار سننے کے بعد، ظاہر ہے چوہدری اطمینان سے تو نہیں بیٹھے گا۔ اب وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرے گا۔" فہد نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اصل میں ان دونوں خاندانوں کے درمیان جھگڑا ابھی تو چوہدریوں نے کروایا ہے۔ تاکہ یہ زمین وہ لے سکیں اور ہاں، ایک بات اور، چاچے عمر حیات کا یہ کہنا ہے کہ وہ تمہاری رقم بھی دبا جانے کا لالچ دے رہا تھا۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے فہد زمین اپنے نام کروا لے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو معاملہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ ختم ہو جائے تو وہ اطمینان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دے۔" سراج نے اسے بتایا تو فہد سوچتے ہوئے بولا۔ "وہ ٹھیک کہتا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر لکھت پڑھت کر کے زمین اپنے نام کراؤ۔ کل ہی عدالت چلتے ہیں۔" سراج نے صلاح دی۔

"کل ضرور عدالت میں چلیں گے، مگر اس قتل کیس کے لیے جس کی گواہی امین دینا چاہتا تھا، اسے ری اوپن کروانا ہے۔ چاچے عمر حیات والی زمین کدھر جا رہی ہے، لے لیں گے۔ پہلے امین سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرنا ہے۔" فہد نے سوچتے ہوئے کہا تو سراج چونکتے ہوئے بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سراج۔ خیر تم شام کو گھر آؤ گے تو اس پر تفصیل سے بات ہو گی۔ ابھی میں چلتا ہوں۔" فہد نے کہا اور اٹھتا چلا گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب قسمت نگر کی فضائیں بدلنے والی ہیں۔

☆......☆......☆

مائرہ اپنے گھر سے آفس کے لیے نکل کر پورچ میں اپنی گاڑی کے پاس آئی تو اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اپنا بیگ گاڑی میں رکھا اور فون کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو......"

دوسری طرف سے کھردری آواز میں کہا گیا۔

"سنو، یہ جو تم اپنی ٹی وی رپورٹ کے لیے آگ سے کھیل رہی ہو نا۔ اس کا انجام بہت برا ہے۔ کم از کم تمہارے لیے...... تم نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ جس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔"

"کون ہو تم اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔" مائرہ نے تیزی سے غصے میں کہا۔

"میں نے کہا نا، صرف میری سنو...... فضول بک بک نہ کرو۔ ورنہ تیری سزا میں زیادہ اضافہ ہو جائے گا، صرف سنو۔ آگ سے کھیلنا بند کرو ورنہ تم اس طرح جل جاؤ گی کہ خود تمہیں پتہ نہیں چلے گا۔ تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا تو مائرہ بولی۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ لیکن اگر تم چاہو تو اسے دھمکی سمجھ سکتی ہو۔ تا بھی میں اگر تم نے اپنی ٹی وی رپورٹ بنالی ہے تو اب اس کو بھول جاؤ۔ اس کی پیروی مت کرو، اسی میں تمہاری زندگی ہے۔"

"میں نہیں ڈرتی۔ میں ایسا ہی کرتی رہوں گی۔ تم جیسے بزدل میرا راستہ روک سکتے ہیں تو روک لیں۔" اس نے بے خوفی سے کہا۔

"میں تمہیں صرف سمجھا رہا ہوں۔ ورنہ تم اب تک ہمیشہ کے لیے گہری اور میٹھی نیند سو چکی ہوتی۔ آزمانا چاہتی ہو تو آزما لو۔ تم ہر وقت ہماری نگاہ میں ہو۔" کسی نے غراتے ہوئے کہا تو مائرہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"اور میں تمہیں خود ڈھونڈ نکالوں گی۔ تم تو سامنے نہیں آؤ گے تو......" مائرہ نے مزید کہنا چاہا مگر اس

کے لفظوں کے دوران ہی آنے والا فون بند ہو گیا۔ اس نے غصے میں فون کی طرف دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ تیزی سے سوچ رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو مائرہ نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سیل سے نمبر پش کر دیئے۔

اس وقت جعفر اپنے آفس میں کھڑا فائل دیکھ رہا تھا۔ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو مائرہ بولی۔ ''سوری جعفر! میں تمہیں آج پھر ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ کیا تم میرے آفس آسکو گے؟''

''آپ بلائیں، ہم نہ آئیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ ویسے خیریت ہی ہے نا۔'' اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''آج ایک نیا پراجیکٹ ہے جو میں تمہارے ساتھ مل کر کرنا چاہتی ہوں، اس کے متعلق ڈسکس کرنا تھا۔ ویسے مجھے آج ایک فون ملا ہے۔ کسی نے مجھے دھمکی دی ہے۔'' مائرہ نے بتایا تو جعفر نے سکون سے پوچھا۔

''کیسا فون؟ کیسی دھمکی؟ اور کب؟''

''ابھی کچھ منٹ پہلے۔'' یہ کہہ کر اس نے تفصیل بتا دی۔

''پریشان نہیں ہونا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ، ڈھونڈ نکالیں گے اسے۔'' جعفر نے اسے تسلی دی۔

''یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ یہ دھمکیاں تو ملتی رہتی ہیں، ان کا کیا ہے۔ بس تم جلدی سے آجاؤ۔'' مائرہ نے کہا۔

''مجھے بہت خوشی ہوئی مائرہ۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کالج لائف والے دن لوٹ آئے ہیں۔'' وہ خوشی سے بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ یہ بالکل ناکام عاشقوں جیسے لہجے میں مجھ سے بات نہ کیا کرو۔'' وہ ایک دم شوخی سے بولی تو جعفر نے شرارت سے۔ ''کیا ہو گیا ہے میرے لہجے کو، ویسے مجھے تمہاری ایک بات سے اختلاف ہے۔''

''وہ کیا؟'' مائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا بندہ محبت میں ناکام بھی ہو سکتا ہے؟ ایسا ہو نہیں سکتا کہ بندے کو محبت بھی ہو اور وہ اس میں ناکام ہو جائے۔'' جعفر نے گہرے انداز میں کہا تو مائرہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

''تم لاکھ اختلاف کرو۔ مگر حقیقت کو جھٹلایا تو نہیں جا سکتا نا۔ دل میں سچی محبت بھی ہو اور وہ رنگ نہ لاسکے۔ یہ ناکامی ہی تو ہے۔''

''یہاں قصور محبت کا نہیں۔ اس وجود کا ہے جس میں یہ محبت موجود ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ محبت کی راہ پر چلنا آسان ہوتا ہے۔ بڑے امتحان ہوتے ہیں اس راہ میں۔'' اس نے پُر یقین لہجے میں کہا تو مائرہ بولی۔

''چل چھوڑ یہ محبت وغیرہ کا فلسفہ۔ زندگی کی حقیقت، محبت سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ بس جلدی سے آجاؤ۔''

''جیسے آپ کا حکم، بندہ تو ہر وقت حاضر ہے۔ آرہا ہوں۔'' جعفر نے خمار آلود لہجے میں کہا تو مائرہ ہنستے ہوئے بولی۔

''یار نہیں آؤ گے ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا اور پوری توجہ سڑک پر لگا دی۔

☆......☆......☆

چوہدری جلال حویلی کے لان میں موجود تھا۔ چوہدری کبیر کی گاڑی آکر پورچ میں رکی۔ وہ اس میں سے وہ نکل کر سیدھا چوہدری جلال کے پاس آ گیا۔ پاس آکر اس نے اپنے باپ کو سلام کیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''بابا، میں

فہد کی بات کرنے آیا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں آپ اسے ڈھیل دیئے چلے جا رہے ہیں۔ چند منٹوں میں اسے ختم کر کے ساری ٹینشن ختم کی جا سکتی اور آپ ......" وہ کہتے ہوئے رک گیا۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھا اور سکون سے بولا۔

"مانا! کہ ریوالور کی گولی سے وہ چند منٹوں میں ختم ہو سکتا ہے، لیکن اس کے بعد جو طوفان بدتمیزی اٹھے گا۔ اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔"

"کیا مطلب بابا! کون ہے اس کے پیچھے رونے والا، ماسٹر دین محمد؟" کبیر نے تیزی سے پوچھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ وہ سانپ ہے۔ جسے زور زبردستی سے نہیں، بلکہ منتروں سے پٹاری میں بند کیا جائے گا۔ کیا آج تک تمہیں ایسا ذہین دشمن ملا ہے؟" چوہدری جلال نے اپنے بیٹے کی جانب دیکھ کر کہا۔

"مان لیا بابا کہ وہ بہت طاقتور ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے علاقے میں آ کر ہمیں ہی للکارے، یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" اس نے بے خوفی سے کہا۔

"ابھی اس نے کیا ہی کیا ہے، صرف اپنا گھر ہی واپس لیا ہے نا۔ اس کے علاوہ اس نے کیا تیر مار لیا؟" چوہدری جلال نے لاپروائی سے کہا۔

"یہی بات تو مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آپ اسے نظر انداز کیوں کر رہے ہیں۔ علاقے میں جگہ جگہ بیٹھ کر وہ ہمارے خلاف باتیں کرتا ہے۔ اور پہلی بار میرے خلاف تھانے میں ایف آئی آر کٹوا دی۔" کبیر نے گویا اس کے گناہ گنوا دیئے۔

"یہی تو میں نے کہا ہے نا۔ تم جذباتی نہ ہوا کرو۔ دشمن کو کبھی معمولی نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ بات سمجھ لو کہ وہ ایک ذہین دشمن ہے۔ اتنے طویل عرصے بعد اس کا دوبارہ گاؤں میں لوٹ آنا کوئی معمولی بات نہیں، وہ بہت سوچ سمجھ کر یہاں آیا ہے۔" چوہدری جلال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

"تو پھر کیا ہوا بابا! اس کی ساری ذہانت، اس کا سوچنا سمجھنا، چند منٹوں کا کھیل ہے۔ مجھے اجازت دیں، میں ابھی اسے ختم کر دیتا ہوں۔" کبیر نے تیزی سے کہا

"نہیں! میں تمہیں ابھی اجازت نہیں دوں گا۔ اسے سیاسی میدان ہی میں مار کر یہاں سے ذلیل و رسوا کر کے بھیجنا ہے۔ وہ ساری زندگی ہمارے لگائے ہوئے زخم کو یاد رکھے۔ وہ سیاست ہی کیا، جس میں اپنے دشمن پر قابو نہ پایا جا سکے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔ فہد صرف ایک مہرہ ہے۔ اس کے پیچھے کوئی گہری چال ہو گی۔" چوہدری جلال نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

"کون چل سکتا ہے یہ چال؟" کبیر نے تشویش سے پوچھا۔

"یہی تو پتہ کرنا ہے۔ دیکھو کوئی بندہ اس طرح خود کشی کرنے یہاں نہیں آ سکتا۔ میں مانتا ہوں اس کے دل میں ہمارے خلاف انتقام بھرا ہوا ہے۔ وہ مر گیا تو سب ختم ہو گیا۔" چوہدری جلال نے پھر سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"او نہیں بابا وہ کوئی مہرہ شہرہ نہیں ہے۔ اس نے آتے ہی اپنا ایک تاثر بنا لیا ہے، اور آپ کچھ اور ہی سوچنے لگے۔" کبیر نے ایک دم سے باور کرایا۔

"اتنی دیدہ دلیری پھر بھی نہیں ہوتی۔ سیاست بھی شطرنج کی طرح ہوتی ہے، ایک بھی غلط چال چلی اور کھیل ختم، شہ مات ہوتے دیر نہیں لگتی پتر۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں ہو گا بابا۔ بس ایک بار آپ مجھے اجازت دیں۔" کبیر حسرت ناک لہجے میں بولا تو چوہدری جلال نے سخت لہجے میں کہا۔

"اپنے غصے پر قابو رکھو کبیر! مجھے پہلے ہی ایک قتل

کو دبانے میں بڑی مشکل ہو رہی ہے۔ میں یہ معاملہ دیکھ لوں گا۔"

اپنے باپ کے لہجے پر کبیر ایک دم سے چونک گیا اور حیرت اور غصے کے ملے جلے لہجے میں بولا۔ "بابا! میں پھر کہوں گا، آپ اسے ڈھیل دے کر اچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ غصے میں اٹھا اور وہاں سے چلا گیا تو چوہدری جلال گہری سوچ میں ڈوبتا چلا گیا۔

شام کے سائے پھیل گئے تو چوہدری جلال حویلی کے کاریڈور میں آرام کرسی پر آ بیٹھا۔ فہد نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کو کہاں سے قابو کرے۔ منشی فضل دین نے اس کے قریب آ کر سلام کیا۔ چوہدری نے اس سے پوچھا۔

"ہاں منشی! کیا کہتا ہے وہ عمر حیات۔ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ نہیں؟"

"نہیں چوہدری جی! وہ کسی طرح بھی نہیں مانتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلانے کے لئے یہ بھی کہا کہ آؤ چوہدری صاحب سے بات کر لو مگر وہ حویلی آنے پر راضی ہی نہیں ہوا۔" منشی نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ چوہدری نے بری طرح چونک کر منشی کی طرف دیکھا، جیسے اس نے بڑی ہتک محسوس کی ہو۔ چند لمحے خاموش رہ کر چوہدری جلال نے تحمل سے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے۔ وہ بھی فہد کی زبان بولنے لگا ہے۔ تم نے سمجھایا نہیں کہ ہم پنچائیت کے ذریعے بھی زمین اس سے لے سکتے ہیں۔"

"بہت سمجھایا میں نے اسے۔ میں نے پنچائیت کی بات بھی کی مگر اس کی یہی رٹ ہے کہ میں نے زبان دے کر رقم لے لی ہے۔ اسٹام بھی لکھ کر دے دیا ہے۔"

"منشی! تم جانتے ہو کہ ہم پنچائیت کیوں بلاتے ہیں تاکہ فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق کروا سکیں۔ اب یہ پنچائیت ریونیو آفیسر کے پاس ہو گی۔ ابھی زمین فہد کے نام تو نہیں ہوگی ہے نا۔" چوہدری جلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا چوہدری صاحب! عمر حیات وہاں تو جائے گا۔" منشی خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب اگر اسے یہاں کچھ کہتے ہیں تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ فہد کی نگاہیں ہماری کمزوریوں پر ہوں گی۔ وہ خواہ مخواہ شور مچائے گا۔ جب ہمارا کام آفیسر خود کر دے گا تو کیا ضرورت ہے یہاں سر دردی لینے کی۔" اس نے لاپرواہی سے کہا تو منشی بولا۔

"میں سمجھ گیا چوہدری صاحب۔ میں آج ہی چلا جاتا ہوں اور انہیں ساری بات سمجھا آتا ہوں۔"

"تم نور پور جا کر آفیسر کو سمجھا آؤ کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ اب پنچائیت ہو گی اور ہماری مرضی کا فیصلہ ہو گا۔" چوہدری نے سکون سے کہا۔

"ظاہر ہے، پانی تو انہی آفیسروں کے پلوں کے نیچے سے گزرتا ہے۔ زمین نام ہونا تو ایک طرف، وہ لوگ فائل ہی گم کر دیں۔ تو انہیں کون پوچھنے والا ہے۔" منشی نے کہا۔

"اور ہاں، جاتے ہوئے باغ سے کچھ پھلوں کی ٹوکریاں لے جانا۔ اور اسے بتا دینا کہ ایک دو دن میں ہی پنچائیت بلائے۔ ضرورت پڑی تو میں بھی آ جاؤں گا۔" چوہدری نے اکتاہٹ سے کہا۔

"جیسے آپ کا حکم۔ میں چلتا ہوں۔" منشی بولا اور واپس پلٹ گیا۔ چوہدری مسکرا اٹھا۔

☆......☆......☆

سورج اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ چاچا سوہنا حسب معمول صحن میں تنہا بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور اندر کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

"چھاکے...... او پتر چھاکے!"

چند لمحوں بعد چھما کا اندر سے باہر آ کر بولا۔
"ہاں، ابا۔ ابول، کیا بات ہے؟"
یہ کہہ کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔
"وہ پتر...... آج تو ابھی تک گھر میں ہے، باہر نہیں گیا؟ اپنے گھر سے بھی کوئی بات نہیں کر رہا۔" چاچا سوہنا اداسی میں یوں بولا جیسے اسے کوئی الجھن ہو۔
"ہاں ابا! آج کچھ بھی کرنے کو دل نہیں کر رہا۔ وہ فہد کے ساتھ سراج گیا ہے نا پنچائت میں نور پور۔ رقم تو انہوں نے ادا کر دی ہے اب زمین نام ہی ہو گی۔ بس یہی سوچ آ جاتی ہے کہ کوئی خطرے والی بات نہ ہو۔" چھماکے نے تشویش سے کہا تو چاچا سوہنا ایک لمبی سانس لے کر بولا۔
"زمین نام ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ مگر خطرے والی بات یہ ہے کہ پنچائیت میں چوہدری جلال خود جائے گا۔ اس لئے کچھ بھی ہو سکتا ہے......"
"پھر تو ممکن ہے وہاں خطرہ ہو۔" وہ تیزی سے بولا۔
"یہی تو ڈر ہے پتر! چوہدری جلال کی بات نہ مانی گئی تو وہ کوئی بھی طوفان کھڑا کر سکتا ہے۔ اس کے پاس تو غنڈوں کی فوج ہے۔" چاچے سوہنے نے کہا۔
"اب کیا ہو سکتا ہے ابا۔" وہ پھر تشویش سے بولا۔
"اللہ خیر کرے گا۔ ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں نا۔" اس نے یوں کہا جیسے خود کو تسلی دے رہا ہو۔
"ہاں ابا! اللہ خیر کرے گا۔ تو آرام کر۔ میں تیرے لیے دوکان سے بوتل لے کر آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے چھما کا اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ چاچا سوہنا کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا پھر خاموشی سے لیٹ گیا۔

☆......☆......☆

دن کا پہلا گزر چکا تھا۔ نور پور پر سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سرکاری عمارتوں میں ریونیو آفس کی گیروے رنگ کی عمارت کے سامنے چوہدری جلال کی گاڑی آ کر رک گئی۔ منشی نے جلدی سے باہر نکل کر چوہدری کے لیے دروازہ کھولا۔ چوہدری جلال بڑے کروفر سے باہر نکلا ہی تھا کہ وہیں پر فہد کی گاڑی آ رک گئی۔ اگلے ہی لمحے کار میں سے فہد باہر آ گیا تو منشی نے تیز مگر آہستگی سے کہا۔
"یہ ہے وہ فہد۔"
فہد کی نگاہ چوہدری جلال پر پڑی تو اس کے کانوں میں برسوں پہلے کی آواز گونج گئی کہ "میں کمینے لوگوں سے کلام نہیں کرتا۔"
ایسا ہی حال کچھ چوہدری کا بھی تھا۔ برسوں پہلے کا کمزور سا لڑکا اب بھرپور جوان ہو کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے تب جس نفرت سے کہا تھا کہ "میرے استاد کی شان میں گستاخی مت کرو۔" وہ آج بھی ویسی ہی نفرت اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چند لمحے دیکھتے رہے۔ تبھی منشی نے کہا۔ "چلیں چوہدری صاحب اندر۔"
چوہدری نے کچھ نہیں کہا بلکہ خاموشی سے بڑے کروفر کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ سراج اس دوران فہد کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فہد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا تو وہ بھی اندر کی جانب چل دیا۔
ریونیو آفس کے اندر فہد، چوہدری جلال، سراج، ریونیو آفیسر چاچا عمر حیات اور دوسرے چند معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ ریونیو آفیسر نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب معززین نور پور کے ہیں۔ انہیں میں نے دعوت دی ہے کہ آپ یہاں آئیں تا کہ ہم کسی فیصلے پر پہنچیں۔ جی پہلے چوہدری صاحب! آپ فرمائیں۔"
چوہدری جلال نے سب کی طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے اپنا موقف کہنے لگا۔ "عمر حیات اور اس

کے بھائیوں میں کافی عرصے سے تنازعہ چل رہا ہے۔ان کا فیصلہ میرے پاس ہی تھا۔عمر حیات کے بھائیوں کا یہ کہنا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی نقد رقم دکھا کر بہت تھوڑی قیمت پر زمین ہتھیا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ بے چارے میرے پاس آئے کہ وہ تو زیادہ قیمت دینے کو تیار ہیں، کیونکہ حق تو عمر حیات کے بھائیوں کا بنتا ہے۔عمر حیات کو اگر اپنے بھائیوں سے اچھی رقم مل رہی ہے تو زمین انہیں دے دینا چاہیے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں فہد صاحب!" ریونیو آفیسر نے فہد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ چوہدری صاحب جو ہیں۔یہ فریق بن کر آئے ہیں یا منصف؟"

"ظاہر ہے وہ پنچائتی ہیں۔ عمر حیات کے بھائیوں نے ان سے فیصلہ کروانا چاہا۔اسی لئے انہیں یہاں بلایا ہے۔"

"معاملہ میرے اور چاچے عمر حیات کا ہے۔ درمیان میں یہ چوہدری کیا کر رہا ہے۔" فہد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو چوہدری نے غصے میں اس کی طرف دیکھا۔فہد نے ایک جھٹکے میں اس کی ذات کی نفی کر کے رکھ دی تھی۔اس پر چوہدری جلال خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے علاقے کے لوگ ہیں۔میرے پاس اپنی استدعا لے کر آئے ہیں۔اب میں ان کے حق نہیں بچاؤں گا تو اور کون بچائے گا۔"

"جس بندے نے برس ہا برس سے ایک غریب کسان کی زمین دبا رکھی ہو اور اس کے گھر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہو۔کیا ایسا آدمی پنچائتی کہلانے کا حق دار ہے۔اس بات کا فیصلہ چوہدری سے کروالیں کیونکہ یہ منصف تو کیا پنچائتی کہلانے کا حقدار بھی نہیں ہے۔" فہد نے طنزیہ لہجے میں کہا تو چوہدری ایک دم سے چونک گیا۔فہد نے اصل بات سے پہلے ہی اس کو ذہنی طور پر کچل کے رکھ دیا تھا۔اس پر شہر کے ایک معزز نے پوچھا۔

"چوہدری صاحب! یہ کیا بات ہے۔آپ اس کا جواب دیں گے۔؟"

"یہ فقط اصل بات سے گمراہ کر رہا ہے۔جس مسئلے کے لیے ہم یہاں بیٹھے ہیں، وہ حل کریں۔" چوہدری نے ہوش مندی سے کہا تو فہد تیزی سے بولا۔

"چلیں، فیصلہ یہیں کرتے ہیں۔ اگر میرا کہا جھوٹ ثابت ہو جائے تو میں یہ زمین نہیں لوں گا، اور نہ رقم واپس لوں گا۔اور اگر یہ چوہدری جھوٹا ثابت ہوا تو اس کی سزا کیا ہوگی۔؟"

"جواب دیں چوہدری صاحب، خاموش کیوں ہیں۔" اس معزز نے پھر اسے پوچھا۔

"اصل میں اس کے باپ نے چوری کی تھی اور......" چوہدری جلال نے غصے میں کہا تو فہد ایک دم سے بھڑک اٹھا۔اس نے انتہائی غصے میں کہا۔

"بکواس بند کرو چوہدری! میرے باپ پر الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہئے۔سچ تو ہے کہ تم نے اپنے بندوں کے ذریعے میرے باپ پر ظلم کر کے علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔آج انصاف کا ٹھیکیدار بنے علاقے والوں کے حقوق کی حفاظت بارے بات کر رہے ہو۔خبردار! میرے باپ کی شان میں گستاخی کی تو......ایسی ہی غلطی تم ایک بار پہلے بھی کر چکے ہو۔"

"فہد صاحب! یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔آپ خود پر قابو رکھیں۔پرسکون ہو جائیں پلیز۔" ریونیو آفیسر نے جلدی سے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"اصل میں اس بندے نے میری زمین دبائی ہوئی ہے۔اگر واپس کر دیتا تو مجھے نئی زمین خریدنے کی ضرورت نہ ہوتی۔اور جب زمین کا مالک اپنی زمین بیچنے کے لیے راضی ہے تو یہ پنچائتی کون ہے جو دوسروں کا وقت

برباد کر رہا ہے۔" فہد نے صاف لفظوں میں کہا تو دوسرا معزز بولا۔ "جس نے زمین بیچی ہے وہ کیا کہتا ہے؟"

اس پر ریونیو آفیسر نے عمر حیات سے پوچھا۔

"عمر حیات! کیا آپ نے اپنی زمین بہ رضامندی رغبت اور پوری قیمت پر فروخت کی ہے؟"

"جی بالکل! مجھے پوری ادائیگی ہو گئی ہے۔ یہ اس چیک کی نقل ہے جو فہد نے مجھے دیا ہے۔ رقم میرے اکاؤنٹ میں ہے۔ رقم مجھے مل گئی۔" اس نے صاف انداز میں اپنا بیان دے دیا۔

"اگر آپ کے بھائی لینا چاہیں تو؟ اتنی رقم تو وہ بھی دے رہے ہیں۔" ریونیو آفیسر نے پوچھا۔

"میں ان کے ہاتھوں زمین بیچنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ کم تو کیا۔ ایک ٹکا بھی نہیں دینا چاہتے۔ یہ میں جانتا ہوں، اس کی وجہ میرے اپنے خاندانی معاملات ہیں۔ میں نے زمین فہد کو بیچ دی ہے۔ فقط عدالت ہی میں نہیں ہر جگہ میرا یہی بیان ہے۔" عمر حیات نے کہا۔

"اب کیا کر سکتے ہیں چوہدری صاحب! مالک رقم لے چکا ہے۔ اس نے راضی خوشی اپنی زمین بیچ دی۔" ریونیو آفیسر نے چوہدری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس کا فیصلہ تو اب عدالت میں ہوگا۔ جو اس کے بھائیوں کا قانونی حق ہے۔" یہ کہتے ہوئے چوہدری اٹھنے لگا تو فہد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میدان چھوڑ کر مت بھاگو چوہدری۔ اس طرح تم ان معزز لوگوں کے فیصلے کی توہین کر رہے ہو۔"

"اگر تم میں ہمت ہے تو اپنی زمین واپس لے لو۔" چوہدری جلال نے اپنی طاقت کے خمار میں وہ کہہ دیا جو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔ وہاں پر موجود سب لوگ اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ بلاشبہ یہ ان سب لوگوں کی ہتک تھی۔ کافی دیر تک ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ تب ریونیو آفیسر نے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "تو پھر کیا فیصلہ ہے آپ لوگوں کا؟"

"حق تو فہد ہی کا بنتا ہے۔" ایک معزز نے کہا تو اس کی تائید وہاں موجود سب نے کر دی۔ اس پر ریونیو آفیسر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "فہد! آپ اطمینان رکھیں۔ زمین آج ہی آپ کے نام کر دیتے ہیں۔"

"تھینک یو۔ آفیسر!" فہد سکون سے بولا۔ "لیکن اب آپ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔ آخر وہ علاقے کا ایم این اے ہے۔ میرا تو زیادہ سے زیادہ تبادلہ کروا دے گا۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔" ریونیو آفیسر نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا تو فہد سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا ہوں سر۔"

ریونیو آفیسر نے وہاں آئے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کے ساتھ اٹھ گیا۔ سراج اور فہد بھی باہر نکل آتے چلے گئے۔

"کیا چوہدری اتنی آسانی کے ساتھ زمین سے دستبردار ہو جائے گا؟" سراج نے پوچھا تو فہد نے دھیمے سے کہا۔ "نہیں سراج ابھی کہاں! اب جا کر تو میں نے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالا ہے۔"

"وہ کیسے؟ میں سمجھا نہیں، سانپ کے بل میں ہاتھ؟" سراج نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! وہ چاچے عمر حیات کی اس زمین کو حاصل کے لیے بڑے لمبے عرصے سے محنت کر رہا تھا۔ اسی نے ان بھائیوں میں پھوٹ ڈلوائی ہوئی تھی۔ عین اس وقت جب چاچا عمر حیات بے بس ہو گیا تھا، یہ زمین میں نے لے لی۔ تم کہہ سکتے ہو سراج یہ زمین میں نے چوہدری سے چھینی ہے۔" فہد نے سنجیدگی سے کہا۔

"واقعی فہد، وہ اس چوٹ کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرے گا۔" سراج نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں وہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرے میرے ساتھ۔ کوئی وار کرے مجھ پر، جس کا میں خود دفاع کروں اور اسے اس کی اوقات بتاؤں کہ تھانے کچہری کی سیاست کرنے والے، صرف لوگوں کو خوف زدہ کر کے ہی اپنی حکمرانی قائم رکھ سکتے ہیں۔ عوام کو فائدہ نہیں دے سکتے۔" فہد نے غصے میں کہا جیسے اس کا خود پر بس نہ چل رہا ہو، برسوں بعد اپنے اس دشمن کو سامنے دیکھا تھا، جس کے لئے اس نے اپنی زندگی تیاگ دی تھی۔ اس کی حالت سے بے نیاز سراج نے حقارت سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"یار ایسے لوگ ایوانوں میں جا کر کیا کرتے ہیں۔"

"صرف اپنے مفادات کا تحفظ، یہ قومی مفاد کیا سوچ سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ چپڑاسی بننے کے قابل نہیں ہوتے۔ جن کے ہاتھوں میں بے روزگاروں کے لیے نوکریاں دے دی جاتی ہیں اور وہ ان کی بولی لگاتے ہیں۔ تف ہے ایسی سوچ پر۔" فہد نے غصے میں حقارت سے کہا تو سراج بولا۔ "خیر اب ہمیں سوچنا ہے کہ چوہدری کیا کر سکتا ہے۔"

"جو بھی کرے، میں تو ہر وقت تیار ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک دوسرے دفتر کی جانب چل پڑا، جہاں زمین اس کے نام ہونی تھی۔

قسمت گھر آ جانے تک ان میں خاموشی رہی۔ یہاں تک کہ گاؤں کا چوراہا آ گیا۔ سراج وہیں اتر کر رک گیا جبکہ فہد چلا گیا۔ وہاں کافی سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سراج ایک جگہ چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا تو ایک بزرگ نے پوچھا۔ "اوئے سراج، کیا بنا پر زمین کے فیصلے کا۔ سنا ہے تم بھی لور پور گئے تھے۔"

"ہونا کیا تھا، چاچے عمر حیات نے زمین بیچی، فہد نے خریدی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ زمین فہد کے نام ہو گئی۔"

"ہائیں! کچی ایسا ہو گیا، چوہدری نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے ہوتے ہوئے زمین کیسے فہد کے نام ہو گئی؟" وہاں موجود ایک بندے نے حیرت سے تبصرہ کیا۔

"جیسے ہوتی ہے۔ اوئے چوہدری کا صرف خوف طاری ہے تم لوگوں پر۔ ڈرتے ہو تم لوگ۔ اس لیے وہ ظلم کرتا ہے۔ ورنہ وہ کوئی اتنا دلیر نہیں ہے۔" سراج نے کہا۔

"بات دلیر یا بزدل کی نہیں، وہ طاقت ور ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ تم لوگوں کو پتہ اس وقت لگے گا جب زمین کا قبضہ لو گے۔ قبضہ لینا ہی تو سب سے بڑا کام ہے۔" اس بزرگ نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

"چاچا عمر حیات تو ابھی قبضہ دے رہا ہے۔ وہ تو۔" سراج نے کہنا چاہا تو دوسرا بندہ بات کاٹ کر بولا۔

"وہ نہیں! اس کے بھائی۔ زمین پر قدم نہیں رکھنے دیں گے۔ چوہدری بھی ان کے ساتھ ہے۔ تیری رجسٹریاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ایویں ہی خوش نہ ہوتے پھرو۔"

"تم لوگ یونہی ڈرتے رہو اور دوسروں کو ڈراتے رہو اس سے لیکن اب ہم نہیں ڈرنے والے۔ قبضہ بھی لے لیں گے۔" سراج نے دلیری سے کہا۔

"جب لو گے تبھی نا۔" پہلے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تم لوگ بھی یہیں ہو، ہم بھی یہیں ہیں۔" سراج بولا۔

"ویسے وہاں پر ہوا کیا۔ یہ تو بتاؤ۔" بزرگ نے پوچھا تو سراج روداد بتانے لگا۔

☆......☆......☆

جعفر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں باہر جانے کے لئے تیار بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اپنا سیل فون نکال کر نمبر پش کر دیے۔

دوسری طرف مائرہ لیپ ٹاپ پر مصروف تھی۔ سیل فون بجنے پر چونک اٹھی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھے تو مسکراتے ہوئے فون ریسیو کرتے ہوئے بولی۔

"ہیلو جعفر، کہو کیا بات ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے؟" جعفر نے خمار بھرے لہجے میں کہا تو مائرہ نے شوخ انداز میں جواب دیا۔

"کام کر رہی ہوں۔ تمہاری طرح مزدوری نہیں۔"

"اب اگر میں کہوں کہ آؤ، کہیں بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے ہیں اور کچھ باتیں کرتے ہیں، تو کیا کہو گی؟" اس نے شرارت سے کہا تو مائرہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں یہ کہوں گی کہ میرے پاس فضول کاموں کے لیے وقت نہیں ہے، تو پھر؟"

"تو پھر تم ایک بہت ہی اہم نیوز سے محروم رہ جاؤ گی۔" اس نے سکون سے کہا۔ اس پر مائرہ چونکتے ہوئے بولی۔

"نیوز...... کیسی نیوز؟"

"وہ جس نے تمہیں دھمکی دی تھی نا۔ میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔" جعفر نے عام سے لہجے میں کہا تو مائرہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"واؤ...... کیسے؟ کیسے تلاش کیا؟"

"میں نے ان کی ساری انفارمیشن لے لی ہے۔ وہ خود ایکشن کروں گا اور بہت جلد وہ گرفتار ہو جائیں گے۔" اس نے بتایا تو مائرہ بے حد جوش ہوتے ہوئے بولی۔

"اوکے! مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس دھمکی دینے والے کو مجھے ایک بار دکھانا ضرور، لیکن یہ سب کیسے ہوا، اتنی جلدی تم نے انہیں کیسے تلاش کر لیا، وہ کس گینگ......"

"صبر صبر، اتنی جلدی کیا ہے۔ اندر کا صحافی جاگ اٹھا ہے۔ میں بتا دوں گا لیکن ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔" جعفر نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے کہا تو مائرہ جھل سی ہوتے ہوئے، مگر پیار کے ساتھ بولی۔

"بدلہ لے رہے ہو نا۔"

"بالکل بھی نہیں، بس تم سے ملنے کا بہانہ بنا رہا ہوں۔" اس نے صاف کہہ دیا۔

"یہ بات ہے، تو چلو ٹھیک ہے۔ میں کچھ دیر بعد یہاں سے نکلتے ہوئے تمہیں کال کروں گی۔ وہیں پارک میں ملتے ہیں۔ میں نے تم سے ایک بات بھی کرنی ہے۔ اب کہیں ڈیوٹی کا بہانہ کر کے نہ نکل جانا۔" مائرہ نے پیار سے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب، میں انتظار کروں گا۔ آنکھیں فرش راہ کر کے۔" یہ کہہ کر اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔ تبھی مائرہ بھی فون بند کرتے ہوئے خیالوں میں کھو گئی۔ پھر بہت ہی پیارے انداز میں مسکراتے ہوئے ایک دم شرما گئی۔

شام کے سائے تیزی سے پھیلتے جا رہے تھے۔ جعفر اور مائرہ دونوں پارک میں ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ باتیں کرتے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئے تو مائرہ نے پوچھا۔ "ہاں اب بتاؤ جعفر...... کیسے معلوم ہوا تمہیں اس کے بارے میں؟"

"یہ بہت آسان تھا۔ میں اس گینگ کے پیچھے کافی دنوں سے ہوں۔ اور دوسرے طریقوں کے علاوہ میں ان کے نمبرز بھی چیک کر رہا ہوں۔ بس وہ نمبر میرے سامنے آ گیا تو میں جان گیا کہ وہ کون ہے۔" اس نے پُر تجسس سے انداز میں کہا تو مائرہ نے تجسس سے پوچھا۔

"کون ہیں وہ؟"

"وہی جن کے بندے ہم نے اندر کیے ہوئے ہیں۔ بہت پریشر ہے ان کے بارے میں کہ میں ان کو چھوڑ دوں۔ لوٹوں کی گڈیاں اٹھائے پھر رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"اور تم مان نہیں رہے نا۔ اگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی بات نہیں بنے گی تو وہ تمہیں جانی نقصان

بھی پہنچا سکتے ہیں نا؟'' مائرہ نے تیزی سے کہا۔
''ہاں تو اور کیا پیار کریں گے۔ اس کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں، موت تو آنی ہے نا۔'' جعفر نے کہا۔ تو مائرہ تڑپ کر بے ساختہ بولی۔
''اللہ نہ کرے۔'' پھر جعفر کے احساس کرنے پر خود ہی شرما کر کہا، ''مجرم کا کیا ہوتا ہے وہ...... خیر کیا تم نے ان کو پکڑنے کا پلان کرلیا ہے؟''
''ہاں کرلیا ہے۔''
''دیکھا جعفر! اگر دوست ایک دوسرے کا ساتھ دیں تو بڑے سے بڑے مسئلے حل ہو جائیں۔ جیسے تم نے کوشش کر کے ان دھمکی دینے والوں تلاش کرلیا۔ ویسے تمہارا میرے لیے پریشان ہونا مجھے بہت اچھا لگا۔'' وہ شرماتے ہوئے بولی تو جعفر کو بہت اچھا لگا۔ تبھی وہ پیار سے بولا۔
''ایک تم ہی تو میری دوست ہو۔ بلکہ دوست سے بھی بڑھ کر جس کا خیال رکھنا ہی، میری زندگی ہے۔ اس تعلق میں اک اعتبار ہی تو ہے۔ مان ہوتا ہے نا، اور مائرہ یہ تعلق ہر کسی سے ہو بھی نہیں سکتا۔''
''بالکل جیسے میں اور تم! کتنے برس سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ دوست ہیں، ساتھ پڑھے۔ پھر ملتے بھی رہے۔ فہد کے چلے جانے کے بعد ہم اچانک ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے۔ ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ہماری قربت اعتبار اور مان کا اظہار ہی تو ہے۔'' مائرہ کا اپنی سوچ واضح انداز میں کہہ دی۔
''مجھ پر اعتبار کرنے کا اور مان دینے کا بہت شکریہ مائرہ!'' وہ اس کے لفظوں سے سرشار ہوتا ہوا بولا۔
''شکریہ کہہ کر مجھے چھوٹا مت کرو جعفر! حقیقت ہے کہ فہد کے جانے کے بعد، جس طرح میں ٹوٹ گئی تھی اور جیسا مجھے سہارا تم نے دیا، اس پر تو میں تمہاری احسان مند ہوں۔ وہ نہ جانے کب لوٹ آئے گا۔

میرے انتظار کی اذیت تم نے کم کی ہے جعفر!" وہ اداس ہوتے ہوئے بولی تو جعفر نے کہا۔ "میں تمہارا دوست ہوں نا۔ میں نے ہی خیال نہیں رکھنا تو پھر کسی اور نے خیال کرنا تھا۔"

"تم فقط میرے دوست ہی نہیں، اس سے بھی بہت کچھ بڑھ کر ہو۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے ہم دونوں مل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ تمہارا ساتھ نہ صرف حوصلہ دیتا ہے بلکہ نیوز کی دنیا میں تہلکہ مچا سکتے ہیں۔" مائرہ نے اچانک کہا اور کہہ کر مسکرا دی اس پر جعفر بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

"ضرور، یہ اچھا ہے، سارا دن تمہیں یاد کر کے بور ہونے سے تو بہتر ہے۔"

اس پر مائرہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تو اک جلترنگ کا سا احساس چاروں طرف بکھر گیا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر جعفر نے کہا۔ "آؤ، کہیں سے کھانا کھاتے ہیں۔"

اس پر مائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو، کھانا بھی تمہاری پسند کا میری طرف سے۔"

دونوں ایک ساتھ اٹھے اور پارک سے باہر کی جانب چل دیئے۔ سورج مغرب میں اتر چکا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ چوہدری جلال حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ ریونیو آفس سے واپسی پر چوہدری جلال بہت غصے میں تھا، کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس سے بات کر سکے۔ اس کا غصہ کم ہوا تھا تو منشی بھی اس کے پاس آ کر تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے ریونیو آفیسر اس کے ساتھ مل گیا ہے۔ حالانکہ میں رات اس سے مل کر اور اسے بتا کر آیا تھا۔ اور فہد، اس نے بھی ذہانت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ویسے اگر وہ عمر حیات والی زمین لے گیا۔ تو ہماری شکست ہو گی۔ کم از کم ہم اسے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔"

"او نہیں کوئی شکست نہیں ہے۔ میں خود اس کا زور دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں تک کیا کرتا ہے۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ چاہے وہ اس کی اپنی زمین کا ٹکڑا ہے یا عمر حیات سے خریدی ہوئی زمین۔" چوہدری جلال نے بڑے سکون سے کہا۔

"چوہدری صاحب! ایک طرف اسے آپ ڈھیل کہہ رہے ہیں اور دوسری جانب اس کا زور دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں آئی بات۔" منشی نے الجھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔ اسے کس حد تک جانے کی اجازت دینی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں منشی، کہ اس علاقے کے لوگ ہمارے ساتھ کس حد تک وفادار ہیں۔" چوہدری جلال نے کہا تو اس کے لہجے میں شکوے اور غصے کی ملی جلی کیفیت تھی۔ اس پر منشی نے الجھتے ہوئے رائے دی۔

"آپ کی باتیں آپ ہی جانیں۔ لیکن میرا یہ خیال کہتا ہے کہ اب اسے ڈھیل نہیں دی جا سکتی۔ وہ ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ہاں، اب اس کا راستہ روکنا ہی ہوگا۔ لیکن کیسے، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر چوہدری جلال خاموش سے سوچنے لگا۔ تبھی پورچ میں گاڑی آ کر رکی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تبھی چوہدری کبیر غصے میں دندناتا ہوا اندر آ گیا، اس نے ایک نگاہ اپنے باپ پر ڈالی اور دانت پیستے ہوئے پوچھا۔ "بابا جی! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ اس فہد کے بچے نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔"

اس پر چوہدری جلال نے اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ کبیر کے اندر آگ دھڑ دھڑ جلنے لگی۔

(باقی آئندہ)

کامیابی کا سچ

میں ہر روز سر اٹھا کے جینے کا عزم کرتا رہا، زندگی ہر روز بڑی بے دردی سے مجھے پچھاڑتی رہی۔ میں ہر صبح ایک نئے جذبے کے ساتھ نئی منزلوں کی تلاش میں نکل پڑتا۔ زندگی ہر شام میرے قدموں کے ساتھ ناکامیوں کا بوجھ باندھ کر مجھے "اپاہج" بنانے کی تیاری کرتی رہی۔ ہر نئے دن میں خود کو شاندار کل کی نوید سناتا اور ہر رات میری سسکیوں کی گواہ بنتی۔ ناکامیاں، محرومیاں، جھڑکیاں، افسردگیاں، نامرادیاں اور مایوسیاں میرا گھیراؤ کر لیتیں۔

قیصر عباس

مجھے کامیابی کسی نے پلیٹ میں رکھ کر نہیں دی۔ جب میں پیدا ہوا تو میرے منہ میں سونے، چاندی، سلور، تانبے یا پیتل کا کوئی چمچ نہیں تھا۔

غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزارنے والے لاکھوں خاندانوں میں سے کسی ایک خاندان میں پیدا ہونا کون سی خوش بختی کی بات کہی جا سکتی ہے؟ معاشی پسماندگی کی چکی میں پسنے والے، آٹھ بچوں کو کسمپرسی کی حالت میں پالنے کی ذمہ داری کے بوجھ تلے دبے میرے ماں باپ، جنہوں نے خوشحالی کی کبھی شکل نہ دیکھی۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا گلا گھونٹ کر، محرومیوں کی سولی پر چڑھی ہوئی میری ماں گھٹتی، ترستی، لاچار زندگی جیتے جیتے بالآخر ہار گئی۔ میرے باوقار مزدور باپ کے ساتھ شانہ بشانہ مشقتوں کا بوجھ بانٹتے بانٹتے میری ماں اتنا تھک گئی کہ خاموشی سے ہمیشگی کے آرام کو اپنا لیا۔

مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ ماں کی بیماری لاعلاج نہیں تھی۔ امی کو بروقت ہسپتال نہ پہنچا سکنا اور صحت کی بنیادی سہولتوں سے محرومی ان کی موت کا سبب بنی۔ سوچتا ہوں امی جلدی ہسپتال پہنچ جاتیں تو شاید ان کی جان بچ جاتی۔ پھر سوچتا ہوں کہ ایک گدھا گاڑی آخر کتنی تیز چل سکتی ہوگی۔

آج نئے ماڈل کی شاندار گاڑیوں میں گھومتا ہوں تو امی کی بے بسی یاد آتی ہے اور سخت رلاتی ہے۔ کاش میں اپنی ماں کے لئے اس بے بسی کے لمحے میں کچھ کر سکتا!

لیکن میں جب اتنا چھوٹا تھا کہ یہ تک احساس نہ تھا کہ میں نے کیا کھویا ہے؟ میں اس لئے روتا تھا کہ سب بہن بھائی روتے تھے بلکہ کئی بار تو اس لئے روتا تھا کہ چپ کروانے کے لئے بابا جان سے ٹافی، ایک بسکٹ یا چند سکے مل جاتے تھے۔ سوچتا ہوں کہ کاش امی تھوڑا

انتظار کر لیتیں تو آج میں انھیں دنیا کے سب سے اچھے ہسپتال لے جاتا اور ہر قیمت پر اُن کے لئے خدا سے چند سانسوں کی التجا کرتا۔

بچپن نا آسودگی، پریشانی، محرومی اور تنگدستی کی داستان تھا۔ خواہشوں کی جستجو تو دور کی بات، ضرورتوں تک بھی رسائی نہ تھی۔

اپنی پسند کے کپڑے کبھی نہ پہنے، امیر رشتہ داروں کی طرف سے بھیجے گئے پرانے، استعمال شدہ کپڑے پہن کر گزارہ کیا۔ چمکتے دمکتے الیکٹرانک کھلونوں کی بجائے اپنے ہاتھ سے بنائے مٹی کے کھلونوں پر ہی اکتفا کیا۔

زندگی میں ہر چیز کی کمی تھی۔ تنگ دستی، غربت، بیماری، بے بسی اور مایوسی کا راج تھا۔ زندگی محرومیوں سے بھری پڑی تھی۔

گھر کا جذباتی ٹمپریچر خطرناک حد تک پہنچ چکا تھا۔ "ہاتھ تنگ ہے" کے الفاظ سُن سُن کے کان پک گئے تھے۔ زندگی ادھار پر چل رہی تھی۔ روزمرہ کے لئے اُدھار، مالک مکان سے اُدھار، دودھ والے سے اُدھار، حتیٰ کہ سکول کی فیس بھی اُدھار۔ ہر مہینے ٹیچر کلاس سے نکال دیتے "جاؤ گھر سے فیس لے کر آؤ"۔ گھر سے جواب آتا "ابھی پیسے نہیں ہیں" کئے بار تنگ آ کے گھر سے کوئی کہتا "فیس نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب سے کہو ہمارے نام کاٹ دیں"

آج پیچھے مُڑ کر دیکھوں تو ان محرومیوں، تنگ دستیوں اور مشکلات کے باوجود مجھے اپنا بچپن یادگار محسوس ہوتا ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر ہم اپنا کھیلنے کا سامان خود ہی بنا لیتے تھے۔

کبھی پولی تھین کے شاپنگ بیگز اور کپڑوں کو جلا کر ایک سخت قسم کی 'گیند نما چیز' بنائی تو کبھی پرانے کپڑوں اور تاگوں کو سوئی دھاگے سے سی کے کرکٹ کھیلنے کے لئے "کھدو" تیار کیا۔ بہن جس ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر کپڑے دھوتی وہی ہمارا بیٹ بن جاتا۔ کسی درخت پر چڑھ کر اس کی کوئی مضبوط ٹہنی جو آگے سے ذرا مڑی ہوتی، کاٹی جاتی اور وہی ہماری ہاکی بن جاتی۔ پرانی کتابیں، پرانے کپڑے، پرانے جوتے، پرانے بیگ ہی ہمارے ساتھی رہے۔ کلاس کے دیگر بچوں کی نئی کتابیں، بیگ، کپڑے اور جوتے دیکھ کر ہمارے اندر نئی آرزوئیں جاگتیں۔ لیکن محرومی کی لوریاں ان آرزوؤں کو پھر سے سُلا دیتیں۔ باقی بچوں کو سکول سائیکل پر آتا جاتا دیکھتے تو بڑی خواہش بڑھتی کہ کاش ایک سائیکل ہمارے پاس بھی ہوتی۔ ہر بار فرسٹ آنے پر سائیکل دلوانے کا وعدہ تو ہوتا لیکن سکول سے ہائی سکول اور کالج سے یونیورسٹی تک بھی کسی قسم کی سواری ہمارا مقدر نہ بن سکی۔

البتہ کچھ پیسے جمع کر کے مہینے میں ایک آدھ بار کرائے کی سائیکل پر سڑکوں پر خوب مزے کئے، لیکن جیسے جیسے گھنٹہ پورا ہونے کا خیال آتا سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔ سائیکل واپس کر کے پیدل آنا بہت ہی برا لگتا تھا۔ لیکن زندگی آگے بڑھتی چلی گئی۔

ماں باپ غریب ضرور تھے لیکن شعور، علم و آگہی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ابو نے کبھی سکول کی شکل نہیں دیکھی تھی لیکن اعلیٰ درجے کی شاعری لکھتے تھے۔ اُردو زبان پر اُنھیں "اُردو دانوں" کی طرح عبور حاصل تھا۔ بے سروسامانی اور وسائل کی شدید قلت کے باوجود اُن کے لباس، گفتار اور طرزِ عمل سے وقار جھلکتا۔ محنت، سچائی اور بلند عزمی میں نے انہی سے سیکھی۔

امی خاص طور پر چاہتی تھیں کہ اُن کے بچے پڑھیں، سکول جائیں۔ ابو نے چھ بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی کسی کو اپنے ساتھ کام میں نہیں لگایا۔ خود مشقتیں جھیلیں لیکن بچوں کو تعلیم کا راستہ دکھایا۔

اس مقصد کو پانے کے لئے اُنھوں نے لاتعداد

قربانیاں دیں۔ میں نے انہی سے سیکھا کہ کوئی اعلیٰ مقصد بغیر قربانی دیئے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ میرے والدین نے بچوں کی تعلیم اور شاندار مستقبل کے لئے کتنی ہی ہجرتیں کیں، کتنے ہی گھر بدلے۔ کتنے ہی ذرائع آمدن اختیار کیے، کتنے ہی دکھ جھیلے اور کتنی ہی بار بے گھری کی اذیت سہی۔ ان قربانیوں کا کوئی دوسرا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

وہ جانتے تھے کہ جتنا بڑا مقصد ہوگا اتنی ہی بڑی قربانی دینی ہوگی۔ انہیں یقین تھا کہ جتنی بڑی قربانی ہوگی اتنا ہی بڑا انعام ہوگا۔ ہاں انہیں اس بات کا شاید پتہ نہیں تھا کہ قربانی کے انعامات اور ثمرات آنے پر وہ خود ان سے مستفید نہیں ہو پائیں گے۔

میں نے ابو سے سیکھا کہ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ہم زندگی میں کہاں کھڑے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اب کہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے؟ ہمارے فیصلے ہی ہماری تقدیر کا تعین کرتے ہیں۔

تبہ کے ریتلے ٹیلوں کو چھوڑنے کے فیصلے سے لے کر، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ماجیا نوالہ اور پھر فاروق آباد تک کی نہ جانے کتنی ہجرتوں کے فیصلے کے پیچھے ایک ہی مقصد تھا، بچوں کی تعلیم اور بہتر کل کی جستجو۔ اپنے کل کی تلاش میں فاروق آباد سے لاہور تک میری پہلی ہجرت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

'محنت میں عظمت' کی چلتی پھرتی مثال میرے امی ابو، تب بھی میرے ہیرو تھے جب بغیر کسی دباؤ کے میں نے سیلز مین کی نوکری کی۔ الیکشن کے دنوں میں کڑکتی دوپہروں میں گاؤں گاؤں پھر کر وال چاکنگ کی۔ انٹر میڈیٹ میں گولڈ میڈل کے باوجود میرا فیکٹری میں مزدوری کرنے میں کبھی عار محسوس نہ کرنا بھی انہی کی تربیت کا اثر تھا۔ لیکن اپنی کمائی کبھی اُن کی ہتھیلی پر رکھ سکوں، یہ خوش بختی میرے حصے میں نہ آسکی۔

میرے ابو نے زندگی بھر کسی اور پر انحصار نہ کیا۔ انہوں نے اپنے بل بوتے پر جینے کا سبق مجھے بھی سکھایا۔ میں نے اُن کی زندگی سے نتیجہ اخذ کیا کہ جب تک اپنے زندگی کی 100 فیصد ذمہ داری خود نہیں اُٹھاتے، زندگی رُکی رہے گی، جامد رہے گی، آگے نہیں بڑھے گی میں نے اُن سے سیکھا کہ زندگی شکایتیں کرتے رہنے سے نہیں بلکہ ذمہ داری لینے سے بدلتی ہے۔ آدھی ذمہ داری لینے سے آدھی زندگی نہیں بدلتی۔ پوری ذمہ داری لینے سے بھی ساری زندگی نہیں بدلے گی۔ حیران مت ہوں، شروع میں تھوڑی سی بدلے گی، لیکن ذمہ داری اُٹھائے رکھنے سے جلد ہی ساری کی ساری بدل جائے گی۔

اگر کبھی بھی آپ نے زندگی میں شکایات کی ہیں، دوسروں کی وجہ سے خود پیچھے رہ جانے کا رونا رویا ہے تو سمجھ جایئے کہ آپ اپنی زندگی کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر خود بیٹھنے کے لئے ابھی تیار نہیں ہیں۔

میری زندگی غربت کی پگ ڈنڈیوں سے خوشحالی کی شاہراہ پر کیسے پہنچی؟ "سر جھکا کے جیو" کی چلتی پھرتی مثال نے "سر اٹھا کے جیو" کے پیغام کو پھیلانے کا فیصلہ کیسے کرلیا؟

کوئی معجزہ ہوا؟ معجزہ ہی تو لگتا ہے کیونکہ سفارش نہیں تھی، بڑے لوگوں سے تعلقات نہیں تھے، پرچی نہیں تھی، سیاست والوں کی حمایت نہیں تھی، وزیروں تک دسترس نہیں تھی، ساتھ چلنے والے لوگ نہیں تھے، یوں کہیے کہ کامیابی کا دروازہ کھولنے کے لئے کوئی بھی کنجی چابی میرے پاس نہیں تھی۔ اثر رسوخ رکھنے والے رشتہ دار نہیں تھے، ریفرنس بننے والے دوست نہیں تھے۔ فیملی بیک گراؤنڈ نہیں تھی، پیسے نہیں تھے، تجربہ نہیں تھا، قسمت نہیں تھی، وسائل نہیں تھے، مواقع نہیں تھے۔ اگر مواقع تھے تو ان سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ نہیں تھا۔ سمجھ نہیں تھی، شعور نہیں تھا۔ سچ پوچھئے تو کچھ بھی نہیں تھا۔

ہاں اگر تھا تو ایک جذبہ تھا، ایک تڑپ تھی، ایک جوش تھا، ایک خواب تھا سر اُٹھا کے جینے کا۔ لیکن کیا یہ جذبہ، تڑپ، آگ، جوش اور کامیابی کی شاہراہ تک لانے سر اُٹھا کے جینے کے لئے کافی ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ نہیں...... ہاں یہ سب ضروری بہت تھے، ان کے بغیر کامیابی کو اپنی طرف مائل کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن کوئی چیز ہے جوان سب سے بڑی تھی، اہم تھی اور زندگی ساز تھی۔

تو وہ کیا تھی؟

وہ سوچ کی ذرا سی تبدیلی تھی، ایک انداز فکر تھا، چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا ایک نیا زاویہ تھا۔ وہ ایک احساس تھا، ذمہ داری کا احساس، جس نے دل میں اس سوچ کو جگہ دی کہ اس وقت میں جہاں بھی ہوں، جس طرح کی بھی زندگی جی رہا ہوں، اور جو بھی ناکامیاں، مایوسیاں، ستم ظریفیاں، تنگ دستیاں، ناآسودگیاں اور بدحالیاں میری زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں، ان کی ذمہ داری صرف ایک ہی شخص پر عائد ہوتی ہے اور اس کا نام ہے "قیصر عباس"۔ میرے سر جھکا کے جینے کی ذمہ داری خود میرے اپنے سر ہے۔

میرے والدین ذمہ دار ہیں، نہ معاشرہ، نہ اساتذہ، نہ سکول، نہ تعلیمی ادارے، نہ حکومت، نہ معاشی واقتصادی صورتحال، نہ ہی مہنگائی کا پہاڑ۔

میں نے خود کو سمجھا لیا کہ میری ناکامیوں اور نامرادیوں کے پیچھے نہ امریکہ ہے، نہ ہی آئی اے، نہ راء کا کوئی ایجنٹ ہے نہ 9/11 کا واقعہ، نہ اس کی ذمہ داری دہشت گردوں پر ہے، نہ ملک کی سیاسی جماعتوں پر۔ اپنی ناکامی اور شکست کی ذمہ داری صرف اور صرف مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ بس میں خود ذمہ دار ہوں۔

آخر میری سوچ میں تبدیلی آئی کیسے؟

سادہ سی بات ہے، میں نے زندگی کے چوبیس سال ان تمام چیزوں سمیت بے شمار شخصیات، واقعات اور حالات کو اپنے آگے نہ بڑھ سکنے کا قصوروار قرار دے کے دیکھ لیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ میں نے اپنے علاوہ ہر چیز کو اپنی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا لیکن زندگی نہ بدلی۔ زندگی ٹھہری رہی، زندگی ناکامیوں سے ہمکنار رہی۔ میں سر جھکا کے جیتا چلا گیا لیکن جس دن میں نے سوچ لیا، تہیہ کر لیا کہ اپنی زندگی کے بدلنے یا نہ بدلنے کی ذمہ داری میرے سوا کسی اور پر عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی اپنے سوا کسی اور کو میں اپنی ناکامی کا الزام دوں گا۔ وہی دن میری زندگی میں ایک شاندار تبدیلی کا پیامبر ثابت ہوا۔

میں نے خود سے پکا عہد کر لیا کہ میں ہی ذمہ دار ہوں اور جب تک میں ذمہ داری کا حق ادا نہیں کروں گا، کچھ نہیں بدلے گا۔

میں نے سیکھ لیا، سمجھ لیا کہ میری زندگی میں جو کچھ بھی ہو چکا، اسے کسی نہ کسی طرح میں نے ہی ہونے کا موقع، وجہ یا رستہ دیا اور آگے میری زندگی میں جو کچھ بھی ہوگا، اس کی ذمہ داری میں کبھی کسی اور پر عائد نہیں کروں گا۔ میں کھلے دل سے نتائج کو تسلیم کروں گا، واضح ثبوت ہونے کے باوجود کسی اور کی بجائے خود کو ہی ذمہ دار ٹھہراؤں گا۔ اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔

ایسا کرنا بے حد مشکل تھا، آسان نہیں تھا، تلخ تھا، تکلیف دہ تھا۔ کئی بار ایسا کرنا خود کے خلاف اعلان جنگ سے کم نہیں تھا۔ بیشتر دفعہ اندر کی "دفاعی فوجیں" پوزیشنیں سنبھال کر خود کے دفاع کا ارادہ کر لیتی تھیں، لیکن توپوں کے رُخ خود کی طرف ہی موڑ رکھے۔

مجھے لگا اس طرح 'ذمہ داری' نبھانے سے میں خود کو ہی مار ڈالوں گا۔ خود کو ہی کچل دوں گا۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ ہر بار ذمہ داری لینے کے بعد مجھے خود کی کوئی نہ کوئی خامی، کمزوری اور بہتری کا سراغ مل ہی جاتا۔ یوں میں نے دوسروں کو بدلنے کی بجائے خود کو بدلنے سے سفر کا آغاز کیا اور کمال ہے کہ سفر رائیگاں نہیں گیا، الحمد اللہ!

مثال کے طور پر جب ایک بڑی کمپنی کے ہیومن ریسورس ہیڈ نے میرے رنگ برنگے لباس پر کڑی تنقید کی، مجھے شرمندہ کیا اور میرا مذاق اڑایا اور کہا کہ "آپ ہمارے لوگوں کو "گرومنگ" کی کیا ٹریننگ دیں گے، آپ کا تو اپنا حلیہ اس قابل نہیں ہے" اور ابھی میں یہی باؤنسر سہہ نہ پایا تھا کہ انھوں نے یہ کہہ کر مجھے کلین بولڈ کر دیا کہ "جناب برامت مانیے گا، آپ ٹرینر کم اور جوکر زیادہ لگ رہے ہیں۔"

میرا دل کیا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس شرمندگی سے بچ جاؤں، کئی دن تک اس کی توہین آمیز آوازیں راتوں کو خوابوں میں میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔

"اس بے عزتی کے لئے میں کیسے ذمہ دار ہو سکتا ہوں" بے ساختہ میں نے سوچا۔ "یہ تو سراسر اس کی زیادتی ہے۔ اس کو احساس کرنا چاہیے تھا، اس کو میری قابلیت دیکھنی چاہیے تھی، نہ کہ ظاہری رنگ و روغن۔"

دل نے بہانے گھڑے لیکن جب تک میں الزام، شکایت اور احتجاج کی کیفیت میں رہا، میری زندگی ٹھہری رہی، جامد رہی، ناکام رہی۔

اگلے ہی لمحے میں نے خود سے فیصلہ کن انداز میں کہا "کچھ بھی ہو، میں ہی ذمہ دار ہوں"

"لیکن کیسے؟" جیسے ہی یہ سوال میں نے اپنے ذہن کے سرچ انجن میں ڈالا، جواب میں ہزاروں ویب سائٹس کھل گئیں۔

"تم اس لئے ذمہ دار ہو کہ تمہارے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں"

"مگر میں ڈھنگ کے کپڑے افورڈ نہیں کرتا۔"

"اگر تم افورڈ نہیں کرتے تو یہ اس کا قصور نہیں۔"

"اگر تم پیسے نہ ہونے کی بیماری کا شکار ہو تو یہ بھی کسی کا قصور نہیں ہے۔"

"اگر تمہیں کپڑے پہننے کی 'سینس' نہیں تو یہ ذمہ داری بھی تمہاری اپنی ہے۔"

میرے اندر کا انسان اپنی ذمہ داری نبھانے پر تل گیا۔

"اگر تم اُسے اس قابل نہیں لگے کہ وہ تمہارے ساتھ عزت سے پیش آئے تو بھی تم ہی اس کے ذمہ دار ہو۔" (یہ ذمہ داری لینا سب سے مشکل کام تھا) "اس لئے کہ تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ کاروباری لوگ جن باتوں سے ایک دوسرے کو 'جج' کرتے ہیں۔ تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ جس چیز کی ٹریننگ تم دوسروں کو دینے آئے تھے اس پر تمہیں واقعی عمل ضرور نہیں ہے۔ تمہیں وہ تمام تقاضے پورے کرنے چاہئیں تھے جو ایک کامیاب ٹرینر کے لئے ضروری ہیں۔ اور چونکہ تم اسے ایک کامیاب ٹرینر نہیں لگے، اس لئے تمہارے ساتھ اس نے وہ سلوک نہیں کیا، جو ایک کامیاب ٹرینر کے ساتھ کرتا۔ لہٰذا اگر تم ایک کامیاب ٹرینر نہیں لگے تو بھی یہ تمہارا خود کا قصور ہے۔"

"اگر اس نے تمہیں عزت نہیں دی تو اس کو کم ظرف کہنے سے تمہاری زندگی آگے نہیں بڑھے گی جب تم سیکھ جاؤ گے کہ 'قابل عزت' کیسے لگنا اور جینا ہے؟"

میرا دماغ خیلات، انوکھی سوچوں اور پُر جوش احساسات سے بھر گیا۔ اور پھر میں نے سوچا کہ کم پیسوں کے باوجود اپنے لباس، شخصیت اور حلیے کو کیسے پروفیشنل رکھنا ہے۔ میں نے سیکھ لیا کہ بے سروسامانی کے باوجود کلائنٹ کے سامنے کیسے خود اعتمادی کے ساتھ بیٹھنا ہے۔ میں نے سیکھ لیا کہ کیسے اپنے اندر کے حالات کے منفی اثرات کو باہر کی دنیا پر بلاوجہ ظاہر ہونے سے روکنا ہے۔ کیسے ایک 'رکھ رکھاؤ' رکھنا ہے۔

پھر واقعی پاکستان کرکٹ بورڈ میں قومی ٹیم کو پیک پرفارمنس کی ٹریننگ دیتے ہوئے میں نے وہ بھرم قائم رکھا۔

میں سب سے پہلے قذافی سٹیڈیم پہنچتا اور سب سے بعد میں نکلتا تا کہ کوئی مجھے پیدل یا وکٹن میں تنہا ہو کے کھڑا نہ دیکھ لے۔ جب میں کڑکتی دوپہروں میں پیدل ہی چلتا رہتا تھا لیکن میں یہ جانتا تھا کہ شدید گرمی میں بھی کارپوریٹ دنیا میں لوگ سوٹ اور ٹائی پہنتے ہیں۔ لہٰذا میں بھی کوشش کر کے وہی پہنتا تھا اور ملاقات سے پہلے اس کمپنی کے واش روم میں جا کے کتنی دیر اپنے پسینے سکھاتا، حلیہ درست کرتا اور پھر ان کے کانفرنس روم میں ایسے دکھائی دیتا جیسا وہ مجھے دیکھنے کی توقع کرتے تھے۔

میں ہر روز سر اُٹھا کے جینے کا عزم کرتا رہا، زندگی ہر روز بڑی بے دردی سے مجھے پچھاڑتی رہی۔ میں ہر نئی صبح ایک نئے جذبے کے ساتھ نئی منزلوں کی تلاش میں نکل پڑتا۔ زندگی ہر شام میرے قدموں کے ساتھ ناکامیوں کا بوجھ باندھ کر مجھے "اپاہج" بنانے کی تیاری کرتی رہی۔ ہر نئے دن میں خود کو شاندار کل کی نوید سناتا اور ہر رات میری سسکیوں کی گواہ بنتی۔ ناکامیاں، محرومیاں، جھڑکیاں، افسردگیاں، نامرادیاں، مایوسیاں میرا گھیراؤ کر لیتیں۔

مجھے اپنے مرحوم والد کی شاباش بھری سرگوشیاں خوابوں میں سنائی دیتیں۔ "گرنا بری بات نہیں ہے، گر کے رہنا اور دوبارہ نہ اُٹھنا بری بات ہے۔" اگلی صبح میں ناکامیوں کے سارے وار، درد کی ساری ٹیسیں، حوصلہ شکنی کے سارے جملے بھلا کر "سر اُٹھا کے جینے" کے عہد کی تجدید کرتا۔ اپنی زندگی کی "باگیں" اپنے ہاتھوں میں رکھنے کا عزم کرتا اور نکل پڑتا سر اُٹھا کے جینے کے سفر پہ۔

ایسا نہیں کہ اگلے ہی دن میرا سفر وسیلہ ظفر بن جاتا۔ اُس دن درد کی شدت پہلے سے بھی بڑھ جاتی۔ شام کو شکستہ حال، نامراد اور ناکامیوں کے بوجھ سے لدا ہوا کسی بس سٹاپ پر کھڑا جیب سے ساری جمع پونجی نکال کے گن رہا ہوتا۔ بس میں بیٹھنے کے پیسے پورے نہ ہونے کے باعث کسی انجان منزل کی طرف تھکن سے چور پیدل ہی چل پڑتا۔

رات تک سر اُٹھا کے جینے کی آرزوئیں آخری سانسوں پر پہنچ جاتیں۔ پے در پے ناکامیاں جذبوں، لگن اور ہمت کو امتحان میں ڈال دیتیں۔ میں سوچتا "آج تو حد ہو گئی۔ میری بس ہو گئی ہے۔ اب اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔" پھر دور کہیں سے شاباش کی سرگوشیاں، اپنے ساتھ لیے وعدے، اور 764 خواب مجھے اپنی طرف کھینچتے۔ سر اُٹھا کے جینے کی آرزو ایک بار پھر پوری آب و تاب سے انگڑائی لیتی، دل ولولے سے بھر جاتا، آنکھوں میں چمک آ جاتی اور جذبوں کو ایک نئی جلا مل جاتی اور میں اپنے خوابوں کے تعاقب میں دل و جان سے نکل کھڑا ہوتا۔ پھر ایک دن ایسا آیا جب برسوں کی ریاضتیں رنگ لے آئیں۔ زندگی سر اُٹھا کے جینے کی ڈگر سے شناسا ہو گئی اور بالآخر ایک دن سب کچھ بدل گیا۔

زندگی بدلی تو بہانوں کی زنجیریں توڑنے سے، زندگی نے سر اُٹھا کے جینا شروع کیا تو اپنا بوجھ خود اُٹھانے کا فیصلہ کرنے سے، زندگی بہتر ہوئی تو الزامات سے توبہ کرنے سے، زندگی بدلی تو شکایت کے پلندے کو سمیٹنے، ذمہ داری اٹھانے سے، خود انحصاری سے، اپنی ذات پر بھروسہ کرنے سے اور یہ طے کرنے سے کہ 100 فیصد ذمہ داری اُٹھانے سے ہی فرق پڑے گا۔ 99 فیصد ذمہ داری اُٹھانے سے کچھ نہیں بدلے گا۔

تو کیا آج سے آپ اپنی زندگی کی 100 فیصد ذمہ داری اُٹھائیں گے؟ یہی تیاری، یہی عہد، یہی فیصلہ، یہی تہیہ، یہی عزم دراصل سر اُٹھا کے جینے کی طرف آپ کا پہلا قدم ہے۔ تو کیا آپ سر اُٹھا کے جینے کے لیے تیار ہیں؟

(قیصر عباس کی نئی کتاب "سر اُٹھا کے جیو" سے ایک باب)

٭٭٭

میں عامل کیوں بنا؟

محمد افضل رحمانی

قسط: 1

اچانک اس کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکل کر تیزی سے میرے دماغ میں داخل ہونے لگے۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے جسم میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اپنی نظریں اس کی آنکھوں سے ہٹالوں لیکن ایسا کرنا میرے بس سے باہر ہو گیا تھا۔

درس

نظامی کی تکمیل کے بعد میں فوج میں بطور خطیب بھرتی ہو گیا تھا اور کئی سال وہاں بطور خطیب فرائض انجام دیتا رہا ہماری یونٹ انفنٹری والوں کی تھی کرنل صاحب سے میرے دوستانہ تعلقات تھے اور اُن کے گھر میرا آنا جانا رہتا تھا۔ الحمدللہ قرآن و حدیث کے علاوہ تاریخ اسلام کا مطالعہ میری ہابی تھی ذہن درمیانہ اور فنِ خطابت سے لگاؤ تھا لہٰذا پوری چھاؤنی میں میرے اندازِ بیان کا چرچا تھا اور دوسری یونٹوں سے کافی آفیسرز اور جوان بطور خاص میری اقتداء میں جمعہ پڑھنے آیا کرتے تھے میں ماحول کے مطابق بہادرانِ اسلام کے واقعات اور اسلامی جنگوں میں ان کے کارنامے خاص انداز سے بیان کیا کرتا تھا۔

1965ء کی جنگ کا جذبہ ابھی جوانوں کے دلوں میں موجود تھا۔ فوج اور قوم بھارت کو ایک مکار دشمن کے طور پر جانتے اور سمجھتے تھے آج جو لیڈر مذاکرات کی میز کو جنگ پر ترجیح دیتے ہیں میں اُن کے خیالات سے اختلاف تو نہیں کروں گا کیونکہ مذاکرات جنگ سے کہیں بہتر اور نتیجہ خیز ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارا دشمن مذاکرات کی آڑ میں کیا گل کھلا رہا ہے؟ بہرحال اس وقت میرا یہ موضوع نہیں ہے۔ فوج سے مستعفی ہونے کی وجہ میری والدہ مرحومہ کا اصرار تھا کہ میں اپنے آبائی گاؤں میں آ جاؤں لہٰذا ان کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں گاؤں آ گیا اب میں فوج کی پابندیوں اور حدود سے آزاد ہو گیا تھا۔

میں جھوٹے پیروں اور جعلی عاملوں سے ہمیشہ سے بدظن ہوں! لہٰذا میرے خطبات اور تحریروں میں ان لوگوں کے رد میں کافی مواد موجود ہوتا ہے۔ جب میں نے اپنی تقریروں اور دروس میں ان لوگوں کا پُرزور طریقے سے رد کیا تو علاقے کے جھوٹے پیروں اور ان کے چیلوں چانٹوں کا معتوب بن گیا لیکن میں کسی کی پیری اور چودھراہٹ کو خاطر میں نہ لایا اور جس بات کو حق سمجھا ڈنکے کی چوٹ پر بیان کرتا رہا! اَن پڑھ دیہاتی اور پس ماندہ لوگ جن کو جھوٹے پیروں اور نام نہاد عاملوں نے اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا آہستہ آہستہ اُن کے ذہن حقیقت اور سچائی کو قبول کرنے لگے اور وہ کھرے کھوٹے کی پہچان کرنے کے قابل ہونے لگے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ انسان بالطبع مظہر ضدین اور جامع نقیضین ہے یہ ظلماتی بھی ہے نورانی بھی، ملکوتی بھی ہے ناسوتی بھی، رحمانی بھی ہے شیطانی بھی، عالم بھی ہے جاہل بھی، عادل بھی ہے ظالم بھی، عاقل بھی ہے غافل بھی، سعید بھی ہے شقی بھی، فاسق بھی ہے متقی بھی، ضار بھی ہے نافع بھی، حریص بھی ہے قانع بھی، ظلوم وجہول بھی ہے علوم وجہول بھی، صبور و شکور بھی ہے شرور و کفور بھی، رؤف و کریم بھی ہے، قسی و لئیم بھی، غرضیکہ اس میں محاسن بھی ہیں معائب بھی، محبوب بھی ہیں کمالات بھی، یہ اپنی صفات اور کمالات کو بروئے کار لا کر عبدالشیطان بھی بن سکتا ہے اور بندہ رحمٰن بھی۔

یوں تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو کئی صلاحیتیں عطا رکھی ہیں۔ مگر میرے خیال میں سب سے قیمتی نعمت اور صلاحیت علم ہے بلکہ یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر انسان اور حیوان میں فرق ہوتا ہے ورنہ معدہ اگر انسان کے پاس ہے تو حیوان کے پاس بھی ہے۔ کان، آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، اگر انسان کے پاس ہیں تو حیوان کے پاس بھی ہیں۔ بے علم آدمی تو خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اور ہماری اسی لاعلمی نے ہمیں ان نقلی عاملوں اور جعلی پیروں کے جال میں پھانس رکھا ہے۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان علماء سوء اور کاروباری اور جاہل پیروں کے ہاتھوں اٹھانا پڑا ہے۔ اور دنیا میں پھیلنے والی اکثر گمراہیوں اور بدعقیدگیوں

کے آخری سرے پر آپ کو کوئی نہ کوئی مذہبی دکاندار کوئی نہ کوئی علم فروش کوئی نہ کوئی نقلی اور جعلی پیر ہی دکھائی دے گا۔ یہاں میں علمائے حق اور مشائخ حق کی بات نہیں کر رہا وہ تو کائنات کی جان ہیں اگر علمائے حق اور مشائخ حق نہ ہوتے تو دنیا اندھیر نگری کے سوا کچھ بھی نہیں تھی!

ایک جادوگر سے مقابلہ

ایک گھر میں باورچی بہترین پکوان بنوانے میں مصروف تھا۔ گھر کی خواتین بڑی پھرتی اور نفاست سے گھر کی صفائی کرنے میں مصروف تھیں۔ چارپائیاں بچھا کر اُن پر صاف ستھری چادریں اور سرہانے رکھے جا رہے تھے گھر کی صفائی کے ساتھ ساتھ خواتین وحضرات خود بھی صاف ستھرے لباس پہن کر تیار ہو رہے تھے۔ میں کسی کام سے اس طرف گیا تو میرے قدم خودبخود اُس گھر کی طرف اٹھ گئے! مجھے دیکھ کر خواتین وحضرات نے میرا استقبال کیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں نے پوچھا بھئی آج بڑے کھانے پک رہے ہیں اور گھر کی صفائیاں ہو رہی ہیں کیا کوئی فنکشن ہونے والا ہے!

جی قاری صاحب آج ہمارے پیر تشریف لا رہے ہیں آپ خود ہی آ گئے ہیں ہم آپ کو پیغام بھیجنے والے تھے آج شام کا کھانا آپ ہمارے ہاں کھائیں اور پیر صاحب سے ملاقات بھی کریں بس جی بڑے اللہ لوگ ہیں انہیں دیکھ کر آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ میں نے اُن کی دعوت قبول کر لی۔

عصر کے بعد پیر صاحب تشریف لائے اُن کے ساتھ ایک کالی کلوٹی لڑکی بھی تھی اور بیس کے قریب دوسرے ہمراہی بھی۔ لڑکی انسانی مخلوق سے زیادہ جناتی مخلوق دکھ رہی تھی اس کے گہرے سیاہ رنگ پر سفید دانت طبیعت میں تکدر پیدا کر رہے تھے انسان اتنا خوفناک بھی ہو سکتا ہے؟ پیر کا سر منڈھا ہوا تھا صرف بالوں کی ایک لمبی لٹ تھی جو اس کے کندھوں پر جھول رہی تھی پیر صاحب صرف ایک لنگوٹ پہنے ہوئے تھے اور بمعہ سر سارے جسم پر راکھ ملی ہوئی تھی۔ پیر صاحب کو ایک صاف وشفاف چادر سے ڈھکے پلنگ پر بٹھایا گیا اور دوسری طرف وہ کالی کلوٹی لڑکی ایک ادائے خاص سے بیٹھ گئی وہ جب مسکراتی تو خوف کی ایک سرد لہر جسم میں سرایت کر جاتی۔ پیر صاحب اس کی طرف محبوبانہ انداز میں دیکھتے تو اس کے شرمانے کے انداز سے محظوظ ہوتے۔ پتہ نہیں وہ میاں بیوی کے رشتے میں منسلک تھے یا ویسے ہی عاشق ومعشوق تھے۔ میں نے غور سے پیر صاحب کے سراپا کا جائزہ لیا وہ داڑھی مونچھ منڈے روڈ موڈ سے تھے لیکن بغلوں کے بال ایک بالشت سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور زیر ناف بال اُن کی لنگوٹی سے باہر جھول رہے تھے۔ اَن پڑھ دیہاتی جھک جھک کر پیر صاحب کو سلام کرتے اور اُن کے ہاتھ چومتے۔ میں لوگوں کی جاہلیت اور اندھی عقیدت سے اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ میری طبیعت میں انقباض پیدا ہو گیا تھا ڈھول والے نے ڈھول بجانا شروع کیا اور پھر دھمال شروع ہو گئی وہ دھما چوکڑی مچی کہ شیطان شاد وفرحاں ہو گیا ہوگا۔

ذرا دیر بعد وہ کالی کلوٹی لڑکی اٹھی اور ایک جھٹکے سے اتنی تیزی سے اچھل کر مکان کی چھت پر چلی گئی وہاں سے چھلانگ لگائی تو اگلے مکان پر اس طرح کئی مکانوں کو پھلانگتی ہوئی واپس اسی صحن میں کود گئی اس کی یہ شعبدہ بازی دیکھ کر دیہاتی عورتیں ایک دوسری کے منہ کر کے کہنے لگیں یہ سب سرکار کی دین ہے وہ اس لڑکی پر بڑے مہربان ہیں۔ میری چھٹی حس محسوس کر رہی تھی کہ اس لڑکی میں کوئی چیز ہے جو بادی النظر میں میرے دماغ میں کھٹک رہی تھی وہ میری طرف قہر آلود نظروں سے بار بار دیکھتی لیکن میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر

ہر بار نظریں جھکا لیتا ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی تیز چمکیلی آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہوں۔ میں بڑی مشکل سے اس کی نظروں کے حصار سے باہر نکلتا اور پھر میرا جی چاہتا کہ دوبارہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ملا دوں اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی خوبصورت لڑکی تھی بلکہ وہ ایک کریہہ المنظر اور ڈراؤنی شکل و صورت کی مالک تھی بعض چھوٹے بچے اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ماؤں کے کندھوں پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتے تھے اور بعض رو رہے تھے میں اس وقت روحانی علوم سے بالکل بے بہرہ تھا لیکن مجھے بعض قرآنی آیات کے فوائد و خواص معلوم تھے۔ میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک لگائی وہ لڑکی پیر کے قریب ہوگئی اور پھر اس کے کان میں کوئی بات کی پیر نے گھور آنکھوں سے میری طرف دیکھا میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی نے میرے بارے میں ہی کوئی بات کی ہے۔

جعلی پیر کی آنکھوں میں بھی وہی چیز تھی جو اس لڑکی کی آنکھوں میں تھی مقناطیسی کشش معمول کے جسم میں گدگدی پیدا کر دینے والی جس سے انسانی روح نڈھال ہو جاتی تھی۔ میں اس وقت اس صورت حال کی توجیہہ کرنے سے قاصر تھا البتہ بعد میں جب میں نے باقاعدہ عملیات سیکھے اور روحانی علوم کے بارے میں مختلف کتابیں پڑھیں تو مجھے کوئی شک و شبہ نہ رہا کہ وہ پیر اصل میں جادوگر تھا اور پھر مجھے اندازہ ہوا کہ جو لوگ روحانی علوم سے بے بہرہ ہیں اُن کا ان جعلی پیروں کے جال میں پھنس جانا اتنا حیران کن نہیں! کیونکہ عوام کالانعام مکار جادوگروں کے شعبدوں سے اتنے متاثر ہو جاتے ہیں کہ بعض سمجھانے کے باوجود الٹا بحث کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں کہ فلاں بزرگ خدا رسیدہ ہے اور اُس سے کئی کرامتیں ظاہر ہوئی ہیں انہیں لاکھ سمجھائیں کہ بھائی وہ نماز نہیں پڑھتا روزہ نہیں رکھتا بھنگ اور شراب پیتا ہے غیر ضروری بال صاف نہیں کرتا غیر شرعی حرکات کرتا ہے اس میں ایک بات بھی بزرگوں والی نہیں لیکن وہ اسے ایک مافوق الفطرت ہستی قرار دینے پر کئی من گھڑت کرامتیں اس کی طرف منسوب کر کے اس کی اولیائی کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میرا ذہن انہی باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک وہ لڑکی اٹھی اور تیزی سے میرے قریب آئی اور میرے گال پر چٹکی بھر کے اُسی پھرتی سے واپس بھاگ گئی عورتوں اور مردوں نے تالیاں پیٹنا شروع کر دیں مجھے اپنی ہتک محسوس ہوئی کچھ فوجی ذہن دوسرے طبیعت کی تیزی تیسرے جوانی کا دور میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا اور اس کے قریب ہو کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے رخسار پر مارا۔ وہ چکرائی پھر ساتھ والی دیوار سے ٹکرائی اور پھر زمین پر گر گئی اس کا گھاگرا نما پاجامہ پیچھے سے کھلا تھا اوپر اٹھا تو میں نے دیکھا وہ لڑکی نہیں لڑکا تھا یہ بس ایک ٹھٹھے کے لیے ہوا میرے خیال میں کسی اور نے یہ منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اٹھا اور مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی میں نے جلدی سے بائیں ہاتھ سے اس کے پیٹ میں زوردار مکا دیا درد کی شدت سے جوں ہی وہ بائیں طرف جھکا میں نے ایک کراٹے کا وار اس کی گردن پر کیا وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گرا اور بے سدھ ہو گیا!

"ادھر دیکھو!" پیر نے بلند آواز سے کہا غیر ارادی طور پر میں نے پیر کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکل رہے ہوں اور تیزی سے میرے دماغ میں داخل ہو رہے ہوں میں نے بڑی کوشش کی کہ اپنی نظریں جھکا لوں یا ادھر اُدھر پھیر لوں لیکن ایسا کرنا میرے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میرے سارے جسم پر

چیونٹیاں رینگ رہی ہیں میں نے دونوں ہاتھوں سے جسم کے مختلف حصوں پر خارش کرنی شروع کر دی لیکن یہ عجیب قسم کی خارش تھی کہ میں کبھی جھک کر پاؤں پر خارش کرتا کبھی کھڑا ہو کر جسم کے مختلف حصوں پر خارش کرتا تھا میرے دماغ میں ایک خیال آیا میں نے اسمائے حسنہ سے ایک مبارک نام کا ورد شروع کر دیا" یا حافظ یا حفیظ" جلد ہی میری یہ کیفیت دُور ہو گئی اب پیر کی آنکھوں کی مقناطیسیت بھی ختم ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شرارے بھی ختم ہو گئے لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ میرا دل چاہنے لگا کہ پیر کی آنکھوں کی مقناطیسیت دوبارہ واپس آ جائے اور میں ایک دفعہ پھر اسی کیفیت میں مبتلا ہو جاؤں! پیر نے اس کے بعد کافی کوشش کی لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ لڑکے کو شاید ہوش آ گیا تھا اس نے میری بے خبری میں مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی لیکن پیر نے بلند آواز سے کہا! رُک جاؤ! میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ لڑکا میرے قریب آ گیا تھا میں نے اسے مارنے کے لیے جوں ہی ہاتھ اٹھایا کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا اور میری منت سماجت کرنے لگے! میں نے اُسے مارنے کا ارادہ بدل لیا اور غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اس کی آنکھوں کی مقناطیسیت بھی ختم ہو چکی تھی!

سنو بالک ان کے قدم چھو کر واپس میرے پاس آ جاؤ۔" پیر نے ذرا بلند آواز سے کہا! لڑکے نے پیر کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔" ہاں ہاں جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو! لڑکا جھکا اور میرے پاؤں چھو کر واپس پیر کے پاس چلا گیا!

میری والدہ مرحومہ نے پیر کے ساتھ میرے پھڈے کا سنا تو مجھے بلا بھیجا جب میں گھر واپس آیا تو والدہ مرحومہ مجھ پر برس پڑیں اور میری خوب خبر لی اور پھر ناصحانہ انداز میں مجھے سمجھانے لگیں کہ دیکھو ان اللہ والے لوگوں کے ساتھ جھگڑا وغیرہ نہیں کرنا چاہیے یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

پر اماں کوئی اللہ والا ہو تو سہی یہ تو کوئی فراڈیا ہے!

ہائے توبہ بیٹا ایسا نہیں کہتے ویسے بھی اوتر گھتر کی بددعا لگ جاتی ہے!

دیکھو اماں آپ حوصلہ رکھیں مجھے ان کی کوئی بددعا نہیں لگے گی۔

چلو بس ٹھیک ہے اب تم اس گھر نہیں جاؤ گے اماں نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

ٹھیک ہے اماں میں نہیں جاؤں گا۔ پھر اچانک میرا خیال پیر کی آنکھوں کی مقناطیسیت کی طرف چلا گیا یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھے اپنی نظروں کے حصار میں لینے کی کوشش کی تھی اس سے پہلے کہ میں آپ کو آئندہ پیش آنے والے چند واقعات سناؤں آپ اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ آنکھوں کی مقناطیسیت کیا ہوتی ہے آیا یہ کوئی اولیائی کی کرامت ہے یا شعبدہ بازی ہے؟ کسبی ہے یا وہبی ہے؟

علامہ انور شاہ صاحب کاشمیریؒ کا واقعہ

آپ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کشمیر سے یہاں کے لیے چلا۔ کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنی پڑی راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر کے مرید تھے یہ مجھ سے اپنے پیر کے کمالات و کرامات کا تذکرہ کرتے رہے اُن کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی اُن پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں پڑتا تھا میں نے بھی ارادہ کر لیا جب ہم دونوں پیر صاحب کی خانقاہ پر پہنچے تو اُن صاحب نے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے ان

بزرگ نے اطلاع پا کر خود اپنے صاحبزادے کو مجھے
لینے کے لیے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے خود ایک تخت
پر بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مریدین وطالبین نیچے فرش
پر تھے مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ کچھ
باتیں ہوئیں اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ
ہوئے اور اپنے طریقہ پر اُن پر توجہ ڈالنی شروع کی اور
اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے
میں یہ سب دیکھتا رہا پھر میں نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ
اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر بھی توجہ
فرمائیں۔ انہوں نے توجہ دینا شروع کی اور میں اللہ
تعالیٰ کے اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا۔ بے
چاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی لیکن مجھ پر
کچھ اثر نہ ہوا کچھ دیر بعد انہوں نے خود ہی فرمایا کہ آپ
پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اس کے بعد
ایک غیر معمولی جوش سے فرمایا! کچھ نہیں ہے لوگوں کو
متاثر کرنے کے لیے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی
نہیں معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے ان
باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں! پھر اسی سلسلہ
میں اسی جوش کی حالت میں فرمایا:

اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن
میں یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز
سنائی دینے لگے لیکن یہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے اصل چیز تو
احسانی کیفیت اور شریعت وسنت پر استقامت ہے!

پھر آپ سوچیں گے کہ آخر پھر یہ ہے کیا! تو یہ عقدہ
صاحب تجدید وسلوک نے حل کر دیا! آپ فرماتے ہیں
کہ توجہ وتصرف نہ کوئی مقصود و مامور امر ہے نہ فی نفسہ
کوئی کمال وقرب اور ولایت ومقبولیت کی علامت۔
بلکہ نفسِ حیات کی ایک قوت ہے جو خیال وتوجہ کی یکسوئی
کی مشق سے مقبول کیا مردود سے مردود شخص بھی حاصل
کر سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں سحر یا جادوگری اور آج
کل مسمریزم اور عمل تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار بھی ہے
اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر کوئی اثر ڈالنے کا نام
صوفیوں کی توجہ یا تصرف ہے لیکن یہ کوئی دینی کمال نہیں
نہ مقبول ومقرب ہونے کی علامت ہے ہر فاسق وفاجر
بھی مشق سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر سکتا ہے۔
(تجدید تصوف وسلوک صفحہ 93,92)

چنانچہ بزرگی کا معیار لوگوں نے یہ بھی تراش رکھا
ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے اور
زمین پر پٹک دے وہ بڑا بزرگ ہے!

بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کام کو ترک
کرنے کا مشورہ دیا ہے کیونکہ اس کے استعمال سے بعض
دنیوی اور دینی نقصانات ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں
کہ دنیوی نقصان تو اس میں یہ ہے کہ اس کے کثرت
استعمال سے عامل کے دماغی وقلبی قویٰ ضعیف ومضمحل ہو
جاتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے
کا خطرہ رہتا ہے!

اور مولانا کی یہ بات میرے تجربے میں بھی آئی
ہے میرے پاس کئی ایسے بیمار آئے جو کسی پیر کے کہنے پر
توجہ ویکسوئی کی مشق کرتے تھے اور چلے وغیرہ کاٹتے تھے
سخت دماغی محنت کی وجہ سے وہ جنون میں مبتلا ہو گئے تھے
جسے ہمارے ہاں چلہ الٹا پڑ گیا کہتے ہیں۔ حقیقت میں
چلہ الٹا نہیں پڑتا بلکہ دماغ وقلب میں کمزوری اور ضعف
بڑھ جاتا اور خشکی کی زیادتی کی وجہ سے مرض سودا پیدا ہو
جاتا ہے۔ یہ تو خیر ایک فضول حرکت ہے جس میں کئی
لوگ نہایت معمولی خوراک پر اکتالیس دن سخت ترین
دماغی محنت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تو نبی کریم ﷺ کو
ساری رات عبادت کرنے سے منع فرما دیا تھا دیکھیں
سورۂ مزمل! اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک صحابی
کو ساری رات جاگ کر عبادت سے منع فرما دیا تھا اور

ایک صحابیؓ کو متواتر روزے رکھنے سے منع فرما دیا تھا۔

(بخاری شریف)

مگر آج کل تو یہ مراقبے اتنی اہمیت اختیار کر چکے ہیں کہ باقاعدہ مراقبہ ہال تعمیر ہو چکے ہیں جہاں مرد و خواتین مخلوط مراقبے بھی کرتے ہیں اور پھر یہ مراقبے اتنے پیچیدہ اور مشکل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان کے ذہن پر بہت بوجھ ڈالا جاتا ہے ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے ذہن سے تمام موجودہ خیالات نکالنے کی کوشش کرو اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ہستی کا تصور کر لو۔ کسی کو پیر، بزرگ وغیرہ کے دیدار کا مراقبہ کرایا جاتا ہے کسی کو فرشتوں، شیطانوں کا، کسی کو ماضی کا، کسی کو مستقبل کا، کسی کو ملاء اعلیٰ کا، کسی کو آخرت، جنت اور جہنم کا، پھر ستم یہ ہے کہ یہ مراقبے ایک آدھ مرتبہ نہیں بلکہ بے شمار مرتبہ کروائے جاتے ہیں حتیٰ کہ مراقبہ کرنے والے کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے سوتے جاگتے وہی چیز نظر آنے لگتی ہے جس کا اسے مراقبہ کروایا جا رہا ہوتا ہے دراصل یہ حقیقت نہیں ہوتی بلکہ محض خیالات و تصورات ہوتے ہیں جو اس کے ذہن میں ڈالے جاتے ہیں یا جو وہ خود ہی ذہن میں بٹھا لیتا ہے یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جس طرح کسی بچے کے ذہن میں کسی چیز کا خوف بٹھا دیا جائے تو وہ سوتے جاگتے اسی چیز کو دیکھتا، خیال کرتا اور ڈر اور خوف کا اظہار کرنے لگتا ہے۔

ریاض احمد گوہر شاہی کا طریقہ کار

یہ شخص اب تو فوت ہو چکا ہے۔ آپ نے اخبارات میں اس کے بارے میں پڑھا ہوگا اس نے کبھی مسیح اور کبھی امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور عجیب و غریب شرکیہ عقائد کی تشہیر کی اس کے ان باطل دعاوی پر اہل علم نے اس پر کافر و مرتد ہونے کا فتویٰ لگایا! اس کا طریقہ واردات مختصر ملاحظہ فرمائیں اس کا دعویٰ اور ترغیب تھی کہ "اللہ کی پہچان اور رسائی کے لیے روحانیت سیکھو! خواہ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہے" اور پھر اس نے اللہ کی پہچان کے لیے جو طریقہ کار تجویز کیا وہ مضحکہ خیز بھی ہے اور حیران کن بھی! وہ لکھتا ہے:

1-ایک چھوٹے بلب پر پیلی روشنائی سے "اللہ" لکھیں اور رات سونے سے پہلے کچھ دیر اس کو بغور دیکھیں۔ اس عمل کو کرنے کے کچھ دن بعد ہی آپ دیکھیں گے کہ اللہ کا نام آپ کی آنکھوں میں جھلملا رہا ہے اب آپ بلب یا اللہ کے لکھے ہوئے نام کو دیکھنا بند کر دیں۔ اب اس نام کو بہت توجہ اور ارتکاز سے کوشش کریں کہ یہ نام آپ کو اپنے دل پر نظر آئے جب آپ اپنے دل پر اسم اللہ لکھا دیکھیں تو آپ محسوس کریں کہ آپ کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی ہے۔

2-اپنے دل کی دھڑکن کے ساتھ آپ پوری توجہ سے اللہ اللہ پڑھیں اس طریقہ کے عملی نمونہ سے کچھ ہی دنوں میں آپ محسوس کریں گے کہ آپ کا دل صرف دھڑک ہی نہیں رہا بلکہ وہ اللہ کے نام سے گونج رہا ہے۔

3-رات کو سونے سے پہلے ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ دیر تک اپنے دل کے مقام پر اللہ لکھیں اور لکھتے وقت تصور کریں کہ آپ کا پیر و مرشد، امام، روحانی استاد، گرو، جو بھی آپ کے مذہب میں ہو یا کوئی بھی ایسا شخص جس پر آپ کو اعتماد ہو وہ آپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے اور اللہ لکھ رہا ہے۔ اب جو بھی ہستی آپ کے سامنے آئے وہی اللہ کی طرف سے آپ کی رہنمائی کے لیے بھیجی گئی ہے۔ اب اپنی روحانی ترقی کے لیے آپ اس ہستی کو تلاش کریں جو آپ کے سامنے آئی تھی اگر آپ کے سامنے کوئی نہ آئے تو تصور کریں کہ میں (ریاض احمد گوہر شاہی) ہوں آپ مجھ سے رابطہ کریں!

یوں تو اس نے اور بھی بہت ساری خرافات لکھی

ہیں مگر عدالت کے خوف سے اُن کو چھوڑ رہاں ہوں بطور نمونہ اتنا ہی کافی ہے اسے پڑھ کر آپ خود ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا اللہ تک رسائی کا یہ طریقہ اسلامی تعلیم سے کوئی تعلق رکھتا ہے یا اللہ کے رسول ﷺ نے اسلام کی تبلیغ یا اللہ کی طرف بلانے کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا ہو یا صحابہ کبارؓ کو اس قسم کے مراقبے یا چلے کرائے ہوں۔ مگر افسوس تو اُن لوگوں پر ہے جو نہایت جلد اور آسانی سے ان جیسے لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اس قسم کی حرکتیں اپنے ذاتی مفاد کے لیے کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں سیدھے سادے اَن پڑھ اور دین سے بے خبر اور اندھے عقیدت مند بہت جلد ان کے دامِ تزویر میں گرفتار ہو جاتے ہیں پھر نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے اور یاد رکھیں ان کاموں میں شیطان بھی دلچسپی لیتا ہے اور ایسے لوگوں کو مزید گمراہ کرنے کے لیے اپنے دعوے تیز کر لیتا ہے کبھی خواب میں آ کر اسے وہ صورتیں دکھاتا ہے جن کا وہ مراقبے میں تصور کرتا ہے اور کبھی بیداری کی حالت میں آ کر اسے احساس دلاتا ہے کہ جس ہستی کا وہ مراقبے میں تصور کرتا ہے وہ میں ہی ہوں حتیٰ کہ بعض کے ساتھ شیطان گفتگو بھی کرتا ہے اس سطح پر پہنچ کر انسان یا تو مخبطی ہو جاتا ہے یا پاگل اور پھر اس کے لیے راہِ حق کی طرف پلٹنے کے دروازے تقریباً بند ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے علاوہ سب کو غلط سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

ارتکازِ توجہ اور مراقبوں کا دینی نقصان

دو صفحات پیچھے آپ نے مولانا اشرف علی تھانوی کا مشورہ پڑھ لیا کہ اگر کوئی پیر یا عامل اس قسم کی حرکتیں کرتا ہے تو اسے چھوڑ دینی چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے کئی قسم کی جسمانی اور ذہنی بیماریاں لگ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دینی نقصان یہ ہوتا ہے کہ عوام اس کو ولایت اور بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں جو اعتقادی ضرر ہے اور جس پر یہ عمل کیا جاتا رہا ہو وہ اسی پر قناعت کر بیٹھتا ہے اور اصلاح کا عمل چھوڑ دیتا ہے یہ عملی ضرر ہے مولانا لکھتے ہیں ان مضرتوں کی وجہ سے محققین نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔

(دیکھیں تجدید تصوف و سلوک صفحہ 96)

یہ باتیں چونکہ بہت گہرائی کی ہیں اور پیچیدہ بھی عام لوگ شاید نہ سمجھ سکیں البتہ اتنا تو آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ یہ دینی چیزیں ہرگز نہیں ہیں چونکہ بعض عامل حضرات نے باقاعدہ ان کی ٹریننگ لی ہوتی ہے اور وہ کچھ شعبدہ بازیاں دکھا کر عوام الناس کو دھوکے میں ڈال دیتے ہیں اور درویشانہ چال ڈھال اختیار کر کے اولیائی کے دعوے کرتے ہیں خود تو گمراہ ہوتے ہی ہیں سادہ لوح لوگوں کو بھی اندھے کنویں میں دھکیل دیتے ہیں! بعض دفعہ یہ عامل حضرات علم قیافہ، مسمریزم، ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم، فراست الید (پامسٹری) علم جعفر اور علم نجوم کی بھی تھوڑی بہت شد بد رکھتے ہیں اور ان علوم کی مدد سے اپنے گاہکوں کو ذہنی طور پر اپنا مطیع اور غلام بنا لیتے ہیں اور پھر جو چاہتے ہیں اُن کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد پیر اپنی مریدنیوں سے معانقہ کرتے، بغل گیر ہوتے، پاؤں دبواتے، بوس و کنار کرتے اور دیگر جنسی خدمات لینے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتے اس قسم کے کئی واقعات اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے۔ بعض پیروں اور عاملوں کے نام بھی بڑے مضحکہ خیز ہوتے ہیں مثلاً بوسے پیر! ننگا پیر، ڈنڈا پیر، کالا پیر، بگا پیر وغیرہ۔ مگر افسوس جاہل عوام تو ایک طرف رہے، اچھے خاصے پڑھے لکھے حتیٰ کہ بعض وزراء اعظم تک ان کے اڈوں پر حاضری دیتے ہیں اور ان سے ڈنڈے کھاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اُن کی قسمت جاگ جائے گی یا

وزارت عظمیٰ مل جائے گی۔

دو جعلی عاملوں کا طریقہ کار

یہ دونوں جعلی عامل سگے بھائی ہیں ان میں سے ایک کسی کے گھر جھاڑ پھونک کے لیے بلایا جاتا ہے تو یہ نہایت چالاکی سے اس گھر کے دروازوں کے پیچھے یا کسی سوراخ وغیرہ میں تعویذ رکھ دیتا ہے اور گھر کا نقشہ وغیرہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیتا ہے پھر اپنے بھائی کو نہایت احسن طریقے سے بتا اور سمجھا دیتا ہے کہ فلاں فلاں جگہ پر میں نے تعویذ وغیرہ رکھے ہوئے ہیں جب دوسرا بھائی عامل کی حیثیت سے آتا ہے تو وہ گھر کے ایک یا دو معتبر لوگوں کو لے کر ان کی موجودگی میں انہی کے ہاتھوں سے تعویذوں والی جگہ کی نشاندہی کرتا ہے جب لوگ اپنے ہاتھوں سے تعویذ نکالتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو اس کی اولیائی بلکہ خدائی کے قائل ہو جاتے ہیں اب وہ اس کے مستقل گاہک اور پکے مرید بن جاتے ہیں، یوں پیر کے مریدوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

پیر ہر حال میں سچا

ایک فریبی اور دغا باز پیر کا واقعہ ہے کہ اس کے پاس جب کوئی بے اولاد جوڑا آتا اور وہ دعا اور تعویذ کا طلبگار ہوتا تو پیر اسے تعویذ لکھ دیتا اور اگر وہ پوچھتے کہ پیر صاحب ہمارے ہاں لڑکی ہوگی یا لڑکا! تو وہ گول مول انداز میں کہہ دیتا۔ ''بیٹا نہ بیٹی'' اب اگر کچھ نہ ہوتا تو پیر صاحب ''نہ'' کو دونوں کے ساتھ ملا کر کہہ دیتے کیا میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ بیٹا ہوگا نہ بیٹی اولاد تو تمہاری قسمت میں ہی نہیں اور اگر بیٹا پیدا ہو جاتا تو ''نہ'' بیٹی کے ساتھ لگا دیتے اور کہتے بھئی ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا بیٹا ہوگا نہ کہ بیٹی۔ اور اگر بیٹی پیدا ہو جاتی تو ''نہ'' کو بیٹے کے ساتھ ملا دیتے اور کہتے کہ ہم نے تو کہہ دیا تھا بیٹا نہ بیٹی یعنی بیٹا نہیں بیٹی ہوگی۔

خوفناک سفید اژدھا

چونکہ والدہ مرحومہ نے پیر والے گھر جانے سے منع کر دیا تھا لہٰذا میں عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آ گیا۔ سونے سے پہلے میں اپنے مکان کی چھت پر گیا تاکہ محسوس کروں کہ پیر اور چیلے جانے کیا کر رہے ہیں۔ میں نے سنا کہ کوئی شخص چمٹا بجا کر گا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دوسرا آدمی جگنی گانے لگا اس کی آواز اتنی سُریلی تھی کہ جگنی رات میں اس کی سر کی لے رانجھے کی بانسری سے بھی بازی لے گئی تھی۔ مردوں کے علاوہ عورتیں اور نوجوان بچیاں اردگرد کے مکانوں کے منڈیروں پر بیٹھی اس کے گانے سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی گھنگروؤں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں جیسے کوئی گھنگھرو باندھ کر ڈانس کر رہا ہو۔ صبح کو مجھے پتہ چلا کہ وہ وہی لڑکا تھا جس نے لڑکی کا روپ دھارا ہوا تھا اس کے ڈانس کا تو پورے گاؤں میں چرچا ہو گیا تھا۔ خیر میں نے سونے کے ارادے سے چھت سے نیچے آ گیا میں جونہی اپنے بستر کے قریب آیا میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی سفید رنگ کا ایک بہت بڑا سانپ میرے بستر پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی اس نے باریک سی سسکاری بھری پھر پھن پھیلا کر مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا میں تیزی سے باہر نکلا تاکہ کوئی اوزار تلاش کروں اور کسی آدمی کو مدد کے لیے بلاؤں اتنے میں میں نے دیکھا کہ سانپ میرے پیچھے بالکل میرے قریب آ کر زمین سے تقریباً دو فٹ اوپر لہرا رہا ہے اس کا کافی حصہ زمین پر ہی تھا اس کی آنکھوں سے سرخ رنگ کے شرارے نکل رہے تھے میں اس کی آنکھوں کی مقناطیسیت کے زیر اثر آتا جا رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور مجھے جیسے ہوش آ گیا میں نے بآواز بلند

آیت الکرسی کی تلاوت شروع کر دی قرآنی طاقت کے سامنے شیطانی طاقت مات کھا گئی اژدھے کا نام ونشان باقی نہ رہا!

سفید سانپ کی حقیقت

اصل میں وہ سانپ نہیں ایک خبیث جن تھا۔ قارئین کے علم میں ایک نہایت ضروری اور اہم بات لانا اپنا فرض سمجھتا ہوں تاکہ آپ آئندہ کے لیے محتاط ہو جائیں۔ یاد رکھیں کہ بعض اوقات گھروں میں سفید سانپ نظر آ سکتا ہے اسے ہرگز نہ ماریں بلکہ اسے کہیں کہ بھائی تم جو کچھ بھی ہو یہاں سے چلے جاؤ یہ ہمارا گھر ہے یہ تمہارے رہنے کے لیے نہیں ہے۔ پھر اگر وہ دوسرے دن بھی نظر آئے تو اسے اسی طرح کہیں اور اگر تیسرے دن نظر آئے تو پھر بے شک اس کو مار دیں! پہلے دن ہی اسے نہ ماریں کیونکہ سفید رنگ کا سانپ عموماً جن ہوتا ہے۔

حدیث پاک سے ثبوت

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا! مدینہ میں کچھ جنوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لہٰذا اگر تم کوئی سانپ دیکھو تو اسے تین مرتبہ حکم دو کہ وہ چلا جائے اور اگر وہ اس کے بعد بھی نہ جائے تو اسے قتل کر دو کیونکہ وہ شیطان ہے۔

(صحیح مسلم شریف کتاب السلام حدیث نمبر 2236)

بعض روایات میں تین مرتبہ آیا ہے بعض میں تین دن!

امام ابن تیمیہؒ نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے! کہ جس طرح انسانوں کا ناحق قتل ناجائز ہے اس طرح جنات کا ناحق قتل بھی جائز نہیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں مجموعہ الفتاویٰ صفحہ 45,43,19)

امام نوویؒ فرماتے ہیں! گھر میں نظر آنے والے سانپ کو دیکھ کر اسے جانے کا حکم دینے کے لیے یوں کہا جائے! تجھے اللہ کی قسم ہے اس گھر سے نکل جا اور ہم پر سے اپنے شر کو دور رکھ ورنہ ہم تجھے مار ڈالیں گے۔

قاضی عیاضؒ کا قول ہے کہ ابن حبیب نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے میں تمہیں وہ عہد یاد دلاتا ہوں جو سلیمان علیہ السلام بن داؤد علیہ نے تم سے لیا تھا کہ تم ہمیں تکلیف نہ پہنچاؤ گے اور نہ ہی ہم پر ظاہر ہو گے امام مالکؒ کا قول ہے کہ فقط یہ کہنا کافی ہے کہ! اللہ کے واسطے میں تمہیں منع کرتا ہوں آج کے بعد کبھی ہمیں نظر نہ آنا اور نہ ہی ہمیں تکلیف پہنچانا۔

(شرح النووی صفحہ 230)

ایک دفعہ سیدہؓ کے گھر سانپ نکلا آپؓ نے اس کو مار ڈالا کسی نے کہا آپ نے غلطی کی ممکن ہے کہ یہ کوئی مسلمان جن ہو۔ فرمایا اگر یہ مسلمان ہوتا امہات المومنین کے حجروں میں کیسے آ سکتا تھا اس نے کہا آپ ستر پوشی کی حالت میں تھیں جب وہ آیا! یہ سن کر بہت متاثر ہوئیں اور اس کے فدیہ میں ایک غلام آزاد کیا۔

(مسند احمد جلد 6 بحوالہ سیرت عائشہ صفحہ 170)

سیاہ ریچھ

میں سمجھ چکا تھا کہ یہ سب شرارت اس پیر کی ہے وہ مجھے ڈرانے اور اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کر رہا تھا اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو پیر کے چرنوں میں بیٹھ کر اس سے معافی مانگ رہا ہوتا۔ لیکن قرآنی علوم کی برکت سے میں اس کے ہر وار سے بچ رہا تھا ہاں البتہ مجھے یہ بات ماننے میں کوئی ابہام نہیں رہا تھا کہ پیر اپنے فن میں پورا تھا لیکن میں اسے ایک روحانی شخصیت نہیں مان سکتا تھا کیونکہ اس کے لباس، چال، ڈھال اور عملی حالت اس بات کے متقاضی نہیں تھے وہ نہ خود نماز پڑھتا تھا نہ اپنے مریدوں کو نماز کے لیے کہتا تھا۔ سیرت وصورت کے

لحاظ سے وہ ایک بے دین شخص صاف طور پر نظر آرہا تھا۔ مجھ پر اپنی شعبدہ بازیاں آزمانے کا اُس کا مقصد یہی تھا کہ اگر میں اس کے زیر دام آ جاتا تو پورے گاؤں میں اس کی اولیائی کی دھوم مچ جاتی۔ ادھر میں یہ کوشش کررہا تھا کہ کسی طرح جاہل عوام اس فراڈیے پیر کی چالوں کو سمجھیں اور اس کے شیطانی ہتھکنڈوں سے بچ جائیں۔ میں یہی باتیں سوچتا سوچتا سو گیا۔

پھر مجھے پتہ نہیں چلا میں حالت خواب میں تھا یا بیداری میں کہ ہمارے گھر کے بیرونی دیوار پر کسی درندے کے پنجے نظر آئے وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر مجھے اس کا سر نظر آیا پھر وہ آہستہ آہستہ دیوار پر چڑھ گیا وہ ایک سیاہ رنگ کا بہت بڑا ریچھ تھا۔ ایک دو دن پہلے ہمارے گاؤں میں ریچھ کا تماشہ کرنے والے آئے ہوئے تھے سب سے پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہ تھا کہ اُن تماشہ کرنے والوں کا ریچھ فرار ہو گیا ہے۔ ریچھ بار بار ہمارے صحن میں کودنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے غرانے کی خوفناک آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میری زبردست چیخ نکلی۔ جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے دیکھا میری والدہ مرحومہ نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا ہوا تھا اور مجھے کہہ رہی تھیں افضل ہوش کرو۔ کیا ڈراؤنا خواب آیا ہے؟

ہاں اماں میں ڈر گیا تھا! جلد ہی میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا اور کہا اماں کچھ نہیں بس ڈراؤنا خواب آیا تھا! بیٹا میں کہتی تھی ناں کہ ان پیروں فقیروں سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے!

اماں پیر فقیر کا چکر یہاں کیسے آ گیا وہ پیر فقیر نہیں ہے کوئی شیطان کا چیلہ ہے! توبہ کرو بیٹا توبہ کرو! اماں میں نے کون سا گناہ کیا ہے جس سے توبہ کروں! اچھا چھوڑیں مجھے سونے دو میں نے لیٹتے ہوئے کہا! حیرانگی کی بات یہ ہے کہ صبح دیوار کی اُس جگہ پر میں نے دیکھا کہ ریچھ کے پنجوں کے نشان موجود تھے جس کی میں آج تک کوئی توجیہہ نہیں کر سکا۔

پیران پیر کی زیارت

صبح کی نماز پڑھ کر میں باہر نکلا تو اور باتوں کے علاوہ اس بات کا بھی چرچا تھا کہ رات کو پیر نے پیران پیر کی زیارت عام لوگوں کو کرائی ہے میں جس سے اس بات کے متعلق پوچھتا وہ ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ سبحان اللہ جی رات پیران پیر کی زیارت کی ایمان تازہ ہو گیا پیران پیر کے چہرے پر نور خداوندی تھا۔ میں نے اس واقعے کی نوعیت ایک سمجھدار آدمی سے پوچھی تو اس نے بتلایا کہ پیر ایک ایک فرد کو اندر جانے کی اجازت دیتا تھا اور پھر باری باری سب لوگوں نے زیارت کی اس سے زیادہ کوئی بھی کچھ نہ بتا سکا یہ ایک نیا جال تھا جو اس نے پھیلا دیا تھا۔ میں نے پیر سے ملاقات کا ارادہ کر لیا اور غیر اختیاری طور پر میرے قدم اس گھر کی طرف اٹھ گئے۔ جب میں اندر داخل ہوا تو پیر نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ میں اس کی کریہہ شکل دیکھ کر اندر ہی اندر بدمزگی محسوس کرنے لگا لیکن میں نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا پیر صاحب۔ آپ کے سانپ اور ریچھ تو میں نے دیکھ لیے کچھ مزہ نہیں آیا براہ کرم مجھے پیران پیر کی زیارت کرا دیجئے میں اسی مقصد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

پیر کے چہرے پر ندامت اور احساس شکست کے تاثرات واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ جھٹ سے بولا قاری صاحب پیر صاحب کی زیارت کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے مجھے افسوس ہے کہ اس وقت آپ کو زیارت نہیں ہو سکے گی۔

ٹھیک ہے مجھے وقت بتادیں میں اس وقت حاضر ہوجاؤں گا۔

مشکل ہے، میرا خیال ہے آج ہم چلے جائیں گے آپ کسی وقت ہماری درگاہ پر آئیں آپ کو پیران پیر کے علاوہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی زیارت بھی کرادیں گے۔

میرا جی چاہا اس پیر کے منہ پر تھپڑ رسید کروں مجھے اس کے منہ سے ان پاکباز ہستیوں کے نام نکلتے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ میری والدہ کو کسی نے بتادیا کہ میں پیر کے ساتھ گفتگو کررہا ہوں انہوں نے فوری طور پر ایک آدمی کو بھیجا جو مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔

انتہائی غیر اخلاقی حرکت

میں دوپہر کے وقت قیلولہ کررہا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگادیا میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ کالی کلوٹی لڑکی میرے سینے پر سر رکھے میرے پیٹ پر لیٹی ہوئی تھی اور مجھے اپنے دونوں بازوؤں کے حصار میں لیے ہوئے تھی اور ساتھ ہی ساتھ زبردست چیخیں مار رہی تھی۔ کئی مرد اور عورتیں اس کی چیخیں سن کر اکٹھے ہوگئے تھے۔ پھر وہ رونے لگی اور کہنے لگی مجھے پیر صاحب نے بھیجا تھا کہ میں انہیں بلالاؤں میں جب انہیں بلانے کے لیے آئی تو انہوں نے مجھے قابو کرلیا اور میری عزت خراب کرنے کی کوشش کی۔ وہ بے تحاشہ رورہی تھی اور خوب شور مچارہی تھی۔ پھر وہ تیزی سے باہر نکلی اور واپس پیر کے پاس پہنچ گئی۔ میں ہکا بکا حیران پریشان ہوگیا بلکہ صحیح معنوں میں میں گھبرا گیا تھا اب کی بار پیر نے سوچ سمجھ کر کھیل کھیلا تھا۔ ادھر پیر چنگھاڑ رہا تھا اس قاری نے ایک درویشنی کے ساتھ زیادتی کرکے اپنی موت کو دعوت دی ہے اس کی بددعا اس کی سات پشتوں کو بھسم کردے گی ہم درویش اور تو کچھ کر نہیں سکتے بس ہماری بددعائیں اس کو لے ڈوبیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ پیر بھی باقاعدہ رورہا تھا۔

گاؤں میں ایک بدمزگی کی فضا پیدا ہوگئی کچھ آدمی میرے پاس آئے اور کہنے لگے قاری صاحب یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے انہیں صحیح صحیح صورت حال بتادی۔ میں ابھی پوری صورت حال کو واضح نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں خود تذبذب میں تھا وہ یوں کہ مجھے اچھی طرح پہچان نہیں ہورہی تھی کہ یہ وہی لڑکا تھا جس نے لڑکی کا روپ دھارا ہوا تھا یا کوئی اور سچ مچ کی لڑکی تھی پھر میں نے ایک نوجوان سے پوچھا یار کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کو میں نے کل مارا تھا اس نے کہا جی ہاں یہ وہی لڑکی ہے! میں نے کہا ذرا جائیں اور تسلی کرکے آئیں، وہ گیا اور واپس آکر مجھے بتایا کہ وہی لڑکی ہے اور کوئی لڑکی پیر کے ساتھ نہیں ہے۔ میرے چند دوست اور عقیدت مند بھی شور سن کے آگئے تھے انہوں نے مجھ سے صورت حال کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے پُر وثوق انداز سے کہا کہ بھئی یہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے! اور اگر یہ لڑکی ہوئی تو میں جھوٹا اور اگر لڑکا ہوا تو پیر کا کیا علاج ہے؟ انہوں نے کہا آپ کو کیسے پتہ ہے کہ یہ لڑکی نہیں؟ اس بات کو چھوڑو تم اس شرط پر بات کرو کہ اگر وہ لڑکا ہوا تو پیر کے ساتھ کیا کروگے؟ سب نے کہا ہم ابھی پیر کو جوتیاں لگا کر گاؤں سے نکال دیں گے۔ میں نے کہا نہیں صرف یہی نہیں پیر کو حوالہ پولیس کیا جائے گا اور اس پر جعل سازی کا کیس درج کرایا جائے گا! ٹھیک ہے سب نے اتفاق سے کہا۔

ہم سب پیر والے گھر آئے پیر کے عقیدت مند اسے تسلیاں دلاسے دے رہے تھے وہ مظلوم بنا فر فر مجھے بددعائیں دے رہا تھا، بات شروع ہوئی تو ایک نوجوان نے پیر کے سامنے صورت حال رکھی جب پیر نے سنا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے اسی وقت

اپنے ہمراہیوں سے کہا ابھی تیار ہو جاؤ ہم ابھی اسی وقت یہاں سے جا رہے ہیں اور آئندہ ہم کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔ میرے دوست نوجوان نے فیصلہ کن انداز میں پیر سے کہہ دیا کہ تم اُس وقت تک یہاں سے ہل بھی نہیں سکتے جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ قاری صاحب پر بہتان لگانے والی لڑکی ہے یا لڑکا۔ تم ایک معزز آدمی پر بدنامی لگا کر اتنی آسانی سے رفو چکر نہیں ہو سکتے۔

صورتِ حال نہایت دلچسپ ولولہ انگیز رنگ اختیار کر گئی تھی۔ آہستہ آہستہ سب لوگوں کو پتہ چل گیا کہ قاری صاحب کہتے ہیں کہ جس لڑکی نے مجھ پر بہتان لگایا ہے وہ لڑکی نہیں اصل میں لڑکا ہے اب ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ اس کا فیصلہ ضرور ہونا چاہیے۔ اتنے میں کچھ منچلے لوگوں نے اُس لڑکی کو پکڑ لیا اور اسے اندر کمرے میں لے گئے اور اس کا گھاگرا اٹھا کر دیکھا تو سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ لڑکا تھا اور ابھی پوری طرح شباب بھی اس پر نہیں آیا تھا۔ پھر انہوں نے اس کے سینے پر رکھے ہوئے گیند نما قسم کی دو گول گول تھیلیاں بھی باہر نکال لیں جن میں کپڑوں کے نرم نرم ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ پیر کی حالت قابلِ دید تھی وہ بھیگی بلی بنا ہولے ہولے کانپ رہا تھا اس کے ہمراہی اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"پولیس کو اطلاع دو۔" ایک معتبر آدمی نے کہا لیکن میں نے منع کر دیا میں ابھی اس سے پیران پیر کی زیارت کے ڈھونگ کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا۔ اتنے میں کسی نے حجام کو بلا لیا تھا اور اس لڑکے کے لمبے بال اور چوٹی کاٹ دی گئی۔ پھر میں نے لوگوں کو باہر نکال دیا اور پیر سے پیران پیر کی زیارت کے متعلق پوچھنے لگا اس نے میری بہت منت سماجت کی اور کہنے لگا کہ میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن آپ لوگ مجھے جانے دیں اور پولیس کے حوالے نہ کریں اس اثناء میں اس کے تین ساتھی لوگوں سے نظریں بچا کر بھاگ گئے تھے دوسرے لوگ بے خبر تھے بلکہ وہ پیر کے اس فراڈ سے اس سے بدظن ہو گئے تھے۔

ٹھیک ہے ہم تمہیں جانے دیں گے لیکن اگر جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو پھر کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔ میں نے حتمی انداز میں کہا! ٹھیک ہے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پھر اس نے چارپائی کے نیچے سے کپڑے کا ایک بڑا تھیلا نکالا اور اسے کھول کر ایک ڈمی سی باہر نکالی جو موٹے کپڑے سے بنائی گئی تھی پھر اس کو الٹایا تو ایک باریش آدمی کی شبیہ نظر آنے لگی پھر کہنے لگا بس جی یہی پیران پیر ہیں میں نے اس شبیہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور باہر والے مرد و خواتین کو دکھلایا کہ لو جناب یہ ہیں پیران پیر! بعض لوگوں نے کہا اس طرح نہیں جس طرح رات کو پیران پیر کے منہ سے سبحان اللہ وغیرہ نکلتا تھا اور پیر صاحب لوگوں سے ہاتھ ملاتے اور سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیتے تھے وہ کیسے ہوتا تھا؟ میں نے جعلی پیر سے کہا کہ رات کو جس طرح کیا تھا اس طرح کر کے دکھاؤ اس نے اسی لڑکے کو اشارہ کیا تو وہ ڈمی کے اندر داخل ہو گیا اب وہ ڈمی حیرت انگیز حد تک ایک نورانی چہرے والے بزرگ کا روپ دھار گئی تھی بعض عورتیں منہ پھلا کر کہنے لگیں "نکھ نہ روے ایس پیر دا ایہدے سر وچ کھ پاؤ۔"

کچھ نوجوانوں نے مشورہ کیا کہ پیر اور اس لڑکے کو پھینٹی لگائی جائے لیکن میں نے منع کر دیا اُس کے لیے یہ سزا ہی کافی تھی کہ اس کے مکر و فریب کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا تھا۔ لیکن مجھے ابھی اس سے کچھ معلومات اور حاصل کرنا تھیں میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اُس سے آنکھوں کی مقناطیسیت کے بارے میں پوچھا لیکن لوگوں کے شور و غل اور ایک دوسرے سے سرگوشیوں اور پیش آمدہ صورتِ حال پر تبصروں اور پیر کی

www.paksociety.com

بدحواسی اور غیر حاضر دماغی کی وجہ سے وہ کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا کہ میرا نام نذیر ہے اور فلاں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میری تعلیم ایف اے تک ہے یہ لائن اختیار کرنے سے پہلے میں صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اور گاؤں میں دیندار لڑکے کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا پھر میری زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے مجھے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا اور میں گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا گیا! آپ مجھے ایک دفعہ یہاں سے نکال دیں میں بہت جلد آپ سے ملاقات کروں گا میرا وعدہ ہے کہ میں آج کے بعد سے اپنے حالات درست کرنے کی کوشش کروں گا اور اس شیطانی ماحول سے نکلنے کی کوشش کروں گا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص اس شیطانی جال سے نکلنے کا خواہش مند ہے میں نے اسے بغلوں اور زیر ناف بال صاف کرنے کی ہدایت کی اور لباس پہننے کو کہا اس نے میرے ساتھ وعدہ کر لیا اور کہا کہ سچ پوچھیں تو میں خود چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے گناہوں کی اس دلدل سے نکال دے۔ اس میں وہ شخص کسی جادوگر کے ہتھے چڑھ گیا تھا جس نے اسے علم سحر کے چند رموز سکھا دیے تھے اور وہ دین اور دنیا دونوں برباد کر بیٹھا تھا۔ میں نے نوجوانوں کو سمجھا بجھا کر اسے جانے دیا۔

جادوگر کی پہچان

ہمیشہ یاد رکھیں کہ جادو سیکھنے سے پہلے ایمان شیطان کے پاس گروی رکھنا پڑتا ہے۔ جادو اور ایمان دونوں ہرگز اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ہاروت و ماروت جادو سکھانے سے پہلے جادو سیکھنے والے کو وارننگ دیا کرتے تھے۔ دیکھیں سورہ بقرہ، ترجمہ: ہم تو بطور آزمائش بھیجے گئے ہیں تو کفر نہ کر (سورہ بقرہ آیت نمبر 02) اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جادوگر کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں سورہ بقرہ کی اسی آیت مبارکہ میں آخر سے پڑھیں۔

ترجمہ: اور وہ خوب جان چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو نہیں اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ اور بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو کاش ان کو سمجھ ہوتی۔

(سورہ بقرہ آیت نمبر 102)

اسی آیت کے تحت فوائد عثمانی دیکھیے۔

سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے علموں سے آخرت کا کچھ نفع نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے اور بغیر حکم خدا کے کچھ نہیں کر سکتے اور علم دین اور علم کتاب سیکھتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے (فوائد عثمانی فائدہ نمبر 149)

جادو کے متعلق یہ بات سمجھی جا چکی ہے کہ اس میں دوسرے شخص پر اثر ڈالنے کے لیے شیاطین یا ارواح خبیثہ یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گزر کر جسم کو بھی اسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گزر کر نفس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً خوف ایک نفسیاتی چیز ہے مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں کپکپاہٹ سی ہو جاتی ہے دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی مگر انسان کا نفس اور اس کے حواس اس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہو گئی ہے۔

(اسلامی انسائیکلو پیڈیا صفحہ 588)

جادو انسان کے لیے ایک ناگہانی آفت و مصیبت سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ یہ بیشتر انسان کی قوت متخیلہ پر اثر انداز ہوتا ہے جس کے بگڑ جانے سے انسان کا اندرونی نظام مختل ہو جاتا ہے اور یہی جادوگر کا اصل مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ مسحور کے تمام نظام عصبی کو مختل کر کے چھوڑ دے۔ نتیجتاً مسحور کے قوئی ساحر کی مرضی کے

مطابق عمل شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً امراض یا تکالیف یا خبط یا جنون وغیرہ کا لاحق ہو جانا حتیٰ کہ مسحور خود کو چاروں سمتوں، چاروں مادوں، اور چاروں خلطوں سے جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ (جادو کی حقیقت صفحہ 26)

جادو گروں کے جنوں اور شیطانوں سے رابطے اور مراسم رہتے ہیں اور وہ شیاطین کے ساتھ علم حق سے صرف نظر کرنے کا عہد کر لیتے ہیں اُن کی نذر و نیاز اور پکار کرتے ہیں ان کے نام کی قربانی دیتے ہیں حتیٰ کہ معصوم بچوں کو قتل کر کے شیاطین کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ طہارت کو ترک کر کے ناپاکی اور غلاظت میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ حلال اشیاء کو حرام اور حرام چیزوں کو حلال بنا لیتے ہیں محرمات (ماں، بہن، بیٹی وغیرہ) سے زنا کرتے ہیں۔ کئی کئی مہینے بلکہ سالہا سال غسل وغیرہ نہیں کرتے حتیٰ کہ بعض اوقات اپنا پاخانہ بھی کھا جاتے ہیں کبھی عورت کے حیض کا خون اپنے جسم پر ملتے ہیں۔ اگر آپ کوئی اس قسم کا آدمی دیکھیں تو اگر وہ پاگل نہیں تو وہی جادو گر ہے۔ چونکہ جادوگر شیاطین سے ایک قسم کا تعلق پیدا کر چکا ہوتا ہے اور وہ اسے ہر وہ کام کرنے کا حکم دیتے ہیں جس سے اللہ کا غضب اور غصہ بھڑکتا ہو۔ کبھی سائلوں کو قرآن پاک پر بیٹھ کر نہانے کا کہتے ہیں کبھی حیض کے خون سے قرآنی آیات لکھتے ہیں۔ کبھی قرآن مجید کو گندگی پر پھینکنے اور پاؤں تلے روندنے کا کہتے ہیں جب وہ یہ سب کچھ کرتے ہیں تو پھر کہیں جا کر شیاطین یا جنات ان کی کچھ باتیں مانتے ہیں کسی کو سانپ بن کر نظر آ جاتے ہیں کسی کے گھر آگ لگا دیتے ہیں کسی کا کچھ نقصان کر دیتے ہیں کسی کو کوئی جسمانی یا روحانی تکلیف پہنچا دیتے ہیں بس اتنی سی جادو اور جادوگر کی حقیقت ہے!

لیکن ایک بات دل کے کانوں سے سن لیں ان شیطانی علوم کو حاصل کرنے والوں کا اپنا انجام بھی اکثر خراب ہی ہوتا ہے اکثر پُراسرار طریقے سے مر جاتے ہیں اور اگر زندہ بھی رہیں تو بالآخر نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں اور پاگل ہو کر کپڑوں سے بے نیاز سڑکوں پر لوگوں سے پتھر کھاتے پھرتے ہیں البتہ چند روزہ زندگی میں انہیں عملیات کی بدولت شہرت اور عزت بھی نصیب ہوتی ہے لیکن اکثر بال بچوں اور بیوی سے محروم رہتے ہیں اور اگر توبہ کی توفیق نہ ملے تو ایمان سے محرومی کی حالت میں واصل جہنم ہو جاتے ہیں ہمارے ہاں ایسے خبیث لوگوں کو باوا جی، یا سرکار، کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد ان کے سر بفلک مزار بنتے ہیں اور ان کے درباروں اور تکیوں پر بدمعاش مجاور لوگوں کے مال بھی لوٹتے ہیں اور عزتیں بھی!

علمائے حق سے گزارش

علماء کرام سے میری یہ گزارش ہے کہ وہ اپنے مواعظین حسنہ میں ان جھوٹے جادو گروں کے مکرو فریب کا پردہ بھی چاک کریں اور خود بھی روحانی علوم سے واقفیت حاصل کریں چونکہ عام لوگ روحانیت پر بہت یقین رکھتے ہیں اور پھر اپنی سادگی اور لاعلمی کی بنا پر غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت میں نے روحانی علوم سیکھے اور پھر قرآن و حدیث کے علاوہ روحانیت پر لکھی گئی کتابوں کا بھی بے تحاشہ مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ سوائے قرآنی علوم کے دوسرے سب علوم پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے میری تحریروں اور تقریروں کے ذریعے اتنے لوگ راہِ راست پر نہیں آئے جتنے عملیات کی وجہ سے آئے ہیں۔ اور میں کئی علماء کرام، حفاظ اور قراء حضرات کو یہ علوم سکھا چکا ہوں۔ علماء کرام کے لیے قرآنی عملیات سیکھنا عام لوگوں کی نسبت بہت آسان ہے بس تھوڑی سی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز یہ جادوگر کے ساتھ پیش آنے والے

واقعات کے بعد میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ ان علوم کی شد بد ایک عالم دین کے لیے از حد ضروری ہے اور پھر میں نے لگن اور محنت سے یہ علوم حاصل کیے! گو میں نے دنیاوی فوائد بھی حاصل کیے لیکن میں نے ذاتی مفاد کو عوامی مفاد پر کبھی ترجیح نہیں دی یہی وجہ ہے کہ میں ابھی تک ذاتی گاڑی تک نہیں خرید سکا سادہ سی دیہاتی زندگی گزار رہا ہوں حالانکہ میں نے اپنی عاملانہ زندگی میں جادوگروں کے ستائے ہوئے بڑے بڑے خطرناک کیس اللہ کے فضل سے حل کیے ہیں جن سے میں لاکھوں روپے وصول کرسکتا تھا۔

نذیر جادوگر کی آپ بیتی

دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو ایک بارعب، حسین وجمیل آدمی جس کی داڑھی خوبصورت تراش خراش اور سر پر دستار نے اُسے مقناطیسی شخصیت بنا دیا تھا اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ دراصل میں ایک ہی نظر میں اس کی شخصیت سے متاثر ہوگیا تھا۔ زری کھسے پر سفید قمیص اور تہبند نے اس کی اٹھان میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

"قاری صاحب کیا حال ہیں آپ کے؟"

بالکل ٹھیک ٹھاک جناب میں نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کہا! بیٹھنے کو نہیں کہیں گے اس نے بے تکلف سے کہا! کیوں نہیں آئیں تشریف لے آئیں میں نے دروازے کا دوسرا پٹ کھولتے ہوئے کہا! ہم اندر کمرے میں آ گئے۔

آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا! قاری صاحب میں نذیر ہوں! بھائی صاحب مجھے افسوس ہے مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا! قاری صاحب۔ سانپ جلی پر جس پر آپ نے ایک احسان کیا تھا۔ ہاں ہاں مجھے یاد آیا لیکن تم نذیر ہرگز نہیں ہو کیا دوبارہ میرے ساتھ شعبدہ بازی کرنے کا خیال ہے؟ نہیں سرکار سب شعبدہ بازیاں چھوڑ دی ہیں اللہ کا شکر ہے اس کی توفیق سے دوبارہ راہِ راست پر آگیا ہوں قاری صاحب دنیا کی ساری چیزیں ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں مگر صرف انسان وہ چیز ہے جو ٹھوکر لگنے کے بعد بنتا ہے میں بھی ٹھوکریں کھانے کے بعد حیوان سے انسان بن گیا ہوں لیکن اس میں آپ کی کوشش اور دعا بھی شامل ہے۔ پھر اس کی رگِ ظرافت پھڑکی اور اُس نے ہنستے ہوئے کہا میں معلوم کر چکا ہوں کہ میں ایک عدد بھائی کا جیٹھ بن چکا ہوں آپ انہیں جلدی سے آرڈر دے دیں اور ایک عدد بن بانگا دیسی مرغ خالص دیسی گھی میں بھونیں اور پانی کا ایک چھینٹا بھی اس میں نہیں لگنا چاہیے اور تیز آنچ پر ہلکے ہلکے چند چھلکے پکائیں اس وقت تک میں ظہر کی نماز ادا کرلوں۔

میں نے اس کی بے تکلفی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا بالکل ٹھیک تمہارے حکم پر فوری عمل ہوگا۔ پھر وہ اٹھا اور اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی چمڑے کی چوڑی اور لمبی تھیلی کھول کر میرے سپرد کی اور کہنے لگا! قاری صاحب یہ آپ کی نذر ہے اس تھیلی میں چاندی کے بہت سے روپے بھرے ہوئے تھے اتنی تعداد میں اتنے روپے جیبوں میں ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا لیکن نذیر بھائی میں نذر وغیرہ ہرگز نہیں لیا کرتا۔ چلیں پھر یہ میری طرف سے ہدیہ ہے اور ہدیہ قبول کرنا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہے۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا پیشہ مشکوک ہے پتہ نہیں تم نے یہ روپے کس طرح حاصل کیے تھے حدیثِ پاک کی رو سے کاہن اور جادوگر کی کمائی حرام ہے! ٹھیک ہے اس پر بحث بعد میں ہوگی فی الحال آپ اسے میری امانت سمجھ کر سنبھال لیں ہاں یہ ٹھیک ہے میں نے رضامند ہوتے ہوئے کہا۔ وہ

نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا اور میں نے بیگم کو نذیر کی حسب منشا کھانا پکانے کو کہا۔ میری بیگم کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ اس وقت مذاق کے موڈ میں ہے!

جی فرمائیں آپ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔ آپ کو کیسے پتہ چلا!

کیا تمہیں پتہ نہیں کہ میں تمہارے دل کی باتیں جان جاتا ہوں۔

ایک بات جاننے سے آپ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ میرے دل کی ہر بات جانتے ہیں اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا! اور اب آپ اس خوش فہمی میں نہ رہیں کچی عمر کی باتیں حتمی دلیل نہیں بن سکتیں۔

تو کیا اب اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھ لیا؟

ہاں مضبوط سہارا جو مل گیا پھر وہ میرے قریب آ گئی اور میرے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہنے لگی!

صبح کے وقت اذان سے پہلے
اب سے سات برس قبل اُدھر
عمر میں پہلی دفعہ روئی تھی میں
کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ سن کر میری ماں ہنس دی تھی۔

اوہو تم تو سیریس ہو گئی۔ منزل پر پہنچ کر تو لوگ ستاتے ہیں!

ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن منزل پر پہنچنے کے بعد ہی راستے کی مشکلات یاد آتی ہیں۔

میرا اندازہ غلط نکلا وہ مذاق کے موڈ میں نہیں تھی چند لمحوں کے لیے کہیں ماضی میں چلی گئی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد نذیر نے کہا قاری صاحب میں آج رات یہاں آپ کے ہاں ہی ٹھہروں گا! بالکل ٹھیک میں خود یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک دو دن میرے پاس رہو مجھے تمہارا شدت سے انتظار تھا لیکن تم نے آتے آتے کئی سال لگا دیئے اب تو میں تم سے مایوس ہو گیا تھا۔

دراصل میں اپنے آپ کو آپ سے ملنے کے قابل بنانا چاہتا تھا لیکن مجھے انسانی شکل اور انسانی سوچ میں آنے کے لیے کافی عرصہ درکار تھا آپ سے کیا ہوا وعدہ میں بھولا نہیں تھا اب میں آیا ہوں تو سب کچھ اگل دوں گا۔ میں سمجھا تھا کہ گناہوں کی دلدل میں دھنس کر میں نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے لیکن اتنی چھوٹی عمر میں آپ نے میرے شیطانی حربوں کو ناکام کر کے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ شیطانی قوتیں رحمانی قوتوں کے سامنے ہیچ ہیں۔ بدی اور نیکی، حق اور باطل، جھوٹ اور سچ دن اور رات، روشنی اور اندھیرا، حقیقت اور تخیل میں زمین و آسمان کی وسعتوں سے بھی زیادہ فرق ہے۔ لیکن صحت کی قدر بیماری کی مصیبت جھیلنے کے بعد ہی آتی ہے اندھیروں میں بھٹکنے والا ہی روشنی کی قیمت جان سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے انسان بننا ضروری ہے۔ الو کے لیے روشنی وبال جان ہے!

نذیر برا نہ ماننا میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تم نے وہ فقیری والی لائن کیوں اختیار کی؟

قاری صاحب معاف کرنا وہ فقیری نہیں تھی دھوکا تھا اپنے آپ سے دھوکہ مخلوق خدا سے دھوکا، دراصل مجھے ایک روگ لگ گیا تھا جس نے مجھے لائن سے ہٹا دیا تھا۔

کون سا روگ؟

مجھے ایک ناگن نے ڈس لیا تھا۔

ناگن نے؟

جی ہاں!

پھر تم نے کوئی علاج وغیرہ کرایا انہیں اس کا علاج اسی ناگن کے پاس تھا لیکن وہ ڈس کر بھاگ گئی تھی بھائی کسی سپیرے وغیرہ سے علاج کرانا تھا۔ جی سپیرے کے پاس گیا تھا لیکن وہ سپیرا انہیں سانپ تھا۔

سپیرا نہیں سانپ تھا میں بڑبڑایا۔ کیا مطلب؟
پہلے ناگن کی بات سُنی ہے یا ناگ کی؟
جس نے پہلے ڈسا تھا میں نے اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوتے ہوئے کہا!

ناگن کی کہانی

رابعہ ایک الہڑ دیہاتی مٹیار تھی۔ درمیانہ قد، بھرا بھرا جسم سنہری تلے سے مڑی ہوئی چمڑے کی جوتی پہ سفید سلکی لاچا جس میں پارا اگل چوڑا سرخ بارڈر تھا ململ کی باریک قمیص جس کے نیچے بازوؤں والی بنیان تھی چوڑیاں بھرتی ہوئی میری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میں ایف اے کے امتحان کی تیاری میں مشغول تھا۔ خدا خیر کرے رابعہ ادھر کیوں آ رہی ہے میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ باؤ جی سلام اس نے میرے قریب آ کر کہا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اس کی سانس پھولی ہوئی تھی شدت شباب سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی اس کے رخساروں سے خون بہہ نکلے گا وہ آگ کے انگاروں کی طرح دہک رہے تھے!

دیکھو جی میں زیادہ دیر تک تمہارے پاس نہیں ٹھہر سکتی ویسے بھی انسان اگر چاہے تو اپنا مدعا ایک منٹ میں بیان کر سکتا ہے اور وہی بات کہنے کے لیے ایک گھنٹہ بلکہ سارا دن بھی لگا سکتا ہے اسٹوڈنٹ جی "سوچتے رہ جاتے ہو گئے گزشتہ" جب میں مر کر مٹی ہو جاؤں تو میری قبر کی مٹی بھی تمہاری امانت ہے! پھر اس نے ایک پوٹلی میری طرف پھینکی اور کہنے لگی انہیں بیچ کر اپنی تعلیم مکمل کرو اور دوسری ضروریات پوری کرو۔

پوٹلی میں سونے کے بھاری زیور بندھے ہوئے تھے۔ پھر وہ آگے نکل گئی اور ایک گنے کے کھیت میں داخل ہو گئی۔ ذرا دیر بعد دوسرے راستے سے واپس گاؤں کی طرف چلی گئی میرے خیال میں وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ حوائج ضروریہ کے لیے باہر کھیتوں میں آئی تھی۔ رابعہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی ویسے میں اسے جانتا تھا وہ ہمارے ہی گاؤں کی لڑکی تھی چار بھائیوں کی اکلوتی بہن گاؤں کے بڑے چوہدری کی لاڈلی بیٹی۔ ایک نوجوان ہونے کے ناطے کبھی کبھی اس کا خیال میرے دل میں آیا کرتا تھا لیکن انگور کھٹے کہہ کر اس کے خیال کو جھٹک دیا کرتا تھا جبکہ دوسرے کئی نوجوانوں کو سرد آہیں بھرتا دیکھا کرتا تھا۔ اس کی قاتل جوانی اور بے رحم حسن کا احساس اس کے والدین اور بھائیوں کو بھی ہو گیا تھا اور وہ دل ہی دل میں سہمے ہوئے تھے اور حتی المقدور اس کی نگرانی اور حفاظت کیا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ دیہات کی اور لڑکیوں کی طرح آزاد نہیں تھی زیادہ تر گھر پر ہی رہتی تھی حتیٰ کہ قرآن پاک پڑھانے کے لیے بھی گاؤں کی استانی ان کے گھر خود ہی جاتی تھی۔ ملازموں کو باہر کھیتوں میں کھانا وغیرہ پہنچانے کے لیے کئی عورتیں ان کی ملازمت میں تھیں۔

گو میں بھی زمیندار تھا لیکن رابعہ کے والد کے مقابلے میں میری کچھ بھی حیثیت نہیں تھی صرف چند ایکڑ زمین میری ملکیت میں تھی۔ میرے والد عین جوانی میں شادی کے صرف دو سال بعد فوت ہو گئے تھے اور میری والدہ نے صرف میری خاطر دوسری شادی نہیں کی تھی میں ان کی اکلوتی اولاد تھا ہم ماں بیٹا کم اور بہن بھائی زیادہ لگتے تھے۔ رابعہ کا کہا ہوا جملہ بار بار میرے دماغ میں گونجتا میں خوف و رجا کے چکر میں پھنس گیا تھا کبھی خوف غالب ہو جاتا کبھی امید و رجا میری کیفیت کچھ یوں ہو گئی تھی!

چلی تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

میری پُرامن زندگی کی جھیل میں رابعہ نے ایسا پتھر پھینکا جو بھنور کی صورت اختیار کر گیا میری حالت کچھ اس

طرح ہو گئی! میرا ایک دوست ہے جس کا خیال میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور اس کا نام میرے دل میں چھپا ہوا ہے اگر اسے یاد کروں تو میرا سارا جسم دل بن جاتا ہے اور اگر اسے دیکھوں تو سارا جسم آنکھیں بن جاتا ہے!
رابعہ کا خیال میرا رفیق بن گیا میں سوچتا رابعہ کو یہ خیال کیوں اور کیسے آیا چونکہ یہ سب اچانک اور ناگہانی طور پر ہوا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے خوشی ہوئی یا حیرانگی لیکن میرے دل میں گدگدی کی ایک کیفیت تھی میں نے نصابی کتابیں بند کیں اور کتاب عشق کی ورق گردانی شروع کر دی میرے خیال میں دنیا کی کوئی کیفیت اتنی سریع الاثر نہیں ہو سکتی جتنی کیفیت عشق ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں خلا کی بیکراں وسعتوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ میرے من میں کلیاں چٹخیں، گلاب کھلے، اردگرد کے مناظر، پرندوں کے چہکے، لہلہاتی فصلیں، غروب ہوتا ہوا آفتاب، سرخ گلابی افق، گاؤں کو جاتی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی، گاؤں کی مسجد کا مینار، واپس آتے ہوئے بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ یک دم سب بھلے محسوس ہونے لگے۔

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے بیوپاریوں کو کستوری کے پہاڑ ہاتھ لگ گئے ہوں۔ میں کھڑا ہو گیا دوران خون کی تیزی کی وجہ سے میری تمام حسیں تیز ہو گئی تھیں میرے جسم میں جیسے بجلی بھر دی گئی ہو۔ میں تیز اور جاندار رفتار سے گاؤں کی طرف چل پڑا گھر تک پہنچنے کے لیے میں نے جس راستے کا انتخاب کیا وہ رابعہ کے دروازے سے ہو کر گزرتا تھا جیسے ہی میں دروازے کے قریب آیا رابعہ نے کسی بہانے دروازہ کھولا اور میری طرف دیکھ کر ایک ادائے خاص سے مسکرائی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سلام کیا۔

میرے دل میں دھڑکن تیز ہو گئی میں یہ سوچ کر کہ ایک امیر کبیر گھرانے کی انتہائی خوبصورت لڑکی میری طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ خود کو ہمالیہ کی بلندیوں پر محسوس کرنے لگا۔ رات اسی کے سپنے دیکھتا رہا۔ گزرتے ہر دن کے ساتھ رابعہ کا عشق میری نس نس میں رچتا چلا گیا۔ ایک دن نوراں ہمارے گھر آئی میں کمرے پر اکیلا ہی تھا اس نے مجھے رازدارانہ لہجے میں کہا!

"باؤ نذیر آج شام کے بعد فلاں جگہ پر رابعہ اور میں تمہارا انتظار کریں گی اگر ہو سکے تو سفید لباس بدل کر کسی اور رنگ کا لباس پہن لینا اور دیکھو بڑی احتیاط سے آنا ہم فلاں رستے سے آئیں گی اور تم فلاں فلاں رستے سے آنا۔ باؤ نذیر مجھے ڈر بہت آتا ہے اگر کسی کو پتہ چل گیا تو میں جان سے گئی لیکن کیا کروں رابعہ کا کہا موڑ بھی نہیں سکتی اس نے مجھے کافی روپے بھی دیے ہیں اور ویسے بھی اس کے گھر والے مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں تم نے پتہ نہیں اس پر کیا جادو کیا ہے خالص مکھن اور دودھ سے پلی ہوئی الہڑ مٹیار تیرے پیار میں پاگل ہو چکی ہے.....اچھا اب میں چلتی ہوں یہ لے اس کے پیار کی نشانی۔" اس نے ہاتھ سے کڑھا ہوا ایک خوبصورت چھوٹا رومال میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا!

میں نے رومال لے لیا رومال سے اٹھنے والی خوشبو کے جھونکے میری مشام جان کو معطر کر گئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مجھے مل گئی ہو۔ شام کے بعد میں بڑی احتیاط سے مقررہ جگہ پر پہنچ گیا ذرا ہی دیر بعد دو ہیولے آتے دکھائی دیے پھر ایک ہیولہ پیچھے کھڑا رہ گیا اور دوسرا میری طرف بڑھ رہا تھا میں سمجھ گیا کہ نوراں پیچھے بیٹھ گئی ہے۔ رابعہ میری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی کسی لڑکی سے تنہائی میں ملنے کا یہ پہلا موقع تھا میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے سینے سے باہر نکل جائے گا۔ میں بیٹھا ہوا تھا وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں پکڑ لیے اور اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا دیا۔

(سنسنی خیز کہانی جاری ہے)

لغزش

چشم حیات حسن شناسی کی شاہراہ ہے خواہ یہ ظاہری آنکھ ہو یا باطنی۔
چشم باطن بحر ہے تو چشم ظاہر آب جُو۔

ڈاکٹر مبشر حسن ملک
0345-6875404

حُسن وجمال روح کائنات ہے۔ انسان ظاہری اور باطنی خصائص کا مجموعہ ہے۔ باطن لطیف تر ہے تو اکائی کا حسن بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ کبھی دل کی خوبصورتی ظاہری نقوش ونگار کو بے معنی کر دیتی ہے۔

چشم حیات حسن شناسی کی شاہراہ ہے خواہ یہ ظاہری آنکھ ہو یا باطنی۔ چشم باطن بحر ہے تو چشم ظاہر آب جُو۔

وجود انسانی میں ماہیت حسن کیا ہے؟ ظاہری نقوش وشگفتہ یا روپوں کی شیرینی؟ ہر دو کے اختلاط میں تناسب فیصلوں کا مظہر ہے کہ عروج وانحطاط کی گنجائش ہمہ پہلو موجود رہتی ہے، جو اوروں کے ساتھ بھی منسلک ہو سکتی ہے۔ اساس کا بہتر ہونا بڑی خوبی ہے۔

گمنام خوش نصیب تھا۔ وہ جواں دلوں کی برات میں شہ خوباں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے جمال صورت میں حسن سیرت بھی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا قلب انسانی پیار کے خزیانوں سے لبریز تھا۔ حسن گلو سوز کے ساتھ وہ حسن تخیل سے بھی مالا مال تھا، اسے بھی جوابا انسانی پیار بر کھا کی صورت ملا تھا، جسے وہ بڑی نعمت گردانا کرتا تھا۔

نسوانی پیار کو وہ شبنم قرار دیا کرتا تھا۔ پیار کی اس نوع میں اسے ہمدردی کے جذبے نظر آیا کرتے تھے۔ وہ اس اصول عطا کا جواز اپنے حسن اعمال میں تلاش کیا کرتا تھا۔ نیلی آنکھوں کا زہر اس کے خمیر میں ناپید رہا تھا، پھر بھی تنہائی کے لمحوں میں نسوانی چاہتوں کے سفینے اس کے افکار میں چلا کرتے تھے۔ ان بھور میں اس نے چند جگر سوختہ داغوں کے جزیرے بھی سجا لئے تھے۔

وہ رات انتہائی سنسان اور ویران تھی۔

تاریکی کا طلسم بدرجہ اتم گہرا ہو گیا۔ کہر نے اسے کچھ اور مہیب کر دیا تھا، یخ بستگی نے حیات شبانہ کو حد درجہ محدود کر دیا تھا۔ گمنام کا کاشانہ البتہ روشن اور گرم تھا۔ کمرے کی اندرونی حدت اسے بیرونی موسم سے

بے نیاز کرتی تھی۔ خوشحالی اس عمارت کے ہر کونے سے جھلکتی تھی۔

گمنام کے لہو میں حرارت جوان تھی۔ آئے دن کی بے خوابی نے اسے البتہ پریشان کر دیا تھا۔ رات گزر رہی تھی مگر نیند کی دیوی اس سے منہ موڑے کھڑی تھی۔ فکر اس کے ذہن میں الجھ گئے تھے۔ اس کے سکون میں بے سکونی کا احساس ہوتا تھا۔ اس نے بیڈ روم کی روشنیاں مدھم کر دی تھیں اور آنکھیں موند کر خواب نوشیں کی سعی کرنے لگا۔ عمر کے اس جوبن پر اسے غالباً نسوانی ساتھ کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

یکا یک مدہم سی لرزش کمرے کے ماحول میں بکھر گئی، جیسے بہت سارے موتی ہوا میں باہم ٹکرا گئے ہوں یا کسی نے جلترنگ کی لہر جگا دی ہو۔ لاشعوری طور پر گمنام کی آنکھیں کھل گئیں۔ پیش نظر منظر دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ حیرت اس کے رگ و پے میں اتر گئی۔

اس نے پلکیں جھپکیں، پھر آخری حدوں تک کھول دیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ عالم رویا میں نہیں تھا۔ جاگتے میں اگر وہ خواب دیکھ رہا تھا تو سپنا بے حد رنگین تھا۔ کمرے میں داخل ہونے والی ذی روح اس کے سپنوں سے بڑھ کر حسین تھی۔ اس کا بدن چاندی کی طرح دمک رہا تھا۔ نرگسی آنکھیں جھلملا رہی تھیں، جبکہ ہونٹوں کی کلیاں سرخی میں ڈوبی پڑی تھیں۔ عوارض کے گلاب درخشاں تھے۔ گرد رنگوں کی دھنک تھی۔ نیم عریاں حسن کے اس انداز نے گمنام پر سحر طاری کر دیا۔

"کون ہو تم.....؟" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"حضور نظر کی نور نظر۔" ایک مترنم سی نوا ابھری، جیسے نازک صراحیاں باہم ٹکرا گئی ہوں۔ پھر ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا، جیسے شیشے کی صراحی فرش پر گر کر چھناکے سے ٹوٹ گئی ہو۔

گمنام دم بخود رہ گیا، وہ کسی حد تک بدحواس اور پریشان ہو چکا تھا۔ نروس بھی دکھتا تھا۔ پسینہ اس کی پیشانی پر چمکنے لگا۔ اس کے دیدے پوری طرح واتھے دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں نمودار حسینہ پر جم گئی تھیں۔ وہ اپنی ساکت نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ انجانا سا خوف اس کے وجود پر طاری نظر آتا تھا۔ اس نے جلدی میں پانی کے چند گھونٹ پیے مگر اس کی نگاہیں بدستور مہمان پر جمی رہیں۔

اس نے گویائی کی کوشش کی مگر صرف تھوڑا سا ہکلا کر رہ گیا۔ آخر گویا ہوا تو پرانا سوال جڑ دیا۔

"کون ہو تم؟" تجسس بھری اس کی صدا لڑکھڑا گئی۔

"گھبرائیں نہیں، میں جو بھی ہوں، آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔" حالات دیکھ کر نسوانی آواز نے تسلی دی۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ گمنام ٹکٹکی باندھے متواتر مہمان کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

"کسی کی نجی زندگی میں یوں در کر آنا مناسب نہیں دکھتا، مگر کیا کروں، میں مجبور تھی، دل کے ہاتھوں۔" مہمان حسینہ نے بات آگے بڑھائی۔

"تم اپنا تعارف تو کروا دو۔ کون ہو تم؟"

"اپنے اندر سننے کا حوصلہ پیدا کریں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر رک گیا۔ لمبے سفر کرتے رہے۔ سکوت کچھ گہرا ہو گیا، پھر اچانک ٹوٹ گیا۔

"میں کوہ قاف سے آئی ہوں، اپنے دیس کی شہزادی ہوں مگر خودسر اور ضدی۔" مترنم آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

"تو گویا تم پری ہو۔" گلفام تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں۔"

"میرے خدا! یقین نہیں آتا۔ تم نے تو حیران کر دیا۔"

"میں حسن کی پری کہلاتی ہوں۔"

"یہاں کیسے آ گئی ہو؟ میرا مطلب ہے، مجھے یقین نہیں آتا۔ پری اور وہ بھی میرے کمرے میں؟ بچپن میں کبھی پرستان کی کہانیاں پڑھی تھیں۔"

"میں کئی کہانیوں کا حصہ رہی ہوں کیونکہ میں دل پھینک واقع ہوئی ہوں۔"

"مگر یہ خوبی تو دستورِ انسانی ہے؟ حیران ہوں کہ تمہارا حلیہ بھی سراسر انسانی ہے۔ پھر تم پری کیسے ہو سکتی ہو؟"

"میں نے انسانی روپ بھر رکھا ہے۔ ویسے بھی میرا وجود نوعِ انسانی کے قریب تر ہے۔"

"مجھ پر کرم نوازی کی وجہ؟"

"دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئی ہوں۔"

"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا؟"

"میں نے دیکھا تھا۔ آپ دوستوں کے ہمراہ کشتی رانی کر رہے تھے۔ میں اس دم ساحل سے دور جزیرے پر تھی، ہمجولیوں کے جھرمٹ میں۔ آپ پر نظر پڑی تو دل ہار بیٹھی۔"

"اس میں میرا کیا قصور؟"

"دل کے معاملے عقل سے بالاتر ہوتے ہیں۔"

"مگر میری دنیا میں آنے کی اجازت کیسے ملی؟"

"مشکل سے۔ پہلے تو میں نے اپنے باپ شہ دیو کو آمادہ کرنے کی کوشش کی، وہ نہ مانے تو میں نے ان کے حضور بغاوت کر دی۔"

"جان بخشی میں دقت پیش آئی ہو گی؟"

"ہاں، شاہ بانو نے ایک شب کے لئے یہاں آنے کی اجازت دلوا دی۔ صبح دم واپس لوٹ جاؤں گی۔"

"تمہارے اشتیاق کی وجہ سمجھنے سے ابھی تک قاصر ہوں۔"

"یک طرفہ محبت ہونے کی وجہ سے آپ صورتِ حال سے بے بہرہ ہیں۔ میں کچھ وقت آپ کی قربت میں گزارنا چاہتی ہوں۔ آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں بس۔ اس طور میرے من کو سکون مل جائے گا۔ میری تشنگی بجھ جائے گی۔"

"اس ملاقات کے بعد میں تمہارا گرویدہ ہو جاؤں گا۔ چاک گریباں۔"

"اس کا مجھے دکھ ہوگا۔"

"تم انسانی گمان سے بڑھ کر خوبصورت ہو۔"

"میں آپ کے قریب آنا چاہتی ہوں۔"

"کتنا قریب؟ کیا ہم قریب آ سکتے ہیں؟"

"اتنا قرب نہیں چاہتی جتنا شمع، پروانے کے بیچ ختم ہو جاتا ہے۔"

"کیا یہ ممکن ہے؟ جذبوں کی شدت پر عقل کی گرہ؟"

"ہاں یہ ممکن ہے، تقاضا بھی۔"

"میں سمجھا نہیں۔ میری عقل کا چراغ گل ہو گیا ہے۔"

"پروانہ جب قرب میں حدیں پھلانگ جائے تو شمع کی آغوش میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ میں اپنا یہ المیہ نہیں چاہتی۔"

"وارفتگی سے خود کو یوں باز رکھ پاؤ گی؟"

حسن پری صوفے سے اٹھ کر گلفام کے پہلو میں چلی آئی۔ جسمانی کیفیات حدِ فاصل کی تبدیلی پر مچلنے لگیں۔

"میں آپ کی حد درجہ گرویدہ ہو چکی ہوں۔ حسن یوسف کی طرح آپ نے مجھے گھائل کر دیا ہے۔ آپ کی

توجہ سے مجھے سکون ملنے لگا ہے۔"

گمنام کو حسن پری کے لمس نے پگھلا دیا۔ وہ اس کے سانسوں کی حرارت اپنے وجود پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جرأت کر کے حسن پری کا دست حنا تھام لیا اور اس کی مرمریں انگلیوں سے کھیلنے لگا۔ اس نے اپنی حیات میں صنف نازک کی قربت پہلی دفعہ پائی تھی۔

رات پچھلے پہر میں ڈھل چکی تھی۔ دھرتی کے پھیلاؤ پر کہر کا غلاف دبیز ہوتا گیا۔ یخ بستگی اپنا طلسم جما چکی تھی۔ زمین پر برفانی شیشہ منجمد ہونے لگا تھا۔ ہر سو گہرے سکوت کا راج نظر آتا تھا۔

گمنام کے کمرے میں سرگوشیوں کی صدائیں تواتر سے اُبھر رہی تھیں، پھر شب کی تاریکی نے روشن کمرے میں ڈیرے ڈال لیے۔ سناٹے کی صداؤں میں سانسوں کی بے ترتیبی اُبھرتی رہی، حتیٰ کہ اندھیرے نے جگمگاتی روشنیوں کو پھر سے جنم دے دیا۔

گمنام واش روم سے نکلا تو بری طرح سہم گیا۔ ڈر کے مارے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ قدم اُٹھاتے ہوئے لڑکھڑایا، پھر قریبی ستون کے سہارے جھول گیا۔ اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔

صوفے پر حسن پری کی جگہ کوئی چڑیل براجمان تھی، جس کا چہرہ انتہائی خوفناک تھا۔ اس کی سیاہ رنگت میں سرخ دیدے دہک رہے تھے، جبکہ دانت لمبوترے ہو کر خوفناک ہو چکے تھے۔ اس کی مسکراہٹ میں خونخواری جھلک رہی تھی۔ ہونٹ خشک اور خون کو ترسے نظر آتے تھے۔ حسن پری کے ہاتھ پیر مڑ چکے تھے اور وہ سراپا ہیبت ناک مچھل پیری کا روپ دھار چکی تھی۔

"کیا ہوا تمھیں؟" چیختے ہوئے لفظ گمنام کے حلق میں اٹک گئے۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" مچھل پیری نے سکون سے جواب دیا۔

"تمہاری شکل بدل چکی ہے۔"

"ہاں!"

"تو..... گویا یہ تمہارا اصلی روپ ہے؟"

"یہی سمجھ لیں۔"

"اور وہ تمہارا پہلا حلیہ؟"

"وہ بھی بناوٹی نہیں تھا۔"

"پھر یہ تغیر؟"

"گمنام، وہ میرا ظاہر تھا اب آپ میرا باطن دیکھ رہے ہیں۔"

"پہلے ظاہر اور اب باطن کیوں؟"

"پہلے میرا باطن بڑا خوبصورت تھا مگر تمہارے ہمرکاب حدوں سے گزرنے پر ہیئت میں تبدیلی آ گئی۔ اب میرا اصلی روپ یہی ہے۔"

"میرے خدا! یہ ہم نے کیا کر لیا؟"

گمنام گھبرا گیا اس نے فوراً مڑ کر آئینے میں جھانکا تو اسے اپنا چہرہ بھی بدنما نظر آیا۔ چہرے پر لعنت برس رہی نظر آئی۔

"آپ حضرت انسان ہیں، بدنما باطن کے ساتھ بھی اپنی اصلی صورت میں برقرار رہیں گے مگر میں اپنے اصل روپ میں واپس نہیں آ سکوں گی۔ میں اپنے انجام کو پہنچ چکی ہوں۔ میرا باطن میرے ظاہر پر مسلط ہو چکا ہے۔"

"کیا اب تمہاری پری چہرہ پہچان گم ہو جائے گی؟"

"آئینے میں بال آ جائے تو تو عیب مستقل ہوتا ہے۔ ہم اسے داغ سمجھ کر نہیں دھو سکتے۔"

"تمھیں تو فجر تک پرستان بھی لوٹ جانا تھا؟"

"ہاں، مگر فجر سے پہلے ساعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جنھیں جزا و سزا کا امین سمجھا جاتا ہے۔" مچھل پیری کی آواز میں لرزش تھی۔

"تمہاری مراد غالباً ان لمحوں سے ہے جب سنگین مجرم پھانسی چڑھ جاتے ہیں؟" گمنام بے حد پریشان ہو چکا تھا۔

"ہاں۔ گلفام، میں اس شب کی صبح نہیں دیکھ پاؤں گی۔ میرا جرم فروگزاشت نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے میں نے باپ کے حضور بغاوت کی، پھر ماں کے اور اب معبود کے۔ میں یہ بگڑا حلیہ لے کر پرستان واپس نہیں جا سکوں گی۔ مجھے اپنا ناپاک وجود ختم کرنا ہوگا۔ سمجھیں کہ شمع کی لو نے پروانے کو جھلسا دیا ہے۔ خدا حافظ، مجھے رخصت ہونا چاہیے۔"

اگلے ہی لمحے مخمل پری کا روپ ہواؤں میں تحلیل ہو گیا۔

"رُک جاؤ، خدارا ٹھہر جاؤ، ابھی نہ جاؤ، مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"

گلفام چیختا رہ گیا۔ وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر لپک رہا تھا مگر مخمل پری جا چکی تھی۔ کمرے میں اس کا وجود ناپید ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد قرب و جوار میں فجر کی پکار شروع ہو گئی۔

لوگوں نے ایک نیم پاگل شخص کو دیکھا جو حواس سے عاری بلا مقصد اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ وہ جذبوں کے بوجھ تلے دبا ہوا دِکھتا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی ناگوار تجربے سے گزرا ہے۔ کئی چہروں پر حیرانی جھلکنے لگی۔

"یہ خستہ حال شخص گلفام ہے۔" کسی نے کہا۔

"میں گلفام نہیں ہوں۔" وہ چلایا۔ "سیاکار ہوں۔ کاش آپ میرا باطن دیکھ سکتے۔ میں شیطان صفت ہوں۔ میرا باطن سیاہ فام ہے، اندوہناک۔ آپ مجھے سنگسار کر دیں۔ میں جینا نہیں چاہتا۔ میں موت کا سزاوار ہوں۔ جینا نہیں چاہتا۔" وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ لوگوں کا مجمع دم بخود نظر آنے لگا۔ "مجھے سنگسار کر دو، خدارا مجھے سنگسار کر دو!" گلفام لفظوں کی تکرار میں اُلجھ کر حواس مزید کھو رہا تھا۔

* * *

انتقال پُر ملال

حکایت کے مستقل قلمکار عبدالحفیظ بشر صاحب کی ہمشیرہ پچھلے دنوں گوجرانوالہ میں انتقال کر گئیں۔ اس کے علاوہ حکایت کے دیرینہ بزرگ قلمکار محترم میاں شاہ نواز صاحب بھی داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

ادارہ حفیظ بشر صاحب اور میاں شاہ نواز مرحوم کے لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اور لواحقین کو صبرِ جمیل۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

ترقی کا زہر

محمد اعظم

جس تیزی سے انسانی زندگی کو آرام طلبی کی طرف لے جایا جا رہا ہے دو چار ہزار سال بعد انسان صرف دماغ استعمال کرنے کے قابل رہ جائے گا اور اس کے ہاتھ اور پاؤں انتہائی کمزور ہو جائیں گے

ڈاکٹر ہارون کے ساتھ بڑی پرانی دوستی ہے جب بھی دوا کی ضرورت ہوتی ہے تو میں ان ہی سے دوائی لینا پسند کرتا ہوں۔ اگر ڈاکٹر صاحب کو فرصت ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ بھی جاتا ہوں اور کسی مسئلے پر بات چیت بھی ہو جاتی ہے۔

اُس دن بھی میں دوائی لینے گیا تو ڈاکٹر صاحب کو فراغت تھی اس لیے میں ان کے پاس بیٹھا رہا اور پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب جانور بہت کم بیمار ہوتے ہیں لیکن انسان بہت کم صحت مند رہتے ہیں ابھی جب میں آپ کے پاس آ رہا تھا تو میں نے دیکھا دو موٹی تازی بھینسیں آرام سے بیٹھی جگالی کر رہی تھیں باوجود سردی کے وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی تھیں اس کی کیا وجہ ہے؟"

ڈاکٹر ہارون کہنے لگے۔ "جب سے یہ زمین اللہ کے حکم سے آباد ہوئی ہے یعنی جب اللہ نے زمین پر انسان کو بسایا ہے تو ساتھ بے شمار جانور اور کیڑے مکوڑے بھی زمین پر بسا دیئے۔ اب انسان میں اور باقی جانوروں میں فرق یہ ہے کہ روزِ ازل سے اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو رہنے سہنے اور کھانے کے متعلق جو ہدایات دی ہیں جانوروں نے اُس ہدایت کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا ہوا ہے جب کہ انسان چونکہ مسلسل ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اس لیے اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہدایت سے انحراف کرنا شروع کر دیا اور آج تک مسلسل کر رہا ہے بلکہ یہ انحراف بڑھتا جا رہا ہے۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ کسی گائے یا بھینس نے چارہ کھانے سے انکار کر دیا ہو اور کہا ہو کہ وہ تو روز روز گھاس اور بھوسہ کھا کر تنگ آ گئی ہیں انہیں تو پلاؤ زردہ حلوہ اور مختلف قسم کے کھانے درکار ہیں؟ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ ایسی خوراک کھاتی ہیں جو انسان کے لیے بے کار ہے مثلاً گندم تو انسان کی خوراک بنتی ہے لیکن بھوسہ گائیں بھینسیں کھا لیتی ہیں۔ آپ نے کبھی ٹی وی پر کھانے

پکانے کا پروگرام دیکھا ہو تو چودہ سے بیس تک مصالحے اور دوسری اشیاء ایک سالن میں ڈالی جا رہی ہوتی ہیں اتنی پیچیدہ خوراک صحت کم اور مشکلات زیادہ لاتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے گھروں میں ہماری نانیاں دادیاں بہت ہی سادہ سے سالن پکاتی تھیں لیکن وہ بہت خوش ذائقہ ہوتے تھے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ ہم نے قسم قسم کے برتن استعمال کرنے شروع کر دیئے پہلے دور میں مٹی کے برتن استعمال ہوتے تھے پکایا بھی مٹی کے برتنوں میں جاتا تھا اور کھایا بھی مٹی کے برتن میں جاتا تھا۔ مٹی اور انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے انسان چونکہ مٹی سے ہی پیدا کیا گیا ہے اس لیے مٹی کے برتن ہی اس کے بہترین رفیق ہیں۔ یہ انسان کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ میں نے تو اپنی دادی کو مٹی کا توا بھی استعمال کرتے دیکھا ہے وہ مکئی کی روٹی مٹی کے توے پر پکاتی تھیں اور بہت مزیدار ہوتی تھی۔

آہستہ آہستہ ہم نے مٹی کے برتنوں میں کھانا اور پکانا چھوڑ دیا۔ پہلے ایلومینیم کے برتن آئے پھر سٹیل کے پھر سلور سٹیل اور اب پلاسٹک کے برتن۔ پلاسٹک ایک مصنوعی چیز ہے یعنی کیمیکل اس میں سے مسلسل شعاعیں نکل کر خوراک میں شامل ہوتی رہتی ہیں اور ہمیں عجیب بیماریوں میں مبتلا کرتی رہتی ہیں لیکن ہم ہیں کہ مجبور ہیں بھلا واپس پچھلی صدی میں جا کر کیسے مٹی کے برتن استعمال کریں۔"

"ڈاکٹر صاحب! اب ہم جس ترقی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس سے واپسی تو ممکن نہیں ہم نے زمانے کے ساتھ آگے ہی بڑھنا ہے۔"

"انسان تو زمانہ قدیم سے ہی ترقی کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔"

ڈاکٹر ہارون کہنے لگے۔ "جب سب سے پہلے اس نے پہیا ایجاد کر لیا تو گویا وہ اس نے ترقی کے زینے پر پہلا قدم رکھ دیا لیکن جس ترقی یافتہ دور میں ہم پچھلے بیس تیس سال سے داخل ہوئے ہیں دراصل اس دور کو "سلو پوائزن" (Slow Poison) کا دور کہا جائے تو بہتر ہوگا۔"

"ڈاکٹر صاحب اس ترقی کا زہر کے ساتھ کیا تعلق؟" میں نے پوچھا۔

"میں بات ذرا پیچھے سے شروع کرتا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اس طرح آپ کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ آپ نے ٹی وی پر جنگلی گائیں بھینسیں دیکھی ہوں گی اور یہ بھی دیکھا ہوگا وہ خطرے کی صورت میں کتنی تیز بھاگتی ہیں بالکل ایسے ہی جس طرح ہلکے پھلکے جسم کے جانور بھاگتے ہیں۔ جنگلی مرغیاں بھی دیکھی ہوں گی وہ کتنی دور تک اڑ سکتی ہیں اور مرغابیوں کے غول بھی اڑتے ہوئے دیکھے ہوں گے یہ مرغابیاں ہزاروں میل سفر اڑ کر طے کرتی ہیں اور سردیاں گزارنے ہمارے ملک میں آتی ہیں اسی طرح پھر سردیوں کے بعد ہزاروں میل سفر اڑ کر طے کرتی ہیں اور اپنے وطن واپس چلی جاتی ہیں۔ اب ہم گھروں میں موجود گائیں بھینسوں، مرغیوں اور بطخوں کا موازنہ کرتے ہیں۔

ابتدا میں یہ سب جانور اور پرندے آزاد جنگلوں میں قیام پذیر تھے انسانوں نے گائیں اور بھینسوں کو دیکھا کہ یہ خاصا دودھ دیتی ہیں انہوں نے چند گائیں اور بھینسیں پکڑ لیں اور انہیں گھروں میں قید کر دیا گھر کے اندر انہیں چارہ ملنے لگ گیا اور خطرہ بھی نہ رہا آہستہ آہستہ انہوں نے انسانوں کی غلامی کو قبول کر لیا۔ گھروں میں ہر وقت بند حار رہنے سے یہ جانور سست ہوتے گئے۔ ہزاروں سال گزر گئے ان جانوروں کے بچے بھی گھروں میں پیدا ہوتے رہے اور پھر آپ نے دیکھا ہو

گائیں، بیل اور بھینس کس طرح آرام آرام سے چلتی ہیں ہر وقت بیٹھے یا کھڑا رہنے سے ان کے پٹھے کمزور ہو گئے اور جسم بھاری ہو گئے...... جیسا کہ میں نے کہا مرغیاں بھی جنگلی ہوتی تھیں انسان ان کے انڈے تلاش کر کے لے آتے اور ان کو پکڑ کر ذبح کر کے گوشت بھی کھاتے انسانوں نے ان کے کچھ جوڑے گھر میں قید کر لیے ان کے پر کاٹ دیئے تاکہ اُڑ کر واپس جنگل میں نہ جا سکیں کچھ عرصہ وہ یہ طریقے استعمال کرتے رہے چنانچہ مرغیوں کے پر استعمال نہ ہونے کی وجہ سے کمزور ہوتے گئے اور جسم بڑے ہوتے گئے لہٰذا کچھ زمانے کے بعد یہ صورت حال پیدا ہو گئی وہ مشکل سے پانچ یا چھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھنے کے قابل رہی ہیں۔

یہی حال مرغابیوں کا ہوا ایک زمانے تک وہ جب گھروں میں پابند رہیں تو ان کے پر چھوٹے اور جسم بھاری ہو گئے اور اب اُن کو زمین پر چلنا بھی مشکل ہو گیا۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ کا مطلب ہے مستقبل میں انسان کا بھی یہی حال ہونے والا ہے؟" میں نے کہا۔

"اعظم صاحب بالکل آپ نے صحیح سمجھا۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "ایک صاحب جو بزنس مین ہیں یا وہ کوئی بڑے افسر ہیں سارا دن اپنے دفتر میں بیٹھے فائلیں دیکھتے رہتے ہیں یا کاروباری ہدایات دیتے رہتے ہیں رات کو دیر سے اپنے دفتر سے اٹھتے ہیں اور دفتر کے آگے موجود گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں گاڑی سے اُتر کر گھر میں داخل ہوتے ہیں کھانا کھاتے ہیں اور پھر کچھ دیر ٹی وی سے لطف اندوز ہونے کے بعد سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں داخل ہو جاتے ہیں واش روم بھی بیڈ روم کے ساتھ اٹیچ ہوتے ہیں اس لیے چلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ صبح ہوتی ہے صاحب پھر تیار ہوتے ہیں اور دفتر میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

پہلے کسان بہت محنت کرتے تھے صبح سویرے اُٹھ کر اپنے بیل اور ہل لے کر زمینوں پر چلے جاتے تھے اور ہل چلاتے ہوئے وہ کئی کلو میٹر چل لیتے تھے لیکن اب مشینوں نے کسانوں کو بھی سست کر دیا ہے اب وہ ٹریکٹر پر بیٹھ کر ہل چلاتے ہیں اگر اپنا ٹریکٹر موجود نہیں تو کسی دوسرے ٹریکٹر والے کو پیسے دے کر ہل چلوا لیتے ہیں یوں وہ گھروں میں ہی بیٹھے رہتے ہیں اس طرح نئے دور کا میٹھا زہر ان کی رگوں میں بھی سرایت کرتا جا رہا ہے۔

یہ تو آپ نے دیکھا ہے کہ گھر کے تمام آلات ریموٹ کنٹرول سے چلنے لگ گئے ہیں یعنی اے سی، پنکھے، ٹی وی بلکہ ہیٹر بھی ریموٹ والے مارکیٹ میں موجود ہیں۔ ایسی LED بھی آ گئی ہے جسے ریموٹ کنٹرول کی بھی ضرورت نہیں بلکہ انسانی آواز سے ہی وہ کنٹرول ہو رہی ہے یعنی اب آپ کو اپنے ہاتھ بھی ہلانے کی ضرورت نہیں رہی۔

دراصل یہ بڑی بڑی کمپنیاں جو دنیا پر چھائی ہوئی ہیں ان کا سرمایہ ہمارے جیسے ملکوں کے سالانہ بجٹ سے بھی زیادہ ہے اور اس سرمائے کو بڑھانے کے لیے وہ نت نئی ایجادات مارکیٹ میں لاتی ہیں اور لوگ اپنا معیار زندگی اونچا کرنے کے لیے وہ دھڑا دھڑ خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔

مجھے تو لگتا ہے کہ جس تیزی سے انسانی زندگی کو آرام طلبی کی طرف لے جایا جا رہا ہے دو چار ہزار سال بعد انسان صرف دماغ استعمال کرنے کے قابل رہ جائے گا اور اس کے ہاتھ اور پاؤں انتہائی کمزور ہو جائیں گے کیونکہ قدرت کا یہ اصول ہے کہ جسم کے جس حصے کو استعمال نہ کیا جائے وہ بے کار ہو جاتا ہے۔"

یہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ یاد رکھیں، حرکت میں برکت ہے۔

٭٭٭

پتھریلے راستوں، نوکیلے رویوں اور دردیلے رشتوں کی داستان ہوشربا۔
قارئین حکایت کے لیے خصوصی تحریر

پاڑیاں

اختر حسین شیخ

1952ء میں میرے دل نے یہ فیصلہ کر لیا کہ پاک فضاؤں کی نگہداشت کرنی چاہیے اس طرح میں فضائیہ میں بھرتی ہو گیا۔ یاد رہے کہ میں بھرتی کا مال ہرگز ہرگز نہیں تھا تاہم حالات ایسے ناگفتہ بہ تھے کہ خود آگے بڑھ کر عملی اقدام کرنا پڑا۔ لہو بہانے سے مجھے دلی نفرت تھی۔ فصیل جاں میں بجلیاں کڑک رہی تھیں کہ کوندے لپک رہے تھے ڈر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

ہماری ریڈار یونٹ موجودہ "شاہ نور" سٹوڈیو کے عقب میں کھلے ہموار میدان میں تعینات تھی ہمارے چاروں طرف تاحد نگاہ لہلہاتے کھیت ہی کھیت تھے۔

ہمارا مشرقی بازو اس وقت سلامت تھا گویا بنگالی بھائی ہمارے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ لاہور سے ڈیڑھ سو میل کے دائرے میں اور سطح زمین سے ایک لاکھ فٹ کی بلندی تک محو پرواز ہر شے ہمارے حلقہ اثر میں آتی تھی۔ کوئی ناپسندیدہ شے ہم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔

ہماری ریڈار یونٹ اڑھائی تین سو منظم تربیت یافتہ اہل جنوں افراد پر مشتمل تھی۔ میں خود ایک طویل اور از حد دشوار تربیت کے بعد اس قابل ہو چکا تھا کہ ہر مداخلت کار کی مذمت بھول کر اس کی خاطر خواہ مرمت کی جائے۔ اپنے متعلق میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ غلط حرکت سے فوراً مشتعل ہو جایا کرتا تھا۔ گویا مزاجاً بت پرست نہیں بلکہ غزنوی تھا۔ اگر کوئی درندہ گزند پہنچانے کی غرض سے میری طرف یا میری حفاظت میں رکھے اثاثے کی طرف لپکتا تو اس کے جبڑے چیر پھاڑ کے رکھ دینے پر میرا ایمان پختہ تھا۔

آج جب میں مذاکرات کا واویلا سنتا اور دیکھتا ہوں تو خون کھولنے لگتا ہے مگر وائے بے بسی کہ فالج نے مجھے عضو معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ پہلے عرض کیا ہے کہ ہماری یونٹ کے گرد و پیش تاحد نگاہ لہلہاتے کھیت تھے۔ دھان کے لاتعداد کھیت دیکھ کر بنگالی بھائیوں کو فخر کے ساتھ بے حد مسرت ہوتی وہ موقع ملتے ہی ان کی سیر کو نکل جاتے اور لمبے لمبے سانس لے کر مشام جاں کو اس خوشگوار مہک سے معطر کرتے ہوئے ایک ہی فقرہ ادا کرتے۔

دھان کا اتنا بڑا سمندر کس قدر خوبصورت ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بنیادی خوراک چاول تھی اور انہوں نے سرزمین بنگال میں یہ جلوہ یہ جلوگی دیکھی ہی نہ تھی وہاں تو ندی نالوں کا جال بچھا ہے لہٰذا وسیع و عریض اراضی پر کھیت کہاں سے آتے؟ برسبیل تذکرہ آج لاہور کے گرد و پیش بھی وہ منظر غائب ہو چکے ہیں۔

1849-50 میں جب انگریزوں نے سکھوں کی عسکری طاقت کو تباہ کر کے پنجاب پر قبضہ کیا تو دیوان لکھپت رائے کی سربراہی میں پہلی مردم شماری ہوئی اور لاہور کی آبادی پچاس ہزار دو سو نفوس پر مشتمل تھی اور آج 75 لاکھ کو چھو رہی ہے یاد رہے کہ شاہ نور سٹوڈیو کا علاقہ لاہور کی نواحی بستی ہوا کرتا تھا خیر! کہنے کا مطلب ہے کہ اس دور میں آبادی کا اژدہا اتنا زور آور نہیں ہوا تھا۔ بنگالیوں کا یہ جذبہ دیکھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کو مغربی پاکستان کا وہ علاقہ دکھایا جائے۔ جو دنیا کے بہترین چاول پیدا کرتا ہے یعنی لاہور، گجرات، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ، یہ فصل عوام کے ہاتھ نہیں آتی ہمارے حکمران دیگر ممالک کے حکمرانوں کو تعلقات کی بحالی کا خاطر خواہ تحفہ پیش کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک خیمے میں مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس کے نتیجے میں 2 بنگالی بابو، ایک پٹھان اور راقم اس منفرد سیر کو روانہ ہوئے۔ بنگالیوں میں لحاظ الدین عرف ونڈلو اور امیر الدین لاکھا شامل تھے پٹھان کا نام حمید الدین عرف میرا اور راقم کی عرفیت نل ورتا تھی گویا میرا، لاکھا، ونڈلو اور نل ورتا چار افراد کی یہ ٹولی نہ تھی چہار درویش کہلاتی تھی

نہ چنڈال چوکڑی بلکہ ان میں قدر مشترک یہ تھی کہ بقول شاعر:۔

چلو کہ جست جنوں خیز ہی کو اپنائیں
عبور ہوں گے نہ یہ طوفان اب سفینے سے

یاد رہے کہ ملک کے سیاسی حالات ناگفتہ بہ حد تک خراب ہو چکے تھے مگر ہم چشم اشک بار سے زیادہ دل بے قرار پر یقین رکھتے تھے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ دوست احباب کی یہ عرفیت کسی کو رسوا کرنے کے لئے نہ تھی بلکہ ہر فرد کے اوصاف کا مظہر ہوا کرتی تھی۔ مثلاً ونڈلو کے دانت بے حد شاندار تھے اور وہ یعنی لحاظ الدین موقع بے موقع ان کی نمائش کرتا رہتا تھا اس کی مسکراہٹ واقعی بڑی معصوم اور دلکش ہوا کرتی تھی آج بھی جب وہ مسکراہٹ یاد آتی ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

ٹیرے کی ایک آنکھ میں معمولی سا نقص تھا مگر پریڈ کے میدان میں اس کی کارکردگی دیوانی ہوا کرتی تھی لہذا ہم نے اسے ٹیرہ (کم عمر گھوڑے کا خطاب دے دیا) اس کا دوسرا وصف بھی شاندار تھا ایک تو اس کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ اردو انگریزی اس انداز میں بولتا کہ اہل زبان کو شرمندہ کر دیتا تیسری صفت بھی قابل ذکر ہے کہ اگر کوئی سفر درپیش ہوتا تو وہ اس کی پوری تیاری کرتا۔ ہماری یہ ٹولی ہیڈ مرالے دریائے چناب کے مغربی کنارے پہنچی تو دریا میں اس روز درمیانے درجے کا سیلاب تھا ونڈلو کا تعلق چٹاگانگ سے تھا جو مشرقی پاکستان کا انتہائی مشرقی علاقہ ہے یعنی برما کی سرحد کے قریب الٹے ہاتھ تھوڑے فاصلے پر اگرتلہ اور سیدھے ہاتھ کاکسس (coxis) بازار کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دریائے گنگا کا دہانہ جو مشہور سندر بن کہلاتا ہے۔

کنارے پر میں ذرا سنبھل کے کھڑا تھا کہ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا ونڈلو اور لاکھے کے لئے یہ ایک انکشاف تھا۔ دونوں نے مجھ پر فقرے کسنے شروع کر دیئے مثلاً آیا بڑا اہل ورنا تیرنا نہیں آتا اتنے شور دریا میں نہائے گا کیسے؟ وہ چونکہ خود ماہر تیراک تھے اور کسی جوان کا تیرنے سے دور ہونا ان کے تصور میں نہیں آ سکتا تھا۔ خیر! میں نے شدت خجالت چھپاتے ہوئے دریا کنارے سے ایک وزنی تربوز خریدا مجھے یاد ہے کہ یہ بڑا تربوز ہمیں 14 آنے میں ملا۔

ہم دوسرے کنارے جانے کو بے تاب تھے مگر دونوں بنگالی دریا کے بہاؤ سے لطف اندوز ہونے میں محو تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ جی بھر کے لطف اندوز ہو لئے تو ہم کشتی میں بیٹھے۔

میں نے تربوز کو "بودی" سے پکڑ کر اسے پانی میں ڈبو رکھا تھا۔ تربوز کی یہ شاخ اتنی لمبی نہیں تھی لہذا جب کشتی نے ہچکولہ لیا تو ناہموار تربوز میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا بے ساختہ میرے منہ سے کلمہ افسوس ادا ہوا مگر ونڈلو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بپھرے دریا میں چھلانگ لگا دی میں چیختا چلاتا ہی رہ گیا مگر ونڈلو تو مچھلی کی طرح لہروں کو کاٹتا ہوا تربوز تک پہنچ گیا اور تربوز لے آیا۔ میں اسے سرزنش کرنے لگا۔

اوئے کھوتے اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو......؟

یاد رہے کہ تمہارا تو ابھی جنازہ بھی جائز نہیں ہوا (ونڈلو کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی)۔

مجھے کیا ہو جاتا......؟ تمہارا اول تو چڑیا فق ہے اگر مزید بات کی تو میں کشتی سے کود کر تیرتا ہوا دوسرے کنارے پہنچ جاؤں گا یہ سن کر میں تو واقعی ڈر گیا اور منت سماجت سے اپنے ونڈلو کو منانے لگا حیرت کی بات یہ تھی کہ لاکھا خاموش تماشائی بنا بیٹھا رہا۔

میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔ "اچھا یار وہ یہ ذکر شیر بھول جاؤ میں تمہیں دریائے چناب کی داستان

سناتا ہوں جو بڑی دلچسپ ہے"

میں نے دوستوں کی طرف غور سے دیکھا "کیا دریائے گنگا سے بھی دلچسپ ہے؟" لاکھے نے پوچھا۔

فیصلہ تم خود کرنا" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

اصل میں انسانی دماغ قدرت کا انوکھا کرشمہ ہے بیک وقت بہت سے موضوعات سے نمٹتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا سوار تو ہم کشتی میں تھے مگر میرے ذہن میں مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والا واقعہ اودھم مچا رہا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ اسمبلی اجلاس جاری تھا کہ عوامی لیگ کے چند شر پسند اراکین نے کسی بات پر مشتعل ہو کر ڈپٹی سپیکر شاہد علی پر حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ بات میرے مطابق کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ اور میں اسی وجہ سے اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور اپنے دندلو پر برس پڑا۔ میرے دماغ میں پہلے تو یہ شعر آیا۔

مقید کر دیا سانپوں کو یہ کہہ کر سپیروں نے
یہ انسانوں کو انسانوں سے ڈسوانے کا موسم ہے

اس شعر کی گونج ابھی مدھم نہیں ہوئی تھی کہ دماغ کے کسی دوسرے کونے میں شور اٹھا آخر ہم جا کس طرف رہے ہیں یاد رہے کہ میرے دوست دریا کی لہروں سے لطف اٹھا رہے تھے۔

بہرحال! میں نے اپنے خیالات کو قابو میں لاتے ہوئے دریائے چناب کا احوال بیان کرنا شروع کیا۔ لاکھے اور دندلو کے ساتھ چند دوسرے کشتی سوار بھی ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے "یہ دریا اپنی گزرگاہ کے لحاظ دوسرے دریاؤں سے بالکل منفرد ہے" میں نے داستان گو کے انداز میں کہا۔

"عام دریا شمال سے جنوب کی طرف بہتے ہوئے کسی جھیل یا سمندر میں جا گرتے ہیں مگر یہ دریا جسے چن آب یعنی چاند کا پانی کہتے ہیں بھارت کے صوبہ ہماچل پردیش کے دارالحکومت شملہ کے قریب دو ندیوں چندرا اور بھاگا کے ملاپ سے وجود میں آتا ہے۔ سرآغاز تو یہ ندیاں شریف زادیوں کی طرح بہتی ہیں مگر "کیلانگ" کے مقام پر آ کر آپس میں بغل گیر ہو جاتی ہیں چنانچہ چندرا بھاگا نامی تند خو دریا معرض وجود میں آ جاتا ہے اور کیلانگ سے کشمیر کے شہر کشتواڑ کی طرف اسی نام سے رواں دواں رہتا ہے۔ مگر کشتواڑ کو اپنی لپیٹ میں لینے کے بعد یہ جنوب کا رُخ کرتا ہے اور اس کا نام چناب پڑ جاتا ہے۔ گویا اس میں چندرا نامی ندی کا وجود برقرار رہتا ہے۔

سیالکوٹ کے قریب مرالہ کے مقام پر یہ دریا پاکستان میں چناب کے نام سے داخل ہوتا ہے۔ اس کا بہاؤ بڑا خونخوار مشہور ہے جان لینے سے کم پر راضی نہیں ہوتا اس کی بے مروّتی ملاحظہ ہو کہ عشاق تک کو بھی معاف نہیں کرتا سوہنی جیسی خوش شکل لڑکی کو بھی اس نے معاف نہ کیا اور اسے بہا کے اسے چین آیا۔

خیر! وہ تو اپنی حماقت کا شکار ہوئی تھی کہ کچے گھڑے پر بیٹھ کر طوفان کا مقابلہ کرنے لگی تھی۔ میرے نے لقمہ دیا مگر ہم اس قصے میں جانا نہیں چاہتے لہٰذا رخ زیرِ نظر داستان کی طرف موڑتے ہیں۔ دریا کے دوسرے کنارے تک جاتے جاتے ہمارے اس تربوز کے بیج تک ٹھنڈے ہو چکے تھے جسے ہم نے کنارے سے خریدا تھا اور اب اسے پانی میں ڈبوئے ساتھ لے جا رہے تھے۔ یہ اندازہ چناب کے برفیلے پانی کو محسوس کر کے ہم نے لگایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شوریدہ سر لہروں کو دیکھ کر دونوں بنگالی بھائی بہت خوش ہو رہے تھے۔ لاکھے نے بے تکی بات کرتے ہوئے کہا اوئے "بل ورنے، کیا واقعی تیرنا نہیں جانتا۔

بل ورنا نامی پہلوان کی فری سٹائل کشتی کراچی میں ہوئی تھی جسے عوام نے بے حد پسند کیا وہ ایک شبہ

زور قسم کا پہلوان تھا مجھے چونکہ طاقت والے ہر کام میں منہ مارنے کی عادت تھی لہٰذا دوست احباب نے مجھے اسی عادت کی بناء پر بل ورنا کہنا شروع کر دیا۔ یہ خوشگوار یادیں بڑی طویل ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب ہم ریڈار یونٹ لے کر صوبہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ پر وارد ہوئے تو دوست احباب راقم کو پروفیسر "ڈھو" کہنے لگے پورا نام بھی ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔

پروفیسر ڈھو ڈھرن اینڈ چک سپیشلسٹ کہنے لگے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ اس پہاڑی علاقے میں اکثر احباب ڈھرن اور چک کے موذی درد میں مبتلا ہو جاتے اور یہ دکھ دور کرنے میں مجھے مہارت حاصل تھی۔ بلکہ ایک ستم ظریف دوست نے تو میرے خیمے کے عین سامنے اس نام کی تختی بھی لگا دی تھی بس اسی ہنسی مذاق میں وہ مشکل ترین وقت کٹ جاتا تھا......

طوفان باد و باراں ہو یا سیلاب ہم اہل جنوں سدا خوش و خرم رہا کرتے تھے۔ بعد میں تو وہاں کے اکلوتے سینما کے مالک کو بھی ہم نے قائل کر لیا اور وہ مہینے چھ شہر میں انگریزی فلمیں لانے لگا۔ پہلے اس سینما گھر میں اُلّو بولا کرتے تھے پھر ہمارے نعرے گونجنے لگے۔ اس نعرے بازی سے سینما کا مالک ہمارا بے حد ممنون ہوتا۔

ہماری کشتی کنارے لگتے دریا میں اونچے درجے کا سیلاب آ گیا اور دریا میں عجیب و غریب اقسام کی اشیاء بہتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

ہم اطمینان سے دوسرے کنارے بیٹھ گئے تو میرے نے اپنے بیگ سے چاقو نکالا اور تربوز کے دو حصے کر کے آدھا دندلو اور لاکھے کو دے دیا اور آدھے پیالہ نما تربوز میں ہم کھانے لگے۔ تربوز غالباً واحد پھل ہے جو کھانے کے برتن اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ دوسرا نمبر آم کا ہے مگر جاہل لوگ آم کو اس طریقے سے کھانے کو اچھا نہیں سمجھتے حالانکہ صفائی کے لحاظ سے یہ طریقہ بڑا احسن ہے بلکہ یہ طریقہ جب ہم نے امریکہ میں اپنے احباب کو سکھایا تو وہ مشرقی مہارت پر ایمان لے آئے اور ہماری ذہانت کی داد دینے لگے

ہم سکون سے ٹھنڈا میٹھا تربوز نوش جاں کر رہے تھے کہ ایک ناخوش گوار واقعہ رونما ہوا جو یادگار حد تک دلچسپ ثابت ہوا۔

بیلے میں سے ایک درویش نما شخص نکلا جس کے ہاتھ میں کھونڈا تھا (لمبی لاٹھی جس کا ایک سرا خمدار ہوتا ہے) کھونڈے کے خمدار سرے پر ایک گٹھڑی بندھی ہوئی تھی پھر اس درویش کے پیچھے تین لٹھ بردار برآمد ہوئے اور درویش سے تکرار کرنے لگے۔ ہم چاروں الگ تھلگ بیٹھے تھے مگر بیلے سے نکلنے والوں کے ارد گرد کشتی سے اترنے والے لوگ بھی اکٹھے ہونے لگے۔

درویش مسلسل انکار کیے جا رہا تھا جبکہ لٹھ بردار اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ دندلو بھاگ کر جائے فساد پر پہنچا اور واپس آ کر بتایا کہ درویش کے پاس ایک گٹھڑی ہے لٹھ بردار گٹھڑی دیکھنا چاہتے ہیں جبکہ درویش مرنے پر تلا بیٹھا ہے۔

آ کھتر بھائی یہ شالا لچا لفنگا لوگ درویش کو تنگ کر رہا ہے بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ گٹھڑی درویش کی ہے اگر وہ نہیں دکھانا چاہتا تو وہ لاٹھیوں والے زبردستی کیوں کر رہے ہیں۔

تم اس درویش کو یہاں لے آؤ پھر ہم دیکھ لیں گے۔ ان خدائی فوجداروں کو۔ میں نے نرم لہجے میں کہا کہ ہم کسی لفڑے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے مگر ہمارا لاکھا تو گویا پہلے سے اکڑ گیا۔ وہ بھاگ کر جائے فساد پر پہنچا اور لٹھ برداروں پر برسنے لگا تھوڑی دیر بعد وہ درویش کو لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ میں نے اس کے طور طریقے سے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا بلند حیثیت والا

تھا۔لہٰذا میں نے ذہن میں آنے والا پہلا نام لے کر اس سے کہا" ملک صاحب" آپ آرام سے ہمارے پاس تشریف رکھیں کوئی آپ سے زیادتی نہیں کر سکے گا۔

میرے "ملک صاحب! کہنے پر درویش نے چونک کر مجھے دیکھا پھر اس نے ایک بڑے پتھر پر اپنی پگڑی اُتار کر بچھائی اور بڑے احترام سے اس پر اپنی گٹھڑی رکھی اور کھونڈ کو درمیان سے پکڑ کر حریفوں سے مخاطب ہوا۔"

"اوئے واہیات گدھو! تم انجانے میں اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو اگر تم نے میری گٹھڑی کو ہاتھ بھی لگایا تو جان سے مار کر تمھیں دریا برد کر دوں گا" پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔اپنے کھونڈ سے اس نے گٹھڑی کے گرد ایک لکیر لگائی اور چیلنج کرنے والے انداز میں کہا، اگر تم اس لکیر کو عبور کرلو تو تمھیں منہ مانگا انعام دوں گا تاہم بھلائی اسی میں ہے کہ تم یہاں سے دفع دور ہو جاؤ ورنہ یہ موقع دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔

جس انداز سے اس نے اپنی لمبی لاٹھی پکڑی ہوئی تھی اس سے ثابت ہوتا تھا کہ درویش کو لٹھ بازی میں مہارت حاصل تھی اور اس کے حریف موت کو دعوت دے رہے تھے۔یہ اندازہ لگا کر میں نے دندلو اور لاکھے کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ یہ اُٹھائی گیرے درویش کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے اور اگر انہوں نے گٹھڑی کے قریب آنے کی ہمت کی تو بری طرح پٹ جائیں گے۔اس اندازے کی وجہ یہ تھی کہ میں خود گتکے بازی جانتا تھا اور درویش کا انداز ماہرانہ تھا۔وہ آدمی ہمت کر کے آگے بڑھے مگر پھر سب کی آنکھیں گویا دھوکا کھا گئیں درویش نے ماہرانہ انداز میں اپنے کھونڈ کو حرکت دی اور وہ دونوں اپنی کنپٹیوں پر ضرب کھا کر زمین بوس ہو گئے گرنے والوں کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے وہ اُٹھ ہی نہ سکیں گے۔تیسرا آدمی اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ کر وہاں سے بھاگ گیا۔ زمین بوس حریفوں پر درویش نے وار کرنا چاہا تو میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ملک صاحب! آپ کے دشمن بیکار ہو چکے ہیں گرے ہوئے کو مارنا جوانمردی کے خلاف ہے۔درویش نے ہاتھ روک لئے اور لمبی سانس لے کر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔

بسم اللہ کریں۔ میرے نے تربوز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے شریک طعام ہونے کی دعوت دی۔ درویش اُٹھ کر بہتے پانی سے ہاتھ دھوئے اور بسم اللہ کہہ کر ہمارے ساتھ تربوز کھانے لگا پہلے لقمے کو نگلتے ہی اس نے بلند آواز میں کہا تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ بعد ازاں اس نے اس آیت میں اضافہ کیا ہائے انسان تو واقعی خسارے میں ہے تو واقعی خسارے میں ہے یہ قرآن کی دوسری آیت کا ترجمہ تھا مقام شکر تھا کہ تربوز کے بیج تک ختم ہو چکے تھے جو دریائی پانی کی کارروائی تھی اور اسی وجہ سے درویش نے آیات کا ترجمہ کیا تھا۔

اوروں کے متعلق تو علم نہیں مگر میں شکم سیر ہو چکا تھا اور پھر لاکھے نے بھی ڈکارتے ہوئے کہا اتنا میٹھا اور لذیذ پھل میں نے پہلے کبھی نہیں کھایا تھا۔یہ دھلی زمین کا پھل ہے میرے نے اندر کی بات کہہ دی۔اب ہم سب خاموش سے ہو گئے۔لاکھے نے درویش سے کوئی سوال کرنے کی کوشش کی تو میں نے اشارے سے اسے خاموش کرا دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی گٹھڑی کے متعلق تجسس میں مبتلا ہو چکا تھا مگر سوال نامناسب تھا میں چاہتا تھا کہ درویش خود کچھ کہے یعنی جب مناسب سمجھے تب۔ میرے نے بھی میری تائید کی اس طرح خاموشی کافی طویل ہونے لگی تو میں نے نرم لہجے میں کہا۔ملک صاحب! اپنا تعارف تو کرائیں یار او خاموشی تو بوجھ بنتی جا رہی ہے۔

میں حیران ہوں کہ آپ کو کس نے خبر دی کہ میں ملک ہوں جی ہاں میرا نام...... ملک سجاول خاں ہے اور میں کشتواڑ کا رہنے والا ہوں...... یہ کہہ کر وہ نیم آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھنے لگا مگر اس کا انداز بڑا عجیب سا تھا

جیسے اس کی نگاہوں کا کوئی خاص ہدف نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھے غور سے دیکھنا شروع کیا تو میں نے اس کے خیالات کی گہرائی کو پالیا اور جواب میں صرف ایک شعر پڑھ دیا۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشہ اہل کرم دیکھتے ہیں

یہ شعر حالات کے عین مطابق تھا درویش یقیناً میرے طرز تخاطب پر ابھی تک حیران ہو رہا تھا حالانکہ میں نے تو محض اندازے سے اسے ملک صاحب کہا تھا مگر معلوم ہوا کہ اس کی ذات واقعی "ملک" تھی یاد رہے کہ یہ "ملک" بھی کشمیریوں کی ذات ہوتی ہے ہم تو گکے زئی قبیلے کو بھی کشمیری ہی قرار دیتے ہیں۔

ہم ہرگز نہیں پوچھیں گے کہ اس گٹھڑی میں کیا ہے؟ میرے نے بڑے نرم لہجے میں کہا ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کہ اس میں سونا چاندی یا دولت وغیرہ نہیں کیونکہ کوئی انسان جاگتی ہوش و حواس دولت کی حفاظت اس انداز سے نہیں کرتا اس گٹھڑی میں کوئی ایسی شے ہے جو غیروں کے لئے تو کوئی وقعت نہیں رکھتی مگر آپ کی اس شے سے جذباتی وابستگی ہے۔ اور ایسی وابستگی جس پر ہفت اقلیم کی دولت قربان کی جا سکتی ہے۔ اس سے زیادہ اس راز کا افشا آپ کو دکھ دے گا لہٰذا میں بلکہ ہم سب خاموش ہی رہیں گے۔ ایسے معاملات میں عربی کا بڑا مشہور مقولا ہے کہ

لو کلام الفضہ السکوت الذھب

(اگر کلام چاندی ہے تو خاموشی سونا، یعنی زر خالص)

بہت خوب درویش نے میرے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا یہ قول حضرت علیؓ کا ہے۔ جن کو رسول اکرم ﷺ نے علم کا دروازہ قرار دیا ہے اب ظاہر ہے کہ باب العلم سے اسی طرح کے اقوال کی توقع کی جانی چاہیئے۔ آپ میرے سچے ہمدرد ہیں اور آپ کی نیت میں ذرہ برابر فتور نہیں لہٰذا میں خود اپنی داستان غم و اندوہ بیان کرتا ہوں شائد آپ میرے جان لیوا بوجھ کو ہلکا کر سکیں۔ ملک صاحب نے تفصیل پیش کی۔ کیونکہ اب یہ بوجھ مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو پا رہا ممکن ہے کہ میں لڑکھڑا کر زمین پر گر جاؤں اگر ایسا ہوا تو میں اپنی زون کو روز محشر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔

سجاول صاحب میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آپ کی آزمائش ختم ہونے والی ہے۔ آپ بڑے شوق سے اپنی داستان غم بیان فرما دیں۔ انشاء اللہ ہر شے ٹھیک ہو جائے گی اور پھر ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں نے ایک ایک لفظ تول تول کر ادا کیا یہ لفظ "زون" تو کشمیری زبان کا ہے جس کا مفہوم چاند ہے یہ لفظ میں نے محمد الدین فوق صاحب کی تصنیف مکمل تاریخ کشمیر میں پڑھا تھا جو بڑی طویل کتاب ہے۔

"بالکل جناب! زون کشمیری زبان میں چاند کو کہتے ہیں۔ درویش نے میری تصدیق کرتے ہوئے کہا عجیب اتفاق ہے کہ زون بمعنی چاند اور اس دریا کے نام کا بڑا حصہ بھی چاند ہے اور اتفاق یہ ہے کہ "داستان زون" اسی چناب کے کنارے بیان ہونے والی ہے۔ میں کوشش کر کے نہایت اختصار کے ساتھ بیان کروں گا مجھے تو داستان بیان کرنے سے پیشتر ہی دلی سکون ملنے لگا ہے یہ آپ حضرات سے اس ملاقات کا ایک وقت مقرر تھا باقی میرا تعاقب کرنے والے یہ بندر تو بس بہانے تھے۔ اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ملاقات میں مسبب الاسباب کا دست قدرت کارفرما تھا اور ہے۔"

یقیناً ایسا ہی ہے۔ میرے اور لالے نے یک زبان ہو کر کہا کیونکہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔

اب ہمیں یقین آ گیا کہ ملک سجاول اپنی داستان سنانے پر راضی ہو گیا تھا۔ اور اپنائیت کو فروغ دینے کی

خاطر ہم نے اسے اپنا تعارف کرا دیا اور وہ بھی اصلی ناموں کے ساتھ بلحاظ الدین اور اسیر الدین کے متعلق یہ سن کر کہ ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے وہ بے حد خوش ہوا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پاکستان کی سالمیت کا حامی تھا چونکہ وہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ تھا لہٰذا دونوں بنگالیوں کے آبائی شہروں کے متعلق بھی اچھی طرح باخبر تھا۔

اس طرح ملک سجاول خان نے جو کچھ بیان کیا اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں۔

"میں کشتواڑ کے رئیس ابن رئیس ملک سلطان محمود کا اکلوتا بیٹا ہوں ہمارا خاندان نہ صرف معاشی لحاظ سے بڑا مضبوط بلکہ سیاسی اثر رسوخ کا بھی مالک رہا ہے۔ میرے والد صاحب نے میری تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور رئیسانہ انداز میں مجھے زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ میں نے دینی تعلیم بھی حاصل کی۔ عربی ادب سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔ عربی ادب کے دو پہلو مجھے بہت پسند آئے پہلا یہ کہ اللہ تعالیٰ بذات خود حسن و جمال لازوال کا مالک ہے اور دوسرا یہ کہ عشق ایک ایسی آگ ہے جو ماسوا کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ یہاں نمرے نے لقمہ دیتے ہوئے وہ مقولہ دہرا دیا جس کا ترجمہ ملک صاحب نے پیش کیا یعنی:

"العشق نار یحرق ماسوا اللہ۔ یہ مداخلت ہماری توجہ کا مظہر تھی جسے پسند کیا گیا۔ سامعین کی توجہ داستان گو کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

کشتواڑ میں ہماری وسیع و عریض اراضی ہے۔ مجھے سیر و سیاحت سے لڑکپن سے ہی دلچسپی رہی ہے۔ اپنے شوق کی تسکین کے لئے میں نے گھوڑ سواری میں مہارت حاصل کر لی۔ میرا ابلق گھوڑا بڑا خونخوار اور برق رفتار نکلا۔ میرے اشارے پر آگ میں بھی بے دریغ کود پڑتا اکثر اوقات اس نے درندوں تک کا مقابلہ کیا وہ اپنے اگلے دونوں سم اٹھا کر حملہ آور کو پسپا کرنے کا ماہر تھا ایک بار تو اس نے جنگلی باگھ کو مار بھگایا۔

خیر! میں اصل حکایت بیان کرتا ہوں سجاول نے کہا "زون خاتون سے میری ملاقات بڑے خونخوار ماحول میں ہوئی۔ ہمارے علاقے کی دو اشیاء مشہور رہی ہیں۔ زعفران اور ایک خاص قسم کی بکری جسے مقامی زبان میں "بجور" کہا جاتا ہے۔ یہاں میں نے لقمہ دیا۔ جی ہاں! یہ بکری تو واقعی بڑی لاجواب ہوتی ہے میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔ ملک سجاول نے مزید کہا ایک بار میں اپنی اراضی پر شکار کھیل رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک حیرت انگیز منظر دکھائی دیا ایک حسین و جمیل لڑکی جنگلی بھیڑیے کا مقابلہ کر رہی تھی ہوا یہ تھا کہ اس نامراد درندے نے اس دوشیزہ کی بکری پر حملہ کیا تو بہادر لڑکی نے اپنی بکری کے دفاع میں اس درندے پر حملہ کر دیا اس طرح شکاری خود شکار ہونے لگا مگر جس خطرے سے وہ بہادر لڑکی بے خبر تھی مجھے وہ دکھائی دے گیا۔ ملک صاحب کا انداز بیان واقعی دلچسپ تھا اور چونکہ "دنلو" تو خود پہاڑی علاقے میرا کا باسی تھا لہٰذا اس کی دلچسپی دیدنی تھی۔

جس پہاڑی کے دامن میں دوشیزہ اور بھیڑیا نبرد آزما تھے اسی کی چوٹی پر ایک اور بھیڑیا اس لڑکی پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا تھا اور اگر وہ حملہ کر دیتا تو دوشیزہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں نے برق رفتاری سے اس پر فائر داغ دیا مگر میرے فائر سے ایک پل پہلے اس نامراد نے دوشیزہ پر چھلانگ لگا دی اب میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ میں نے اپنے برق رفتار کو اشارہ کیا تو وہ بھی چھلانگ لگا کر میدان جنگ میں کود گیا۔

اس طرح پہلے دوسرے مداخلت کار بھیڑیے کی وجہ سے طاقت کا توازن جو دوشیزہ کے خلاف تھا اب اس کے حق میں ہو گیا پہلے حملہ آور کو تو دوشیزہ نے اپنی کلہاڑی کے وار سے تقریباً بیکار کر ہی دیا تھا مگر اس دوسرے نامراد

نے اس کی ٹانگ اپنے منہ میں لے رکھی تھی اور اسے بھنبھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے حلق سے خوفناک غرّاہٹیں خارج کر کے دوشیزہ کو خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔

میرے برق رفتار نے الف ہو کر دونوں سم دوسرے مداخلت کار کی کمر پر مارے جس سے درندے کی غرّاہٹیں تو دم توڑ گئیں مگر اس نے دوشیزہ کی ٹانگ بدستور اپنے جبڑوں میں لئے رکھی۔ میں نے چھلانگ لگائی اور حملہ آور بھیڑیے کے اوپر کود گیا اپنی طویل تربیت کی بدولت خود بخود میرا شکاری خنجر میرے ہاتھ میں آ گیا جسے میں نے پوری قوت سے بھیڑیے کے جسم میں گھونپ دیا۔ میں نے اس پر بس نہیں کی بلکہ دوسرے وار سے کا اس نرخرہ ہی کاٹ دیا تب جا کر دوشیزہ کی ٹانگ آزاد ہوئی اب میں نے اس نیم مردہ درندے کو گھسیٹ کر زخمی دوشیزہ سے دور کر دیا اور دوشیزہ کو سہارا دے کر جائے فساد سے دور لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ نئی جگہ پر دوشیزہ کو لٹا کر میں دوسری بار ان بھیڑیوں کی طرف متوجہ ہونے کے لئے دوشیزہ سے الگ ہونے کی کوشش کی تو وہ لرزہ براندام لڑکی نے مجھ سے الگ ہونے سے انکار کر دیا اور مجھ سے لپٹ کر کہا خوف سے میرا دم نکل جائے گا خدا رسول کے واسطے مجھ سے دور نہ جائیں۔ دوشیزہ نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

اوئے پاگل لڑکی! میں دور نہیں جا رہا بلکہ ان ناہنجاروں کا خاتمہ کرنے جا رہا ہوں ایسا نہ ہو کہ وہ پھر حملہ کر دیں بس پل دو پل مزید برداشت کر لو میں بس ابھی آیا۔ یہ کہہ کر میں نے اسے آرام سے زمین پر لٹا دیا اور خود زخمی درندوں کے قریب جا کر ان کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں بے شک اب دم خم نہیں رہا تھا لہٰذا میں نے دونوں کے سر کاٹ کر دور پھینک دئے۔ دوشیزہ خوف زدہ نگاہوں سے یہ کارروائی دیکھتی رہی...... اور آخر کار مطمئن سی ہو گئی۔ تب میں اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ میرے جسم پر خون ہی خون تھا۔ جو یقیناً میرا نہیں تھا بلکہ دوشیزہ اور اس پر حملہ کرنے والوں کا تھا تاہم میری ظاہری حالت یقیناً بڑی ڈراؤنی رہی ہو گی کیونکہ مجھے خون میں لت پت دیکھ کر میرے اہل خانہ سخت گھبرا گئے۔ ان میں سرفہرست تو میری اماں حبہ خاتون تھی جس نے چلانا شروع کر دیا میں نے اسے بمشکل خاموش کرایا اور دوشیزہ کو لے جا کر اپنے پلنگ پر لٹا دیا۔ میری ماں بھی میرے پیچھے آ گئی اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگی مگر میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا، آپ مجھے دم تو لینے دیں سب کچھ بتا دوں گا۔

☆☆☆

یاد رہے کہ میں حبہ خاتون کا بے حد احترام کیا کرتا تھا بلکہ اسے اپنی مرحومہ والدہ صاحبہ کا نعم البدل قرار دے چکا تھا لہٰذا میرے کرخت لہجے نے اسے خاموش کرا دیا اور اس نے صورت حال کی گھمبیرتا کا اندازہ لگا لیا۔ حالات قابو میں آئے تو میں نے اپنے تجربہ کار خادم خاص "فیض رسول" سے کہا جیپ لے جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو فوراً لاؤ۔ یہ ڈاکٹر ہمارا خاندانی معالج تھا اور ہماری حویلی ہی میں رہتا تھا۔ فیض رسول کو میں نے زخم کی کی نوعیت کے متعلق بھی بتا دیا تا کہ معالج پوری تیاری کر کے آئے۔ بھیڑیے کا سن کر میرا نوکر سب کچھ سمجھ گیا مزید غور سے سوالات کیے بغیر فوراً روانہ ہو گیا۔

میری ماں نے جب پُرسکون ہونے کے بعد زخمی دوشیزہ کو دیکھا تو مزید واویلا مچا کر کہنے لگی ہائے! یہ اپنی "زون" ہے۔ غالباً وہ گھبراہٹ کے باعث پہلے اسے دیکھ نہ پائیں تھی۔ ہاں اماں! میں جانتا ہوں کہ یہ "زون خاتون" ہے اسی لئے تو میں نے ان درندوں کا خاتمہ کیا مگر میرے خیال میں اس وقت کوئی انسان بھی شکار ہو رہا ہوتا تو میں یہی کچھ کرتا۔ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ اس وقت میرا حلق سوکھ رہا تھا لہٰذا میں نے حبہ

خاتون سے مشروب طلب کیا۔

اے لو! میں بھی کتنی واہیات ہوں میرا بیٹا درندوں سے جنگ کر کے لوٹا ہے اور میں نے اسے پانی تک نہیں پوچھا یہ کہہ کر جب خاتون اپنے اصلی کردار پر آ گئی۔ یہ سچ ہے کہ یہ خاتون مجھ پر جان چھڑکتی تھی اور اس نے مجھے دودھ پلا کر پالا پوسا تھا کہ میری مرحومہ والدہ تو مجھے جنم دینے کے فوراً بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اب یہی میری ماں تھی اور میں اس کا لاڈلا بیٹا۔

ہمارا ڈاکٹر بڑا تجربہ کار اور اپنے پیشے کا حق ادا کرنے والا شخص تھا میرے والد صاحب نے کچھ سوچ کر ہی اسے منتخب کیا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے خدام کو کبھی نوکر چاکر سمجھا ہی نہ تھا بلکہ ان سب کو ہم خاندان کا حصہ قرار دیتے تھے۔ کشمیری عوام تو ظلم کی چکی میں پس رہے تھے مگر ہمارے ہاں کا رویہ اس سے بالکل برعکس تھا مجھے یاد ہے کہ تمام خدام کی مکمل کفالت والد صاحب خود فرماتے تھے۔ ویسے بھی ہمارے پاس خدا کا دیا بہت کچھ تھا ایسے میں بخل سے کام لینا شرفاء کا دستور نہیں ہو سکتا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کہ ہمارے خدام اپنے آپ کو ملک خاندان کا حصہ سمجھتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے ذاتی مفاد کو ہمارے خاندانی مفاد پر قربان کرنے میں ایک پل نہ لگایا۔ ڈاکٹر صاحب زون کی مرہم پٹی سے 2 گھنٹے بعد فارغ ہوئے تو ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ڈاکٹر کے علاوہ حویلی کے دوسرے افراد بھی زون کی بہادری کے گن گا رہے تھے مگر میری کیفیت سب سے مختلف تھی میں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے زون کو بچا کر اپنے آپ کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اس وقت میری ایک ہی دلی تمنا تھی کہ کاش اس کے سارے زخم مجھے مل جائیں یا کم از کم یہ ہو کہ اس کے زخموں کا سارا درد مجھے لگ جائے یہ بڑی عجیب بات تھی۔ سیانے اسے عشق سے بڑھ کر جذبے سے تعبیر کرتے ہیں۔

کہ سنگ تجھ پہ گرے اور چوٹ آئے مجھے

یہ رویہ واقعی مجذوبانہ ہوتا ہے۔ کافی دیر بعد ٹیرے نے یہ دوسری مداخلت کی ورنہ ہم سب ہمہ تن گوش یہ داستان ہوشربا سننے میں محو تھے اور اب یہ بھی سچ ہے کہ میں ملک سجاول کی کیفیت سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ بعض اوقات ایک پل صدیوں کی محبت پر بھاری ہوتا ہے۔ یہ کوئی خاص گھڑی ہوتی ہے جو آپ کے سارے اندرونی نظام میں انقلاب برپا کر دیتی ہے اور اسی ایک پل کو آپ ساری زندگی پر پھیلا کر سکون حاصل کرتے رہے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کبھی تمام عمر آپ کسی کے ساتھ رہ کر اجنبی کے اجنبی ہی رہیں ہیں اور اس ایک رنگین لمحے کو ترستے ترستے زیر زمین سو جاتے ہیں۔ یہاں میں نے سجاول کی طرف دیکھ کر سیف الدین سیف کا شعر پڑھا۔

کوئی ایسا اہل دل ہو کہ فسانہ محبت
میں اسے سنا کر روؤں وہ مجھ سنا کر روئے

بہت خوب اختر صاحب آپ میری حالت تک رسائی کر چکے ہیں حیرت انگیز۔

آپ غالباً پہلے شخص ہیں جس نے ایسا کیا ہے۔ مگر یہ تو اوپر والے کا کرم ہو گیا یہ کہہ کر اسی غزل کا مطلع پڑھ کر ہم سب کو حیران کر دیا۔

میری داستان حسرت وہ سنا سنا کے روئے
مجھے آزمانے والے مجھے آزما کے روئے

اب بھلا ٹیرا خاموش کیسے رہتا اس نے اپنے خاص لہجے میں کہا تو آپ دونوں نے سیف الدین کا یہ دیوان "خم کاکل" پڑھ رکھا ہے۔ یہ غزل اس دیوان کی جان ہے لیکن اب ہمیں ملک صاحب کے سفر عشق کی بقیہ داستان بھی سن لینی چاہیے کیونکہ گداز دلوں کی روداد دلوں کو گداز عطا کرتی ہے اور محبت تو ویسے بھی کائنات کا جوہر ہوتا ہے جسے ایک پنجابی شاعر غول یعنی اصل زر

قرار دیتا ہے۔ میرے کے منہ سے یہ سن کر مجھے سب سے زیادہ حیرت ہوئی اگرچہ میں جانتا تھا کہ اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ سید وارث شاہ کے کلام سے بھی باخبر ہوگا۔

زخمی تو زون خاتون تھی مگر حالت میری دگرگوں ہو رہی تھی۔ وہ رات مجھ پر بڑی بھاری پڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر مرہم پٹی سے فارغ ہونے کے بعد اسے مسکن دوا دے گیا تھا اور اب وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی میں اس کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھا ٹکٹکی لگائے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی سانسوں کا سلسلہ ہموار اور پُرسکون کیفیت کا مظہر تھا۔ ان چند لمحات میں میرے خیال میں محبت کے سارے مقامات میں نے طے کر لئے۔ جانے وہ کیسی جادوئی گھڑیاں تھیں جنھوں نے مجھے اندر سے جلانا شروع کر دیا مگر اس جلن پر دنیا جہان کے سارے سکھ قربان کئے جا سکتے تھے۔ اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ ثابت کرتا تھا وہ جسمانی دکھ درد سے بہت دور تھی جو میرے لئے مقام مسرت تھا۔

ڈاکٹر سے میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ زون کی پنڈلیوں کا کیا بنے گا کہ ان کا گوشت غائب ہے مگر ڈاکٹر نے مجھے تسلی دی کہ انسانی جسم میں صرف دماغ کے خلیے (cell) دوبارہ پیدا نہیں ہوتے باقی سارا گوشت ازسرنو اگایا جا سکتا ہے اور اس کے لئے ہم لوگ پپیتے کا استعمال کرتے ہیں اصل میں اس پھل میں ایک کارآمد شے "پے پین" ہوتی ہے۔ اس خاص شے کے ٹیکے بھی دستیاب ہیں مگر وہ بے حد مہنگے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ڈاکٹر لوگ نسبتاً سستی شے یعنی پپیتا استعمال کرتے ہیں۔ میں نے فوراً کہا ڈاکٹر صاحب دام وغیرہ بھول جائیں صرف یہ بتائیں کہ زیادہ مفید ٹیکے ہیں یا یہ پھل اگر ٹیکے زیادہ سود مند ہیں تو وہ ہر قیمت پر آپ کو فراہم کر دیئے جائیں گے۔ ٹیکے تو یقیناً زیادہ مناسب ہیں ڈاکٹر نے جواب دیا۔ تو ٹھیک ہے کل اس وقت تک آپ کو ایک درجن ٹیکے آپ کے مل جائیں گے مگر میری درخواست ہے کہ ٹیکہ لگاتے وقت زون کو کسی قسم کی معمولی سی تکلیف بھی نہیں ہونی چاہیے۔

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے بڑے غور سے مجھے دیکھا پھر مسکرا کر اس نے کہا ایک شیشی لوکل انس تھی سیا کی بھی منگوا لیں جو انسانی جسم کو عارضی طور پر بے حس کر دیتی ہے اور ٹیکہ لگنے کے بعد وہ حصہ تھوڑی دیر بعد نارمل ہو جاتا ہے۔ مگر ہم نے کبھی اس طرح ٹیکہ نہیں لگایا کہ یہ چبھن تو بالکل معمولی ہوتی ہے مگر میں نے ڈاکٹر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب میں چاہتا ہوں کہ زون کو ٹیکے کی معمولی چبھن بھی نہ ہو۔ اخراجات کی آپ پروا نہ کریں یہ کہہ کر میں اپنے خادم خاص کو طلب کیا اور ایک بڑی رقم اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ وہ فوراً سری نگر سے مطلوبہ ادویات لے آئے بلکہ ٹیکہ لگانے کا دوسرا سامان بھی خرید لائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا ڈاکٹر بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا کہ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا مگر اظہار خیال سے گریز کیا۔

اس طرح میری زون کا علاج شروع ہوا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ واقعی اس کی پنڈلی کا گوشت بھی دوبارہ پیدا ہونے لگا تھا۔ یہ غالباً دوسرے ہفتے کا ذکر ہے کہ میں نے ڈاکٹر کو مسکن ادویات کم سے کم استعمال کرنے کی درخواست داغ دی جس پر انہوں نے تبصرہ کیا کہ مسکن ادویات کا زیادہ استعمال اچھا نہیں ہوتا مگر ان کا نعم البدل بھی تو ہونا چاہیے۔ مگر اس نے خود ہی جواب دیا۔ میں نے ایک بار ایک درویش کو دیکھا تھا جس نے اپنے ہاتھ سے چھو کر مریض کے درد کو کم کر دیا تھا گویا مسکن دوا کا نعم البدل ہونا ضرور ہے۔

حضرت بلبل شاہ کے مزار پر میں نے ایک درویش کو یہ کہتے بھی سنا ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص دل سے یہ کوشش کرے تو ایسا ممکن ہے۔ یعنی اتنا خلوص جس میں دل کی رغبت اور روح کا میلان دونوں شامل ہوں یہ کارنامہ سر انجام دے سکتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے جواباً کہا۔ خلوص کی بات سن کر میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا اسے اہل دل قوت ایمانی قرار دے کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں مگر میں اسے حقیقی کرشمہ سمجھتا تھا اور اب مجھے اپنے جذبہ صادق کو آزمانا تھا۔

☆☆☆

میری ہدایت پر نشلی ادویات کا استعمال نہ ہونے کے برابر کر دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں زون آدھی رات سے ذرا پہلے ہی گہری نیند سے بیدار ہو کر کراہنے لگی۔ میں تو ایک پل بھی اس سے دور نہیں رہتا تھا اسی کے کمرے میں اپنے سونے کا انتظام میں نے کرا لیا تھا۔ زون نے اپنی روشن آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کی مسکراہٹ اتنی بے جان تھی کہ میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ درد کے گہرے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں پوچھا جان من! کیا درد زیادہ ہو رہا ہے؟ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا آپ کب آئے؟

میں یہاں سے کہیں گیا ہی نہیں تو آتا کہاں سے تھا۔ میں نے کہا تو اس نے حیران ہو کر صرف اس قدر کہا۔

میں جانتی تھی کہ آپ ہی مجھے سنبھالیں گے۔ اللہ تیرا شکر ہے کہ تُو نے مجھے اس قدر سہارا عطا کر دیا۔ اس کے بعد اس نے میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا میرے زخم میں درد کا طوفان کروٹیں لے رہا ہے۔

زون! تُو میری زندگی کا کل اثاثہ بن چکی ہے اور آج میں تجھے اس موذی درد سے خود نجات دلاؤں گا یہ کہہ کر میں نے روئی کا بنڈل کھولا اور اس کی پٹی پر بچھا کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پہلے تو اس نے میری کارروائی کو حیرت سے دیکھا پھر جیسے کیف و سرور سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ زون کو میرے لمس نے بے حد سکون پہنچایا ہے گویا میرا جذبہ صادق تھا اور مسکن دوا کا بدل بن سکتا ہے۔

ہائے اللہ آپ کے ہاتھ میں سے شفا آور لہریں نکل کر میرا درد چوس رہی ہیں، یہ تو کرامت ہی ہو گی۔ پھر جانے کیسے ہوا کہ میرے ہاتھ کا دباؤ ذرا زیادہ ہو گیا اور زون کے منہ سے "آہ" نکل گئی تو میں نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ تب میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اگر میرے ہاتھ سے سکون آور شعاعیں نکل کر "زون" کو آرام فراہم کر سکتی تھیں تو کیا ضروری ہے کہ زخمی جگہ پہ ہاتھ رکھا جائے میں نے فوراً ہی اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور اس کے سرہانے کی طرف آ کر اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ اور ایک بار پھر حیرت انگیز کرشمہ ہوا۔ اس کی آنکھیں پھر بوجھل ہونے لگیں اور اس نے اپنی آنکھوں کے دریچے بند کر لئے۔

میرے سجاول میری روح کے بھال میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا مگر اب درد غائب ہو گیا ہے آہ! کس قدر سکون آ رہا ہے

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

میں نے موقع کی مناسبت سے شعر پڑھا تو سجاول نے مسکرا کر دیکھا۔

جی بالکل کچھ ایسی ہی بات زون نے بھی کہی تھی۔ اور اس رات زون بغیر کسی درد کے گہری نیند سو گئی یہ الگ بات کہ مجھے رت جگا کرنا پڑا پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ کہ میں رات گئے تک اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہتا اور زون گہری نیند سوئی رہتی مگر آخر تا بکہ وہ تمن

راتوں کے جگراتے نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور آخر چوتھی رات جب مجھے نیند نے زیادہ تنگ کیا تو زون نے انوکھی تجویز پیش کر کے مجھے امتحان میں ڈال دیا۔

اُس نے پلنگ پر جگہ بناتے ہوئے کہا کہ آپ آرام سے یہاں لیٹ جائیں اور اپنا ہاتھ میرے جسم کے کسی حصے پر رکھ دیں۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے اصل میں آپ کے جسم کے ہر حصے سے میرے لئے وہ شفا کی لہریں خارج ہوتی ہیں جو میرا درد دور کر دیتی ہیں۔

مگر زون یہ تو بڑی بے حیائی والی بات ہے۔

یہ کارروائی ایک مریض کا علاج کرنے کی غرض سے کی جا رہی ہے اور اس میں بے حیائی والی کوئی بات نہیں ۔اگر آپ پسند کریں تو کل صبح ہم اپنے اپنے درمیان سے یہ دیوار مسمار کر سکتے ہیں میں بات کی تہہ تک پہنچا تو دھک سے رہ گیا۔ وہ واضح طور پر مجھ سے شادی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ میں نے بس ایک پل سوچا اور پھر اس کی ہاں میں ہاں ملا دی بھلا اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔

میں نے صبح ہوتے ہی یہ خوشخبری اپنی انعجب خاتون کو سنائی پھر پل بھر میں حویلی کا ماحول ہی بدل گیا۔ صرف ایک دن میں سارا انتظام ہو گیا اور ہم غروب آفتاب سے پہلے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے وجہ یہی تھی کہ زون ایک پل کے لئے بھی میری جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں یہ تجربہ بارہا کر چکا تھا میں ایک پل کے لئے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی سے اٹھاتا تو وہ پٹ سے آنکھیں کھول دیتی۔ اب میری سمجھ میں عربی کا وہ فقرہ آ گیا تھا۔ جس میں محبت یا عشق کو آگ قرار دیا گیا تھا یہ کہہ کر ملک سجاول نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا تو میرے نے جواب دیا۔

یہ مقام عشق نہیں بلکہ اسے "جذبہ" کہتے ہیں آپ نے دیکھا ہو گا کہ مجذوب اکثر اوقات ناقابل فہم قسم کی حرکات کر جاتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت وہ دیوانے نہیں بلکہ بلند مرتبت فرزانے ہوتے ہیں۔ حمید الدین خاموش ہوا تو سجاول نے مدھم سی آواز میں کہا" آپ درست فرماتے ہیں" اسی بناء پر حکماء عشق کو بھی شدت کے لحاظ سے عارضہ قرار دیتے ہیں۔ میں نے اس جذبے کا دوسرا پہلو اجاگر کرتے ہوئے کہا۔ میں بھی حکماء کے اس قول سے اتفاق کرتا ہوں۔ سجاول نے میری تائید میں کہا ۔میں نے محسوس کیا کہ ہمارے بنگالی بھائی خاموش بیٹھے تھے لہٰذا ان کو شامل کرنے کی غرض سے میں نے یہ سوال ان سے کیا تو اسیر الدین نے جامع جواب دے کر ہم سب کو حیران کر دیا۔

بات یہ ہے کہ اس قسم کے عشق میں نفع نقصان کا معیار بدل جاتا ہے اس میں صرف دیا جاتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اسیر الدین لاکھے نے مختصر مگر جامع جواب دے کر سب کو حیران کر دیا۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے رشتے میں صرف دیا جاتا ہے لیا نہیں جاتا اس طرح ایسے لوگ عام دنیا کے معاملات میں چل نہیں سکتے۔

بہت خوب حمید الدین نے اس کے جواب کو پسند کرتے ہوئے ہم سب کی ترجمانی کر دی۔

یہ سن کر سجاول ایک بار پھر لب کشا ہوا۔ آپ میری حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں گویا میں بھی دنیاوی معاملات کے قابل نہیں رہا تھا اور ہماری شادی بھی سارے جہان سے انوکھی تھی۔ میں نے آزما کر دیکھا تھا کہ رات کو تھوڑی دیر کے لئے زون سے الگ ہو جاتا تو وہ گہری نیند میں ہوتے ہوئے بھی پٹ سے آنکھیں کھول کر پوچھتی......کیا ہو گیا ہے؟

یہاں میں نے اپنا ہی ایک شعر پڑھا:

رموز عشق و محبت سے میں نہیں واقف
رہی ہے اس کی ضرورت مجھے ہوا کی طرح

(اس داستان ہوشربا کا آخری حصہ آگلے ماہ)

آج تو مجھے اپنی مردانگی دکھائی دو تم نے پڑھا بھی بہت ہوگا اور پڑھایا بھی مگر میں آج جو سبق تمہیں دوں گی وہ تم نے کبھی نہیں پڑھا ہوگا نہ اسے کبھی بھولو گے

راوی: نصر اقبال

تحریر: خادم حسین مجاہد

آزمائش

میرا تعلق ایک نیم متوسط غریب گھرانے سے ہے اللہ تعالیٰ نے ذہن ایسا عطا کیا تھا کہ ہر کلاس میں پوزیشن لی میٹرک کیا تو والد صاحب فوت ہو گئے۔ بھائیوں نے جیسے تیسے ہمت کر کے کالج میں داخل کرایا کچھ اخراجات وہ ادا کرتے تھے کچھ میں چھوٹی موٹی ٹیوشن سے پورا کرتا تھا۔ ایک اکیڈمی سے ہوم ٹیوشن کے لیے رابطہ کیا جو ایک مخصوص فیس کے بدلے اپنی ضمانت پر ہوم ٹیوشن مہیا کرتی تھی۔ بڑے شہروں میں ایسی تعلیمی اکیڈمیاں جگہ جگہ کھلی ہوئی ہیں جو ریگولر کلاسز کے علاوہ پہلے مہینے کی ٹیوشن فیس کے عوض مختلف علاقوں میں مہنگی ٹیوشنز دلواتی ہیں عموماً ایک ہی گھر میں دو تین بہن بھائیوں کی ٹیوشن مل جاتی ہے جو کہ یونیورسٹی اخراجات کے لیے کافی ہوتی ہے کیونکہ امراء کے بچے عموماً مہنگے انگلش میڈیم سکولوں سے پڑھتے ہیں اسی حساب سے ان کا سلیبس بھی کافی مشکل ہوتا ہے جس کی اچھی ٹیوشن فیس مل جاتی ہے۔

چھوٹے شہروں میں کالج کے اخراجات بھی یونیورسٹی کی نسبت کم ہوتے ہیں اور ٹیوشن فیس بھی کم ملتی ہے بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے جو بہر طور چلتا ہی رہتا ہے۔

ہفتہ بھر بعد مجھے اکیڈمی والوں نے ایک پوش علاقے کی ایک کوٹھی کا ایڈریس دیا جہاں تین بہن بھائیوں کے لیے ٹیچر کی ضرورت تھی میرے پاس اُن دنوں بائیک نہیں تھی اس لیے سٹاپ تک ویگن میں اور باقی پیدل چل کر اس کوٹھی تک پہنچا۔ کوٹھی کی تعمیر اور آرائش مکینوں کی امارت اور اعلیٰ ذوق کو ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے ڈور بیل بجائی تو ایک بچے نے دروازہ کھول دیا۔ فوراً ہی ایک ملازمہ کولڈ ڈرنک لے کر آ گئی کیونکہ گرمی کا موسم تھا اس لیے مجھے اس کی طلب بھی ہو رہی تھی تھوڑی دیر بعد اندرونی دروازہ کھلا اور ایک خاتون تین بچوں کے ہمراہ اندر داخل ہوئی ایک بچہ تو وہی تھا جس نے دروازہ کھولا تھا وہ اس سے چھوٹے بہن بھائی تھے۔ خاتون کی عمر تیس سے زیادہ نہیں لگ رہی تھی ممکن ہے

کچھ زیادہ ہوا اور خوشحالی اور میک اپ کی وجہ سے کم محسوس ہو رہی ہو مجموعی طور پر خاتون جاذب نظر تھی اور اس کے بچے بھی خوبصورت تھے۔ رسمی تعارف کے بعد خاتون نے بتایا کہ اس کے بچے کانونٹ میں پڑھتے ہیں اگر آپ ان کو اچھے طریقے سے پڑھا سکتے ہیں تو ہم آپ کو اچھی فیس دیں گے۔ میں نے بچوں سے کتابیں منگوا کر دیکھیں وہ با ترتیب فائیو، فور اور ٹو میں پڑھتے تھے میں نے خاتون کو تسلی دی کہ میں یہ سلیبس عمدہ طریقے سے اور با آسانی پڑھا سکتا ہوں لیکن میری فیس دس ہزار روپے ہوگی چونکہ یہ ذرا پرانی بات ہے ان دنوں دس ہزار معقول رقم تھی۔ جس سے میرے تمام اخراجات پورے ہو سکتے تھے۔ خاتون نے کچھ ردو کد کی کہ یہ رقم زیادہ ہے میں کچھ کم کروں۔ میں نے صاف بتا دیا کہ یہ سلیبس اس سے کم میں پڑھانا میرے لیے ممکن نہیں کیونکہ مجھے ہر روز سفر کر کے آنا ہوگا جس میں کافی وقت اور رقم لگے گی بہر حال انہوں نے اتنی ہی فیس دینے پر آمادگی ظاہر کر دی تو میں نے اسی دن سے پڑھانے کا آغاز کر دیا پڑھانے کے دوران خاتون بچوں اور میرے لیے کچھ نہ کچھ بھجواتی رہی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی مہمان نواز قسم کے لوگ تھے۔

تین چار دنوں میں بچے اور خاتون میری ٹیچنگ سے مطمئن ہو گئے اور اب وہ مجھے کھانا کھلائے بغیر نہ آنے دیتے۔ کھانے کے دوران خاتون مجھ سے میرے بارے میں پوچھتی رہتی۔ جس کا میں مختصراً جواب دے دیتا وہ اپنے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ بتاتی رہتی۔ اسی سے مجھے پتہ چلا کہ خاتون کا نام فرزانہ ہے پہلے ان کے حالات اچھے نہیں تھے کیونکہ ان کے میاں جاب کرتے تھے مگر پانچ سال پہلے وہ بیرون ملک چلے گئے تھے جہاں سے وہ دو سال بعد ایک ماہ کے لیے آتے تھے جس کے لیے ٹکٹ وغیرہ کمپنی مہیا کرتی تھی۔ ان تین بچوں کے علاوہ ان کی ایک اور چھوٹی بچی بھی تھی جو نانی کے پاس ہوتی تھی اور ابھی اس کی عمر سکول میں داخل ہونے کی نہ تھی۔ ملازمہ بیوہ عورت تھی اور ان کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ جس سے انہیں کچھ حفاظت کا خیال رہتا تھا ویسے ان کا میکہ بھی قریب تھا ضرورت پڑنے پر وہ فون کر کے کسی کو بھی وہاں سے بلوا سکتی تھی۔ گاڑی وہ ویسے ہی خود ڈرائیو کرتی تھی اس لیے ڈرائیور کی ضرورت نہ تھی نہ کوئی چوکیدار تھا۔

دس بارہ دن بعد مجھے فرزانہ خاتون کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی اب وہ پڑھانے کے دوران سارا وقت ہمارے پاس ہی بیٹھی رہتی۔ جس سے مجھے کچھ الجھن بھی ہوتی مگر میں کیا کہہ سکتا تھا ان کا گھر تھا اور وہ یہ حق رکھتی تھی کہ دیکھیں کہ میں ان کے بچوں کو کیسا پڑھا رہا ہوں لیکن اب وہ تیز میک اپ کے ساتھ بھڑکیلے لباس پہننے لگی تھی ان کے انداز میں بھی بے تکلفی سی آ گئی تھی پہلے دروازہ بچے کھولتے تھے مگر اب وہ خود دروازہ کھولتی تھی اور واپسی میں مجھے دروازے تک چھوڑنے بھی جاتی تھی اس کے علاوہ ان کی آنکھیں بھی بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور شاید کچھ سمجھانا چاہتی تھیں۔ میں بچہ نہیں تھا کہ اس زبان کو نہ سمجھ پاتا لیکن میں نے چشم پوشی کرتے ہوئے اپنے کام سے کام رکھا کیونکہ میرا نصب العین کچھ اور تھا اگر میں ایسی باتوں میں الجھ جاتا تو میرا ذہن اسی طرف بھٹک جاتا پھر میرا اعلیٰ تعلیم کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکتا اور جس منزل تک پہنچنے کے لیے میں خوار ہو رہا تھا اس تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔ جب میں نے خاتون کو کوئی رسپانس نہ دیا تو انہوں نے دبے لفظوں میں شوہر کی غیر موجودگی میں اپنی تنہائی اور جسمانی ضروریات کی عدم تکمیل کا اظہار کرتے ہوئے میری جانب کے جذبات کو جگانے کی کوشش کی اور میرے مرد ہونے پر شک کا اظہار کیا مگر میں نے ان سے اس سلسلے میں کوئی میڈیکل سرٹیفکیٹ تو لینا نہیں تھا اس لیے خاموش رہا۔

ٹیوشن کا مہینہ پورا ہونے میں ایک آدھ دن باقی تھا کہ جب میں فرزانہ خاتون کے گھر میں داخل ہوا تو بچوں کو

غیر موجود پایا ملازمہ بھی نظر نہ آ رہی تھی میرے استفسار پر فرزانہ نے بتایا کہ بچے ننھیال کی طرف ہیں اور ملازمہ کو ان کے ساتھ ہی بھیجا ہے۔

"اگر بچے نہیں تھے تو مجھے فون ہی کر دیتیں میں آج تو ویگنوں کے دھکے کھانے سے بچ جاتا۔" میں نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"وہ تو میں نے خود ہی نہیں کیا۔ دراصل میں آپ سے بہت خوش ہوں آپ نے میرے بچوں کو بڑی محنت سے پڑھایا ہے اس لیے آج مجھے آپ کو آپ کی فیس کے علاوہ ایک سپیشل بونس بھی دینا تھا جو بچوں اور ملازمہ کی موجودگی میں نہیں دیا جا سکتا تھا۔" فرزانہ خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسا بونس"۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔

"اگر آپ میری طرف دیکھتے تو یہ سوال نہ کرتے۔"

میں نے نظر اٹھا کر فرزانہ خاتون کی طرف دیکھا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا خلاف معمول فرزانہ نے انتہائی چست اور مختصر لباس پہن رکھا تھا جس میں سے اس کا گداز بدن پھٹا پڑ رہا تھا اور دعوت نظارہ ہی نہیں کھلی دعوت گناہ بھی دے رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح تیز میک اپ میں وہ اپنی عمر سے کہیں کم دکھائی دے رہی تھی میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ عورت کو اس قدر بے حجاب دیکھنا میرے لیے نیا تجربہ تھا۔

"کیوں کیا ہوا۔" فرزانہ نے میرا ہاتھ پکڑا تو میرے پورے جسم میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی کان سائیں سائیں کرنے لگے میں نے گھبرا کے ہاتھ چھڑا لیا تو وہ بولی۔ "آج تو مجھے اپنی مردانگی دکھا ہی دو تم نے پڑھا بھی بہت ہوگا اور پڑھایا بھی بہت ہوگا۔ مگر آج میں جو سبق تمہیں پڑھاؤں گی تم نے کبھی نہ پڑھا ہوگا اور تم ساری عمر اسے یاد رکھو گے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔

"پلیز میڈم مجھے جانے دیں۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "میں نے ہمیشہ آپ کو بڑی بہن کی نظر سے دیکھا ہے اس لیے جو کچھ آپ مجھ سے چاہتی ہیں وہ میرے لیے ممکن نہیں ہے میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"کیا میں اتنی ہی بری ہوں جو تم نے مجھے یوں ٹھکرا دیا یا تم مرد نہیں ہو۔" فرزانہ نے جذباتی ہو کر کہا۔

"یہ دونوں باتیں نہیں ہیں اصل بات وہی ہے جو میں نے بتا دی ہے۔" میں نے قطعیت سے کہا۔

"دیکھو میں بری عورت نہیں اور نہ ہی ایسا کرنا چاہتی تھی مگر ایک سال سے میرا شوہر بیرون ملک ہے میں کب تک صبر کروں میرے بھی کچھ جذبات ہیں میرے شوہر پر تو کوئی پابندی نہیں وہ جب مرضی اور جیسے مرضی اپنے جذبات ٹھنڈے کر سکتا ہے میں کیا کروں۔" فرزانہ روتے ہوئے بولی شدت جذبات سے ہولے ہولے اس کا جسم لرزنے لگا۔

"دیکھیں اس کے باوجود یہ گناہ ہے اور میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا آپ براہ کرم میری فیس دیں اور آئندہ کے لیے کسی اور ٹیچر کا بندوبست کر لیں۔" میں نے سختی سے کہا۔ "اگر آپ اللہ کے دیے پر شاکر رہتی تو اس آزمائش میں نہ پڑتیں۔"

"آپ کی فیس تو آپ کی امانت ہے۔" فرزانہ نے دس ہزار میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرے بچوں کو پڑھانے سے انکار نہ کریں اس میں ان کا کیا قصور ہے اور پھر آپ کو رقم کی ضرورت ہے رزق کو یوں نہ ٹھکرائیں میں آپ سے آئندہ کوئی توقع نہ رکھوں گی یہ میرا وعدہ ہے۔"

"یہ میرے لیے اب ممکن نہیں اور مسبب الاسباب اللہ ہے۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ اللہ کے فضل سے میں آج پی ایچ ڈی کر چکا ہوں میرا مستقبل تابناک ہے۔ دنیا میں اللہ نے اس گناہ سے بچنے کے صدقے مجھے عظیم کامیابیوں سے نوازا اور آخرت کا اجر تو اس کے پاس ہے ہی۔

* * *

مولانا پُر اسرار

قاری صاحب مجھے پسند تھے کیونکہ دلیر آدمی تھے۔ لڑنا جانتے تھے۔ کبھی شکست تسلیم نہ کی۔ میری نظر میں وہ ایک جینئیس تھے۔ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک مگر افسوس کہ انہوں نے تمام صلاحیتیں منفی کاموں میں ضائع کر دیں۔

سکندر خان بلوچ

یہ 1981 کا واقعہ ہے۔ میں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں پُرسکون دن گزار رہا تھا کہ اچانک میری پوسٹنگ بطور ریجنل ڈائریکٹر ایف جی سکولز ملتان ہو گئی۔ فوج میں اس عہدے کو جنرل سٹاف آفیسر گریڈ 1 کہا جاتا ہے۔ اس ریجن میں ملتان، اوکاڑہ، خانیوال، بہاولپور اور ڈیرہ نواب صاحب کی چھاؤنیوں کے سکول شامل تھے۔

میں جب اپنی پوسٹنگ پر یکم مارچ 1981 کو ملتان پہنچا تو ایک فوجی میس کے مہمان خانے میں چند دنوں کے لیے رہائش کی جگہ ملی۔ اُس دن موسم بڑا خوشگوار تھا۔ شام کو میں یونہی سیر کے لیے باہر نکل گیا۔ مغرب کی نماز کے وقت واپس پہنچا تو روم اٹنڈنٹ نے مٹھائی کا ڈبہ مجھے تھماتے ہوئے بتایا کہ ایک صاحب ملنے آئے تھے۔ مٹھائی دے گئے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کہ نماز کے بعد پھر آئیں گے۔ میں سخت پریشان ہو گیا کیونکہ میں ملتان میں کسی کو نہیں جانتا تھا تو پھر یہ کون شخص ہو سکتا ہے جو مجھ سے ملنے کے لیے اس قدر بیتاب ہے کہ مٹھائی بھی لے آیا ہے۔ اُسے میری آمد کا بھی پتہ ہے حالانکہ سوائے میرے ایک فوجی ساتھی کے اور کسی کو بھی میری آمد کا پتہ نہ تھا۔ بہرحال نماز سے فارغ ہو کر میں اُس مہربان شخص کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کوئی پندرہ منٹوں بعد روم اٹنڈنٹ نے اطلاع دی کہ مٹھائی والے صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں نے انہیں اندر بلا لیا۔

یہ ایک ڈھلتی عمر کا مضبوط جسم اور درمیانے قد کا شخص تھا۔ کلف لگا سفید لباس۔ سر پر سبز رنگ کا کلف لگا پگڑا جس میں سے ایک وضع دار کھم کا طُرّہ اوپر نکلا تھا۔ منہ میں پان۔ متاثر کن ریش جو نہ سیاہ تھی نہ سفید بس ملی جلی۔ پہلی نظر میں بہت معزز اور پیر نما شخصیت نظر آئی۔ میں نے ذہن پر زور دے کر سوچا کہ میں تو ایسے کسی شخص سے نہ کبھی ملا نہ میں پیر پرستی کی حد تک کوئی مذہبی انسان

تھا۔ خیال آیا کہ ملتان پیروں کا شہر ہے شاید یہاں ہر شخص ہی پیر ہے۔ بہر حال میں نے انہیں بہت باادب طریقے سے بٹھایا۔ چائے منگوائی تو جناب نے اپنا ایک لمبا سا تعارف کرایا۔ نام تو اُن کا کچھ اور تھا لیکن ہم انہیں قاری اسرار حسین جعفری مہدوی نقشبندی قادری کہیں گے (محترم قاری صاحب تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین!)۔ اتنے لمبے تعارف کے بعد میں نے عرض کی۔ "جناب آپ کام کیا کرتے ہیں۔" فرمایا "میں یہاں ایف جی بوائز ہائی سکول کا سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ہوں"۔ لہٰذا میں نے مزید پوچھا۔ "جناب کی تعلیم کیا ہے؟"۔ انہوں نے ایک گول مول سا جواب دیا کہ اُن کے پاس کسی مدرسے کی سند ہے۔ اس تعلیم اور اس حلیے کے ساتھ کسی اسلامی مدرسے کا سربراہ ہوتا تو جچتا تھا لیکن ایک عام ہائی سکول کا سربراہ کچھ عجیب سا لگا۔ بہر حال اس موضوع پر مزید بات کرنے کا موقع نہیں تھا۔

اب میں نے مٹھائی کے متعلق پوچھا۔ "یہ تکلیف آپ نے کیوں کی ہے۔ میں تو ویسے ہی شوگر کا مریض ہوں۔ مٹھائی کھانے سے ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے"۔ جواب میں محترم نے ایک لمبی سی حدیث سُنائی اور پھر خود ہی ترجمہ بھی کر دیا۔ "حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جب بھی کسی سے ملنے جائیں کوئی میٹھی چیز ضرور ساتھ لے جائیں۔ اِس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سنت رسولؐ ہے اِس لئے مٹھائی ساتھ لے آیا"۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر محترم قاری صاحب نے ملتان کے تمام سکولوں کے متعلق بتا دیا اور اِس انداز میں بتایا کہ اُن سے بہتر کوئی سربراہ ادارہ ملتان میں بلکہ پوری ایف جی چین میں موجود نہ تھا۔ ساتھ ہی جناب نے وضاحت کی کہ "یہاں لوگ بڑے سازشی ہیں۔ شریف آدمی کو رہنے ہی نہیں دیتے۔ سازشوں کا یہ عالم ہے کہ اُن کے خلاف بھی غلط اور جھوٹی درخواستیں دے دے کر انکوائری کا حکم کرا دیا ہے۔ اِن سازشی لوگوں کو میرے جیسے شریف۔ دین دار اور اسلام پسند لوگوں کا اِس ادارے میں رہنا پسند نہیں"۔ محترم نے اپنی عالمانہ گفتگو کے دوران کئی ایک آیات اور احادیث کا حوالہ بھی دیا۔ محترم نے مجھے بھی تنبیہ کی کہ "میں غلط لوگوں کی بات نہ سنوں کیونکہ یہاں لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے کی بہت عادت ہے۔ لہٰذا بہتر ہو گا کہ جب بھی کوئی کسی کے خلاف بات کرے تو میں قاری صاحب سے مشورہ کر لوں"۔ اب مجھے جناب کی تشریف آوری کا بھی اندازہ ہو گیا۔ مزید لمبی گفتگو سے بچنے کے لیے میں نے قاری صاحب کی تشریف آوری۔ مشوروں اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ جب وہ اُٹھنے لگے تو مٹھائی کا ڈبہ اُن کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ گزارش کی "جناب میں تو شوگر کی وجہ سے بالکل نہیں چکھ سکتا۔ یہاں میری فیملی بھی نہیں ہے۔ اِس لئے یہاں ضائع ہو جائے گی"۔ قاری صاحب نے ڈبہ تو بادلِ ناخواستہ پکڑ لیا لیکن اب شوگر کے علاج اور اس سلسلے میں کچھ درود وظائف بتانے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا: "وہ مجھے اِس مقصد کے لیے پانی دم کر کے دیں گے جس سے شوگر بالکل ختم ہو جائے گی"۔ نیز کسی حکیم کا حوالہ بھی دیا جن کے پاس لے جانے کے لیے مجھ سے وقت مانگا۔ پیشتر اس سے کہ مزید بات بڑھتی بہت مشکل سے میں نے محترم کو روانہ کیا۔

دوسرے دن محترم صبح صبح پھر دفتر میں تشریف لائے۔ مجھے یہاں ملتان پوسٹنگ کی رسمی مبارکباد دی اور مجھے وارننگ دی کہ فلاں فلاں صاحب مجھ سے ملنے آ رہے ہیں۔ بڑے سازشی اور خطرناک لوگ ہیں مجھے اُن سے بچ کر رہنا ہو گا۔ تو یوں میں نے ملتان میں قیام کی ابتدا کی۔ قاری صاحب کے بتائے ہوئے لوگ آئے۔ دعا سلام ہوئی اور وہ مل کر چلے گئے۔ جونہی ملاقاتوں کا رش ذرا کم ہوا تو میرا آفس سپرنٹنڈنٹ آیا اور

بتایا۔ "سرقاری صاحب آپ سے ملنے آئے تھے۔ ذرا خیال رکھیے گا بڑا خطرناک آدمی ہے"۔ میں نے اُسے تو کچھ نہ کہا لیکن دل میں کئی شبہات پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے راہنمائی اور حفاظت کی دُعا کی۔ جیسے ہی افواہ پھیلی کہ نئے ریجنل ڈائریکٹر صاحب آگئے ہیں تو بہت سے لوگ ملنے آئے۔ سب نے اپنے اپنے تعاون اور خدمات کی پیشکش کی تو مجھے ان لوگوں سے مل کر اپنی تعیناتی اچھی لگی۔ ہم فوجی تو عموماً روکھے پن سے بات کرتے ہیں لیکن اِن لوگوں کی نرم گفتگو مجھے بڑی پُرخلوص محسوس ہوئی جس سے کام کرنے کا حوصلہ بڑھا۔

یہ نیا ریجن تھا۔ سٹاف مکمل تھا نہ ٹرانسپورٹ اور نہ ہی باقی ضروری فرنیچر وغیرہ۔ اور تو اور دفتر بھی نہ تھا لہٰذا مجھے ایف جی بوائز ہائی سکول نمبر 1 کے ہیڈ ماسٹر محترم محمد شریف قریشی صاحب کے دفتر میں وقتی طور پر ڈیرہ جمانا پڑا جو بڑی خوشی سے انہوں نے مجھے آفر کیا۔ خود ایک دوسرے کمرے کو دفتر بنالیا۔

چارج سنبھالتے ہی مجھے تین اہم کام سونپے گئے۔ اوّل۔ بہاولپور کے ایک پبلک سکول میں غالباً ناہید نامی ایک لیڈی ٹیچر تھی جو کافی عرصہ سے کسی نہ کسی بہانے چھٹی لے کر سکول سے غیر حاضر رہتی جس سے بچوں کی پڑھائی کا سخت حرج ہوتا تھا۔ اِسی سکول میں بہاولپور ڈویژنل کمانڈر کی بیٹی بھی زیرِ تعلیم تھی جس کی معرفت جنرل صاحب کو بھی اِس خاتون کی مکاری کا پتہ چلتا رہتا۔ جب تک وہ ٹیچر اس سکول کی پے لسٹ پر تھی اُس کی جگہ نئی ٹیچر نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ سول میں کسی ٹیچر بلکہ چپڑاسی کو بھی ملازمت سے برخاست کرنا ایک تکلیف دہ مسئلہ ہوتا ہے جس سے سمجھدار سینئر افسران گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ سیدھے عدالت میں چلے جاتے ہیں۔ کئی سال گھر آرام سے بیٹھ کر بالآخر عدالت کی معرفت بحال ہو کر واپس آجاتے ہیں اور پچھلے سارے عرصہ کی تنخواہ وصول کر لیتے ہیں۔ اکثر گڑبڑی قسم کے لوگ تو جان بوجھ کر اپنے سینئرز کو تنگ کرتے رہتے ہیں کہ اُن کے خلاف کوئی کارروائی ہو جس سے وہ لمبا عرصہ چھٹی بھی ماریں اور پھر بحال ہو کر اکٹھی تنخواہ بھی وصول کریں۔ کچھ لوگوں کو ایسی معطلی ویسے بھی راس آتی ہے کیونکہ ان کے اپنے پرائیویٹ کاروبار ہوتے ہیں اور لمبے عرصے کی معطلی کے دوران خوب کمائی کرتے ہیں۔ مظلوم بھی بنتے ہیں۔ اکٹھی تنخواہ بھی وصول کرتے ہیں اور انتظامیہ کے سامنے اکڑتے بھی ہیں۔ بلکہ فوجی کہاوت کے مطابق اکڑ کر چلتے ہیں کام بھی نہیں کرتے اور اُن کے "غیر مہذبانہ" رویے کی وجہ سے انتظامیہ کا کوئی فرد انہیں کچھ کہنے کی جرأت بھی نہیں کرتا۔ غالباً اسی قسم کا کیس کچھ اس خاتون کا بھی تھا۔ جنرل صاحب کی پوری کوشش کے باوجود یہ خاتون دردِسر بنی رہی۔ آخر تنگ آ کر جنرل صاحب جو اِن سکولوں کے مقامی انتظامی سربراہ بھی تھے نے ڈائریکٹر صاحب کو اِس خاتون کا اِس سکول سے بلکہ بہاولپور سے باہر تبادلہ کرنے کا لکھا اور اُس کا تبادلہ کر دیا گیا لیکن اب وہ چارج نہیں چھوڑتی تھی۔ لہٰذا مجھے حکم ملا کہ کسی طریقے اُس سے چارج لے کر اُسے فارغ کیا جائے۔ بہت مشکل سے اُس سے چارج تو چھڑوایا گیا لیکن دوسرے سکول وہ پھر بھی نہ گئی بلکہ اُس کا خاوند اکثر سفارشیں لے کر میرے پاس آتا کہ اِسے واپس بہاولپور تبدیل کیا جائے۔

دوسرا اہم کیس قاری صاحب تھے جن کے خلاف بہت سے الزامات تھے اور انکوائری کا حکم ملا۔ چند دنوں بعد مجھے فون پر اطلاع دی گئی کہ جی ایچ کیو سے میجر عبدالرزاق صاحب کو بطور انکوائری ممبر مقرر کیا گیا تھا جو قاری صاحب کے مکمل کرتوتوں سے واقف تھے۔ اُن کی طرف سے اطلاع ملی کہ اُن کی رہائش وغیرہ کا بندوبست کیا جائے اور وہ اگلے ہفتے تشریف لائیں گے۔ تیسرا اہم

کیس ایف جی پبلک سکول ملتان کا تعلیمی معیار تھا جس سے والدین اور ڈائریکٹریٹ دونوں ناخوش تھے۔ اُس سال یہ محض 54% تھا۔

چند دنوں بعد میجر عبدالرزاق صاحب تشریف لے آئے اور قاری اسرار صاحب بلکہ پُر اسرار صاحب کے خلاف انکوائری شروع ہوگئی۔ یہ تمام عرصہ قاری صاحب نے مختلف ذرائع سے مجھ پر دباؤ جاری رکھا۔ وہ ہمیشہ مختلف احادیث اور قرآنی آیات کا سہارا لیتے۔ آخر میں ہمیشہ ایک آیات پڑھ کر سناتے اور پھر خود ہی ترجمہ فرماتے۔ "مظلوموں کو انصاف دینا بہت بڑی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو بہت پسند فرماتے ہیں"۔ وغیرہ وغیرہ۔ ویسے مجھے اپنے کلریکل سٹاف اور کچھ سربراہان کی طرف سے یہ وارننگ ضرور ملتی رہی۔ "سانپ کا ڈسا تو شاید بچ جائے لیکن قاری صاحب کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا"۔ مزید یہ بھی پتہ چلا کہ موصوف گنڈا۔ تعویذ اور سفلی علم کے بھی ماہر ہیں۔ اپنے متعلق بڑی بڑی کہانیاں مشہور کر رکھی تھیں۔

قاری صاحب کے خلاف انکوائری مستقل دشمنی کی بنیاد تھی۔ میرے ساتھ کیا ہوسکتا تھا مجھے اِس کا اندازہ بھی نہ تھا۔ میں چونکہ تین سال سعودی عرب میں گزار کر چند ماہ پہلے ہی واپس آیا تھا اِس لئے مجھ پر "ایمانداری" کا بھوت کچھ زیادہ ہی سوار تھا۔ بہرحال انکوائری شروع ہوئی اور جیسے جیسے حقائق سامنے آنے شروع ہوئے تو ہم دونوں حیران رہ گئے۔ پتہ چلا کہ یہ بہروپیا شخص (خدا اُسے معاف کردے۔ آمین)۔ سر سے پاؤں تک کرپشن اور بدعنوانی میں ملوث تھا۔ الزامات تفصیل وار ہیں۔ یہ کارہائے نمایاں قاری صاحب نے اُس وقت سرانجام دیے تھے جب موجودہ ہائی سکول مڈل تھا اور قاری صاحب کچھ عرصہ کے لئے اُس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

1- محترم نے وضو کرنے کے لیے مبلغ -/200 سو روپے کے مٹی کے لوٹے خریدے گئے۔ یاد رہے کہ اُس دور میں ایک لوٹے کی قیمت ایک روپے سے بھی شاید کم تھی۔ پھر یہ لوٹے نہ جانے کیسے ٹوٹ گئے اور انہیں ٹوٹا ہوا دکھا کر سٹاک رجسٹر سے ختم کردیا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے محترم نے بازار کی قیمت سے ہٹ کر اُس دور میں شاید چار یا پانچ روپے کے حساب سے فی لوٹا خرید کیا تھا۔ رجسٹر میں بل بھی موجود تھے۔ طلباء کے فنڈز سے رقم بھی ادا کی گئی تھی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ لوٹے خریدے ہی نہیں گئے تھے۔ عینی شواہد کے مطابق مختلف مساجد سے کچھ لوٹے اٹھوا کر یہاں لائے گئے جو چند دن یہاں رہے جب طلباء اور سٹاف کے لوگوں نے یہ لوٹے دیکھ لئے تو پھر ایک رات یہ لوٹے غائب ہوگئے۔ صبح کسی برتن (شاید صراحیاں وغیرہ) کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ملے۔ اُس رات چوکیدار بھی چھٹی پر دکھایا گیا۔ صبح عام کہانی تھی کہ رات کو بلیاں لوٹے توڑ گئی ہیں۔ اِس کیس میں مزید دلچسپی اُس وقت پیدا ہوئی جب پتہ چلا کہ بہت سے طلباء سے لوٹوں کے نام پر ایک ایک روپیہ چندہ بھی لیا گیا تھا۔

2- سکول کے وسیع گراؤنڈ تھے۔ ہر سال برسات کے بعد یہاں گھاس بڑھ جاتی جو جانور پال لوگوں کو فروخت کرکے رقم طلباء فنڈ میں جمع کرادی جاتی تھی لیکن جب سے محترم قاری صاحب اِس ادارے کے سربراہ بنے فنڈ میں ایک پیسہ بھی جمع نہ ہوا۔ ویسے مالیوں کے بیان کے مطابق گھاس فروخت ہوئی تھی اور تقریباً چار ہزار روپے بھی ملے تھے لیکن ملنے کے بعد وہ کہاں غائب ہوئے کسی کو معلوم نہ تھا۔ گھاس کے ساتھ ساتھ کچھ پُرانے درخت بھی غائب ہوگئے۔

3- مروجہ قوانین کے برخلاف طلباء فنڈ سے کافی ساری ادائیگیاں کی گئی تھیں لیکن کس مقصد کے لیے یہ ادائیگیاں کی گئیں وہ معلوم نہ ہوسکا۔

4۔ محترم کا پسندیدہ مشغلہ تھا کہ کچھ سٹاف ممبران کو بیماری یا کسی اور بہانے لمبی چھٹیوں پر دکھاتے پھر اُن کی جگہ طلباء فنڈ سے جزوقتی اساتذہ تعینات کیے جاتے جنہیں ملازمت دیتے ہوئے کافی کچھ نذرانے وصول کر لئے جاتے کیونکہ انہیں بعد میں پکا کرنے کا بھی لالچ دیا جاتا تھا۔ بعض حالات میں ان جزوقتی اساتذہ کو بھی چھٹیوں پر رکھ کر تنخواہ وصول کر لی جاتی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ بھیجے گئے لوگوں کی جگہ نئے اساتذہ عملی طور پر رکھے ہی نہیں جاتے تھے صرف خانہ پری کی جاتی تھی لیکن تنخواہ باقاعدگی سے خزانے سے نکلتی رہی۔

5۔ سٹیشنری کے نام پر۔ فرنیچر کے نام پر۔ طلباء کے لیے صراحیاں اور دیگر سہولیات کے نام پر نہ صرف طلباء فنڈ اور سرکاری گرانٹ کا بیڑہ غرق ہوتا رہا بلکہ محترم طلباء سے بھی اس سلسلے میں فنڈ وصول کرتے رہے جس کا کوئی ریکارڈ نہ تھا۔

6۔ سکول کی پرانی عمارت پچھلی بارشوں میں گر گئی تھی اس کے دو صد گارڈرز بھی اس گری ہوئی عمارت میں آ گرے۔ کچھ عرصہ تو یہ گارڈرز وہاں موجود رہے لیکن پھر اچانک غائب ہو گئے۔ کچھ عینی شواہد کے مطابق یہ گارڈرز قاری صاحب کے گھر کے ایک کمرے پر موجود تھے۔

7۔ سب سے دلچسپ کیس ایک دیوار کا تھا۔ سکول سے ملحق ایک ٹیلی فون والوں کی کالونی تھی۔ اس طرف دیوار خستہ حالت میں تھی۔ کچھ لوگوں کے بیان کے مطابق یہ دیوار قاری صاحب نے ایک بارش والی رات خود گروا دی تھی۔ بریک کے دوران وہ بڑے بڑے لڑکوں کی حوصلہ افزائی کرتے کہ وہ کالونی کے ساتھ گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلیں۔ فٹ بال ٹیموں میں قاری صاحب کے کچھ پسندیدہ لڑکے بھی شامل ہوتے جن کا کام ہی یہ تھا کہ ٹک مار کر فٹ بال کالونی کے کسی نہ کسی گھر میں پہنچا دیں۔ بعض اوقات یہ بال گھر میں موجود خواتین یا بچوں کو بھی جا لگتے۔ پھر یہ لڑکے ان گھروں تک بال اُٹھانے کے بہانے پہنچ جاتے۔ گھر میں خواتین اکیلی ہوتیں جن کے لئے یوں بار بار بال اُٹھا کر دینا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا مستقل طور پر کالونی کے رہائشیوں اور قاری صاحب کے درمیان چخ چخ لگی رہتی اور قاری صاحب خوش ہوتے۔ پریکٹس کے نام پر یہ کھیل شام تک جاری رہتا کیونکہ سکول میں ڈبل شفٹ تھی۔ کالونی کے مکین کئی دفعہ آئے۔ ایک دفعہ تو اُن کے ڈائریکٹر بھی آئے۔ قاری صاحب سے تعاون کی اپیل کی گئی۔ قاری صاحب نے فرمایا۔ "میں کوئی جان بوجھ کر تھوڑا ہی بچوں کو بھیجتا ہوں۔ بچے ہیں اور وہ بھی فوجیوں کے۔ بتایئے انہیں کھیلنے سے کیسے روک سکتا ہوں؟"۔ کالونی والوں نے تنگ آ کر فیصلہ کیا کہ یہاں دیوار بنا دی جائے۔ جب قاری صاحب سے اس کی اجازت چاہی گئی تو قاری صاحب اکڑ گئے کہ سکول کی زمین پر دیوار کیوں بنے؟۔ بہرحال انہیں خاموش رہنے کی قیمت ادا کی گئی۔ اس کے بعد فون والوں نے اپنی جیب سے دیوار بنوائی۔ جب دیوار بن چکی تو قاری صاحب نے ترقیاتی فنڈ سے غالباً 25000/- روپے دیوار بنانے کے وصول کر لئے۔

بہرحال قاری صاحب کے خلاف تمام الزامات ثابت ہو گئے۔ اصولاً تو ہمیں اُسے سخت سزا دینی چاہیے تھی لیکن اُس کی شرپسند طبیعت اور ماضی کے کچھ واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈائریکٹر صاحب کے مشورے سے ہم نے اُس کی ملتان سے باہر تبدیلی کی سفارش کی۔ چند دنوں بعد ڈائریکٹر نے ان کی تبدیلی خانیوال کے ایک پرائمری سکول میں کر دی۔ یہ سکول خانیوال سے تقریباً 10 میل آگے لاہور روڈ پر ایک جنگل نما علاقے میں ایوبیشن ڈپو میں واقع تھا۔ یہاں دو استاد تھے اور بچوں کی کل تعداد بیس یا بائیس تھی۔ اب قاری صاحب

ملتان سے پوسٹ آؤٹ تو ہو گئے لیکن انہوں نے چارج چھوڑنے سے انکار کر دیا بہر حال دو ماہ ہم نے مسلسل منت ترلے کر کے اُن سے چارج لیا۔

جیسے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ. ہر جگہ پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ قاری صاحب کی یہ پوسٹنگ بھی اُن کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ پہلا کام تو محترم نے وہاں یہ کیا کہ وہاں ڈپو کے کمانڈنگ آفیسر کو بلیک میل کیا کہ وہ اتنی دور یعنی ملتان سے آتے ہیں۔ بوڑھے اور بیمار آدمی ہیں۔ ویسے بھی نمازی۔ پرہیز گار۔ تہجد گزار اور فقیر منش انسان ہیں۔ ظاہری شکل وشباہت بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔ اُن کے لیے ملتان سے روزانہ آنا جانا ممکن نہیں سکول بھی جنگل میں واقع ہے۔ نزدیک کوئی ایسی مناسب آبادی بھی نہیں لہٰذا اُن کے لئے رہائش اور خوراک کا بندوبست کیا جائے۔ کمانڈنگ آفیسر اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے محترم کے لیے ایک بہترین کمرہ بمعہ تمام آسائش فراہم کر دیا۔ خدمت کے لیے ایک جز وقتی نوکر بھی دیا اور کھانے کا بھی فری بندوبست کر دیا۔ قاری صاحب کچھ عرصہ تو وہاں جاتے رہے لیکن بعد میں ایسی تکلیف کرنی مناسب نہ سمجھی۔ آرام سے اور ٹھاٹھ سے ملتان گھر میں رہتے جب کبھی اُن کے خلاف غیر حاضری رپورٹ ملتی۔ ہم پوچھتے۔ وہ جواباً کسی نہ کسی بیماری کا بہانہ بنا دیتے یا بتا دیتے "میں تو وہاں موجود تھا بے شک میری حاضری چیک کر لیں"۔ پتہ چلا کہ وہ سکول کے تمام رجسٹر گھر لے آئے ہیں لہٰذا اپنی مرضی سے حاضری غیر حاضری۔ بیماری یا چھٹی لگاتے ہیں۔ باقی دو اساتذہ کو معقول نذرانے کے بدلے چھٹیاں دیتے رہتے۔ لیکن سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ محترم یہاں ملتان بینک سے تمام سٹاف کی تنخواہ ہر ماہ یکم کو نکلواتے اور پھر سکول نہ جاتے۔ سکول کا سٹاف مجبوراً اُس کے گھر کا طواف کرتا رہتا لیکن محترم پکڑائی ہی نہ دیتے۔ گھر والے کہہ دیتے خانیوال سکول گیا ہے جبکہ وہاں گئے ہوئے اُنھیں کئی کئی دن گزر جاتے۔ پھر سٹاف کو قسطوں میں تنخواہ ادا کرتا جو کئی ماہ آگے تک چلی جاتی۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ ہم اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے بلکہ وہ ہمیں مسلسل دباؤ میں رکھتا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

قاری صاحب نے وہاں بھی اپنے کارنامے جاری رکھے مثلاً سکول کا کل فنڈ مبلغ -/1500 روپے جمع تھا جس میں سے 1300 روپے قاری صاحب نے پہلے ہی ماہ سٹیشنری کے لیے نکلوا لیے۔ جب مجھے پتہ چلا تو میں نے باقی سکولوں کا سٹیشنری پر خرچ چیک کیا تو حیران کن حقائق سامنے آئے۔ مثلاً ملتان کا سب سے بڑا سکول جس میں طلباء کی تعداد 1300 کے قریب تھی اُس کا ماہانہ سٹیشنری کا خرچ۔ دو یا تین سو سے زیادہ نہ تھا جبکہ قاری صاحب نے 22 بچوں کے لیے پہلے ہی ماہ 1300 سو روپیہ خرچ کر دیا۔ جب میں نے بڑے سکولوں کے سٹیشنری خرچ کا حوالہ دے کر اتنے بڑے خرچے کے لیے پوچھا تو محترم نے تسلی سے جواب دیا۔ "یہ لوگ کام نہیں کرتے اس لئے سٹیشنری کا خرچ نہیں ہوتا میں کام کرتا ہوں اس لئے ہماری سٹیشنری خرچ ہوتی ہے"۔ پھر دوسرا کارنامہ قاری صاحب نے یہ سرانجام دیا کہ غالباً دو ہزار روپے سکول کو لائبریری کے لیے دیئے گئے تھے جو قاری صاحب نے پہلے ہی دن نکلوا لیے۔ بار بار جب ہم نے خریداری کی لسٹ مانگی تو فرمایا "مسلمان آدمی ہوں لہٰذا میں نے بچوں کے لیے قرآن کریم لے لئے ہیں"۔ حیران کن بات یہ تھی کہ 22 بچوں کے لیے دو ہزار کے قرآنی نسخے۔ کہنے لگے "آ کر چیک کر لیں۔ قرآنی نسخے موجود ہیں"۔ بہر حال اگلی دفعہ جب میں خانیوال گیا اور کمانڈنگ آفیسر کو ملنے گیا تو اس نے بتایا کہ قاری صاحب اُن کے پاس تشریف لائے تھے اور کہا کہ سکول میں بچوں کو قرآن پڑھانا ضروری ہے لہٰذا کچھ کاپیاں سرکاری فنڈ سے لے کر دی جائیں۔

کمانڈنگ آفیسر نے سرکاری فنڈ کی بجائے اپنی جیب سے دس نسخے لے کر دیئے جو کچھ دن سکول میں موجود رہے۔ تو یہ تھا لائبریری پر دو ہزار کا خرچ۔ معلوم ہوا کچھ کھاتے پیتے بچوں سے بھی قرآن فنڈ لیا گیا تھا۔ پھر ارد گرد کے زمینداروں سے پتہ چلا کہ انہوں نے بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیا تھا۔ قاری صاحب نے چند ماہ یہ نسخے ایک صندوق میں بند رکھے بعد میں پتہ چلا کہ گاؤں کی کسی مسجد کو ہدیتاً فروخت کر دیئے۔

"قاری صاحب کے بچپن کے ذاتی حالات کے متعلق کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ محترم نے اپنے متعلق مختلف کہانیاں مشہور کر رکھی تھیں خصوصاً یہ کہ انہوں نے درسِ نظامی کر رکھا ہے۔ لیکن یہ ڈگری کسی نے بھی کبھی نہ دیکھی نہ ہی اُن کی فائل میں موجود تھی۔ سُنا تھا کہ محترم نے ایک مسجد مدرسہ سکول میں تعلیم حاصل کی۔ غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ شاندار کامیابی حاصل کی۔ خوشخطی بھی بہت اچھی تھی۔ شنید کے مطابق موصوف نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ نوعمری میں ہی محکمہ صحت میں ملازم ہو گئے۔ چونکہ طبیعت شروع سے سیمابی قسم کی تھی اس لئے خود آرام کرتے تھے نہ کسی کو آرام سے رہنے دیتے۔ وہاں سنیئر افسران اور ساتھیوں کے ساتھ شرارتیں شروع کیں۔ رشوت لینے کے مرتکب بھی ہوئے پھر اپنے باس سے جھگڑا کر لیا۔ بات بڑھ گئی تو ڈائریکٹر ہیلتھ نے موصوف کے خلاف کیس درج کرا دیا۔ تفتیش ہوئی تو جرم ثابت ہو گیا لہٰذا پکڑ لئے گئے اور جیل چلے گئے۔ وہاں بیماری کا بہانہ بنایا تو نشتر ہسپتال پہنچ گئے۔ نشتر میں پولیس کا ایک سپاہی نگران تھا۔ محترم کو ایک دن موقعہ ملا تو ہتھکڑیوں سمیت بھاگ گئے۔ بہر حال کیس چلا اور محکمہ صحت سے بالآخر جبری طور پر فارغ کر دیئے گئے۔

قاری صاحب نے محکمہ صحت سے فارغ ہونے کے بعد اپنی نظریں کینٹ بورڈ کے سکولوں پر جما دیں۔ اسی دوران ایک دن ایک تقریب میں قاری صاحب کو قرأت کرنے کا موقعہ ملا۔ اس تقریب کی صدارت کمشنر ملتان ڈویژن کر رہے تھے۔ قاری صاحب نے تلاوت اس پرسوز انداز میں کی کہ حاضرین مجلس اور خصوصاً کمشنر صاحب بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے قاری صاحب کی تعریف کی اور انہیں شاباش دی۔ قاری صاحب نے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تعریفی سند کی درخواست کی جو کمشنر نے منظور کر لی۔ دوسرے دن قاری صاحب نے اپنی تعریف میں بہت خوبصورت تحریر لکھوائی جسے بعد میں قاری صاحب نے سند کا درجہ دے دیا۔ اس سند میں اپنے لئے "شمس القراء" کا لقب تجویز کر کے لکھا۔ جس پر کمشنر نے دستخط کر دیئے۔ "شمس القراء" کا اعزازی لقب "شمس العلماء" "شمس الاطباء" کے وزن پر چنا گیا تھا جو کسی دور میں نامور لوگوں کو حکومت وقت عطا کرتی تھی لیکن قاری صاحب کی دوررس نگاہوں نے ایک ہی مجلس میں اپنے لئے اتنا بڑا اعزاز مار لیا۔ اب قاری صاحب نے اس تعریفی خط کو فریم کرا لیا اور یوں ان کے پاس ایک مستقل سند آ گئی۔ بعد میں "شمس القراء" کے نام سے پیڈ بھی چھپوا لئے اور تمام درخواستیں اسی پیڈ پر لکھا کرتے۔

اب سند تو انہیں مل ہی گئی تھی لہٰذا سکول میں ملازمت کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اُس دور کے کنٹونمنٹ بورڈ کے سیکرٹری سے دوستی ڈالی۔ پھر سیکرٹری کی وساطت سے کنٹونمنٹ پرائمری سکول جو بعد میں ایف جی بوائز ہائی سکول نمبر 2 کہلایا میں "مذہبی اُستاد" کی جگہ مل گئی۔ اس سکول کے ہیڈ ماسٹر نے سخت مخالفت کی لیکن قاری صاحب نے اُن کی ایک بھی نہ چلنے دی۔ سکول جائن کرنے کے بعد پڑھانے کی طرف تو قاری صاحب راغب نہ ہوئے لیکن پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا۔ اُس دور میں سکول کے احاطے میں کچھ بڑے بڑے پیپل کے درخت ہوا کرتے تھے۔ اُن درختوں کے تنوں کے

ارد گرد مٹی کے تھڑے بنے تھے۔ ایک صبح قاری صاحب نے اِن میں سب سے بڑے درخت کے تھڑے پر سبز چادر بچھائی۔ پھر سبز طرّے والے پگڑے کے ساتھ خود اس سبز چادر والے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ مشہور کر دیا کہ اُسے رات کو کسی بہت بڑے بزرگ نے بشارت دی ہے کہ یہ بڑا پاکیزہ درخت ہے۔ یہاں بیٹھ کر عبادت کرنے اور تلاوت کرنے کا حکم ہوا ہے۔ مزید یہ کہ وہ یہاں بیٹھ کر صبح صبح جو بھی دعا دیں گے وہ قبول ہو گی۔ بات بچوں سے شروع ہو کر خواتین تک بھی پھیل گئی۔ قاری صاحب نے اپنی جادوگری کا کچھ اس طرح جال پھیلایا کہ سکول میں پڑھائی کا ماحول ہی ختم ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر اور بچوں کے والدین نے کنٹونمنٹ بورڈ سے شکایت کی تو بڑی مشکل سے قاری صاحب کا تکیہ ختم کیا گیا۔

یہ غالباً 1964 کا زمانہ تھا کہ قاری صاحب کے خلاف کچھ والدین نے اُن کے بچوں کے ساتھ غیر اخلاقی حرکات کرنے کی درخواست دی اور یہ درخواست کنٹونمنٹ بورڈ سے کاروائی کے لیے ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچی۔ جب تفتیش شروع ہوئی تو اسی قسم کی کچھ اور بھی شکایات موصول ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) اور صدر جنرل ایوب خان (مرحوم) کے الیکشن کی مہم زوروں پر تھی۔ یہ انکوائری چونکہ ہیڈ ماسٹر کر رہا تھا اب قاری صاحب نے اُسے سبق سکھانے کا منصوبہ بنایا۔ قاری صاحب نے سٹیشن کمانڈر۔ آئی ایس آئی۔ کنٹونمنٹ بورڈ۔ جی ایچ کیو اور صدر پاکستان کو ہیڈ ماسٹر کے خلاف درخواستیں دیدیں کہ "یہ شخص صدر ایوب کے سخت خلاف ہے تمام لوگوں کو فاطمہ جناح کو ووٹ دینے کے لیے مجبور کرتا ہے اور میں جو صدر ایوب صاحب کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ اس لئے میرے سخت خلاف ہو گیا ہے۔ اور مجھ پر ناجائز مقدمات بنوا دیے ہیں۔ لہٰذا اس خطرناک آدمی کو فوری طور پر معطل کر کے یہاں سے نکالا جائے"۔ ہیڈ ماسٹر صاحب پر دباؤ اتنا بڑھا کہ اُس نے قاری صاحب کے ساتھ سروس کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا قاری صاحب کو دوسرے ہائی سکول میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہاں ہیڈ ماسٹر صاحب قاری صاحب کی عادات سے تو واقف تھے ہی انہوں نے اپنی ذات۔ اپنے سٹاف اور خصوصاً بچوں کی اخلاقیات کے خلاف سخت خطرہ محسوس کیا۔ لہٰذا اُنہوں نے یہ "غیر اخلاقی" کیس عدالت میں بھیج دیا۔ وہاں ایک مجسٹریٹ کے پاس کچھ ماہ کیس چلا۔ اب قاری صاحب متاثرہ بچوں کے والدین کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں اتنا بلیک میل کیا کہ بالآخر انہوں نے یہ کیس واپس لے لیا اور یوں قاری صاحب ایک دفعہ پھر "پاک صاف" ہو کر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔

محترم کو چونکہ شروع سے ہی ہر ساتھی اور ہر حاکم بالا کے خلاف درخواستیں دینے کا بہت شوق تھا جس وجہ سے اُن کے ساتھی۔ سربراہ ادارہ حتیٰ کہ کینٹ بورڈ کے افسران تک تنگ تھے۔ جب وہ بہت زیادہ تنگ ہوتے تو انہیں کسی دوسرے سکول میں تبدیل کر دیا جاتا لیکن کوئی سربراہ ادارہ انہیں لینے کو تیار نہ ہوتا۔ لہٰذا یہ چھٹی لے کر گھر بیٹھ جاتے۔ تنگ آ کر کینٹ بورڈ نے کئی بار انہیں معطل کیا لیکن یہ عدالت میں چلے جاتے۔ کئی ماہ کیس لڑتے رہتے اور بالآخر عدالت سے بحال ہو کر واپس آ جاتے اور معطل شدہ تمام عرصہ کی تنخواہ وصول کر لیتے۔ ایک دفعہ بہت تنگ آ کر سٹیشن کمانڈر نے انہیں پھر معطل کر دیا۔ شنید کے مطابق اس دفعہ محترم نے ایک اور چال چلی۔ اُس دور میں جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان تھے۔ وہاں کسی سٹاف آفیسر سے سٹیشن کمانڈر کو فون کرایا کہ صدر صاحب کے پاس قاری صاحب کی درخواست پہنچی ہے اور اُن کا حکم ہے کہ انہیں فوری بحال کر دیا جائے۔ لہٰذا یہ بحال ہو گئے۔

جاننے والے کہتے ہیں کہ یہ فون انہوں نے جعلی طور پر کہیں سے کرایا تھا۔ بعد میں سٹیشن کمانڈر نے تفتیش کی تو کچھ ایسے ہی حقائق سامنے آئے۔ سٹیشن کمانڈر نے محترم سے جان چھڑوانے کے لیے مذہبی ٹیچر کی اسامی ہی ختم کر دی اور انہیں فارغ کر دیا گیا۔ اس دفعہ محترم ہائی کورٹ چلے گئے۔ کئی ماہ کیس چلا۔ وہاں جس جج کے پاس ان کا کیس تھا اُس کی نجی زندگی کے متعلق محترم نے سراغ لگایا تاکہ اُسے اپروچ کیا جا سکے۔ پتہ چلا کہ جج صاحب ہر جمعرات کی شام کو داتا دربار جاتے ہیں۔ اب محترم نے مزید منصوبہ بندی کی۔ شام کے وقت جج کے آنے سے پہلے اپنی سبز پگڑی باندھ کر داتا دربار جا کر بیٹھ گئے۔ کرائے پر دو بندے بھی ساتھ رکھے جنہیں آنے والے ڈرامے کی خوب ریہرسل کرائی۔ کچھ دیر بعد جب جج صاحب آئے تو محترم ایک تکیہ لگا کر ہاتھ میں تسبیح لے کر۔ اونچا اونچا "اللہ ہو"۔ "اللہ ہو" کا ورد کر رہے تھے۔ دونوں آدمی اُن کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ جب جج صاحب ان کے نزدیک پہنچے تو ریہرسل کے مطابق ٹانگیں دبانے والے دونوں آدمیوں نے جناب کی داڑھی کو ہاتھ لگا کر آخری ڈائیلاگ بولا "یا حضرت آپ ساری رات جاگ کر عبادت کرتے رہے ہیں۔ آج جمعتہ المبارک کی نیک رات ہے۔ پھر ساری رات عبادت کرنی ہے لہٰذا چند منٹ حجرے میں تشریف لے جا کر آرام فرمائیں"۔ قاری صاحب نے نیم وا آنکھوں سے فرمایا "بے وقوف۔ جاہل۔ تمہیں پتہ نہیں اللہ والوں کو نیند نہیں آیا کرتی"۔ یہ سارا ڈرامہ اس خوبصورتی سے کھیلا گیا کہ اور لوگوں کے علاوہ جج صاحب بھی متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ قاری صاحب کی خوش قسمتی کہ ایک دن بعد اُسی جج کے پاس پیشی تھی۔ قاری صاحب اُسی لباس میں ہاتھ میں تسبیح لئے ہوئے اپنے دو آدمیوں کے ہمراہ عدالت پہنچ گئے۔ وہ دونوں آدمی کھڑے بھی محترم کے بازو دباتے رہے اور یہ اُسی طرح تسبیح پر "اللہ ہو۔ اللہ ہو" کا ورد کرتے رہے۔ کیس پیش ہوا۔ جج صاحب نے انہیں غور سے دیکھ کر پوچھا "کیا تم وہی آدمی نہیں ہو جو جمعرات کو داتا دربار پر عبادت کر رہے تھے؟" جواب دیا۔ "جناب اللہ والوں کا تو کوئی مقام نہیں ہوتا۔ داتا دربار پر عبادت کر کے ذرا سکون ملتا ہے"۔ جج اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے کیس کا فیصلہ قاری صاحب کے حق میں کر دیا۔ لہٰذا قاری صاحب بمعہ اپنی ختم کی گئی اسامی کے دوبارہ بحال ہو کر واپس تشریف لائے اور اپنی ساری پچھلی تنخواہ وصول کر لی۔

اِسی دوران سکول کا درجہ بڑھا کر اِسے مڈل کر دیا گیا۔ اب قاری صاحب کو جوش آیا کہ اُسے اِس سکول کا ہیڈ ماسٹر ہونا چاہیے تھا لیکن اُن کے راستے میں دو رکاوٹیں تھیں۔ اوّل یہ کہ قاری صاحب "دینی مدرس" تھے۔ اُن کے پاس تو بی اے کی ڈگری تھی نہ بی ایڈ کی جبکہ اس پوسٹ کے لیے یہ دونوں ڈگریاں ضروری تھیں۔ قاری صاحب نے یہ مسئلہ یوں حل کیا کہ ایک ڈپٹی سیکرٹری سے "پیر بھائی" ہونے کے ناطے دوستی نکالی۔ اس پیر بھائی ڈپٹی سیکرٹری نے کیس یہ بنایا کہ محترم قاری صاحب کی "دینی سند" کو بی اے کے برابر اور کمشنر ملتان کی طرف سے دیا گیا تعریفی خط اور خطاب "شمس القراء" کو بی ایڈ کے برابر تسلیم کر لیا جائے۔ انہوں نے کیس بنا کر اوپر پیش کر دیا اور یہ سمری منظور ہو گئی۔ قاری صاحب کے سامنے دوسری بڑی رکاوٹ اِس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جن کی موجودگی میں قاری صاحب ہیڈ ماسٹر نہیں بن سکتے تھے۔ پہلے تو قاری صاحب نے خفیہ طور پر انہیں وہاں سے نکالنے کی کوشش کی جو کسی نہ کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ اب قاری صاحب نے ہیڈ ماسٹر کے خلاف کرپشن کی درخواست دے کر اُن کے خلاف انکوائری کرا دی جس میں اُن کے کچھ جرم ثابت ہو گئے۔ لہٰذا انہیں ہیڈ

ماسٹری سے ہٹا کر ایک ہائی سکول میں بطور ٹیچر بھیج دیا گیا اور یوں وقتی طور پر قاری صاحب ہیڈ ماسٹر بن گئے۔ ایک سال بعد سکول کا درجہ مزید بلند کر کے ہائی کر دیا گیا اور یہاں نیا ہیڈ ماسٹر تعینات کر دیا گیا۔ قاری صاحب نے اس ہیڈ ماسٹر کو بھی اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے اپنی مہم جاری رکھی۔ اب ان کے خلاف مزید دو رکاوٹیں یہ تھیں کہ اول تو ایم اے نہ تھے اور دوم ان کا نام "ٹرینڈ گریجویٹ سلیکشن گریڈ" (TGT-SG) ٹیچرز کی سنیارٹی لسٹ میں شامل نہ تھا کیونکہ محترم اس سے پہلے صرف "دینی استاد" ہی تھے۔ ایم اے کے لئے تو محترم اپنی کسی مدرسے کی سند کو حکومت پنجاب سے ایم اے کے برابر تسلیم کرا لائے اور بہت بعد میں TGT-SG کی سنیارٹی لسٹ میں نام بھی ڈلوا لیا لیکن بدقسمتی سے سکول کے ہیڈ ماسٹر بننے میں کامیاب نہ ہو سکے اور شاید گریڈ 18 سے ریٹائر ہو گئے۔

میں چونکہ قاری صاحب کے خلاف انکوائری کرنے کے جرم کا مرتکب ہو چکا تھا لہٰذا قاری صاحب کے لیے مجھ سے بدلہ لینا لازمی ہو گیا۔ وہ ہر ہفتے میرے خلاف کسی نہ کسی کو ضرور درخواست دیتے جس کی ابتداء ہمیشہ ایک قرآنی آیت سے ہوتی جس کے نیچے ترجمہ لکھا ہوتا۔ "اللہ تعالیٰ مظلوموں کو انصاف دینے والے اشخاص کو دوست رکھتا ہے۔"

قاری صاحب میں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ ہر معمولی سی بات سے بھی بڑا سے بڑا کیس بنا لیتے۔ مثلاً ایک آدھ دفعہ ایسا ہوا کہ دن کے 10 یا 11 بجے میں اپنے دفتر سے کسی کام کے سلسلے میں نکلا۔ میرا دفتر ایک ایسے سکول میں تھا جو ملتان چھاؤنی کے بازار کے سرے پر واقع تھا۔ بعض اوقات بازار سے گزرنا پڑ جاتا۔ ایسے مواقع پر جب بھی بازار سے گزر ہوا سامنے قاری صاحب نظر آ جاتے۔ اصولاً دفتری اوقات کار میں تو انہیں خانیوال سکول میں ہونا چاہیے تھا۔ قاری صاحب کی سکول سے غیر حاضری کی اطلاع کبھی نہیں ہوتی تھی اور چھٹی کی درخواست بھی نہیں بلکہ محترم چھٹی کی درخواست جیسے تکلفات میں پڑتے ہی نہیں تھے۔ اب قاری صاحب کو خطرہ ہو جاتا کہ وہ سکول حاضر نہیں۔ چھٹی کی درخواست بھی نہیں لہٰذا ضرور باز پرس ہو گی۔ ایسے مواقع پر وہ پیشگی حملہ کر دیتے۔ پوچھ گچھ سے پہلے ہی لوکل ڈویژنل کمانڈر جو میرے سینئر انتظامی آفیسر بھی تھے کو میرے خلاف کوئی نہ کوئی درخواست دے دیتے۔ دوسرے دن وہاں سے بلاوہ آ جاتا کہ جنرل صاحب سے ملیں۔ جانے پر معلوم ہوتا کہ قاری صاحب کی طرف سے میرے خلاف ایک لمبی سی درخواست موجود ہے کہ میں نے سر بازار قاری صاحب کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی ہیں قاری صاحب اپنی درخواستوں میں آیات اور احادیث کا اتنا بھرپور استعمال کرتے کہ ہر درخواست پڑھنے والا انہیں مظلوم ہی سمجھتا۔ محترم کا سب سے بڑا نشانہ تو میں ہی تھا لیکن اور بھی ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے کبھی قاری صاحب کی کوئی بات ماننے سے انکار کیا ہو یا اُن کے جرم پر پردہ پوشی نہ کی ہو اُن کے خلاف بھی اسی طرح درخواستیں جاری رہتیں۔ کوئی بچ جائے تو اُس کی قسمت لیکن قاری صاحب ایک ہی وقت میں سب کو الجھائے رکھتے لہٰذا ہم سب اُن کے "شر" سے بچنے کی کوشش کرتے اور دعا بھی۔

ان سب باتوں کے باوجود (مرحوم) قاری صاحب مجھے پسند تھے کیونکہ دلیر آدمی تھے۔ لڑنا جانتے تھے۔ کبھی شکست تسلیم نہ کی۔ میری نظر میں وہ ایک جینیس تھے۔ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک مگر افسوس کہ انہوں نے تمام صلاحیتیں حقی کاموں میں ضائع کر دیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

٭٭٭

تھپڑ

نسیم سکینہ صدف

آج مستری کے تھپڑ نے اس کے ذہن کا شعور کا، شعور کا اور بے حسی کا زنگ اتار دیا تھا۔ اس کا ضمیر اور غیرت بے چین ہو کر جاگ اُٹھے تھے۔

گیتو سنٹرل جیل میں سزا کاٹ رہا ہے۔ نہ پڑھا لکھا اور نہ کوئی سیاسی قیدی ہے۔ اس کو قید بامشقت کی سزا ملی ہوئی ہے۔ ہر صبح بدمزہ چائے اور تنوری روٹی کا آدھا ٹکڑا کھا قیدیوں کے ساتھ جیل کے پیچھے شاہراہ کے پتھر توڑنے کے لیے جاتا ہے۔ سارے قیدی سڑک پر بچھانے کے لیے بڑے بڑے پتھروں کے ٹکڑوں کو ہتھوڑوں سے کوٹ کوٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بدل دیتے ہیں۔ کسی سے کوئی بات چیت نہیں کرتے، ہر طرف سے جیل کے سپاہیوں کی آنکھیں انہیں گھورتی رہتی ہیں۔ صبح کے وقت ان کے ہتھوڑے آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ مگر جب دوپہر کا سورج سر پہ آ جاتا ہے اور زمین تپ کر تنور بن جاتی ہے تب ہتھوڑوں کی چوٹیں تیز رفتار ہو جاتی ہیں اور وہی سخت اور کھردرے پتھر جو صبح کی خنکی میں آسانی سے توڑے نہیں جا سکتے پل بھر میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ انسان نہیں گویا مشین ہیں اور پسینہ ان مشینوں کی کلوں کا تیل ہے۔ یہ پسینہ جب قیدیوں کے جسم پر سیل رواں بن جاتا ہے اور بدن تپ کر لوہا بن جاتے تب سخت سے سخت پتھر بھی ان کے ہتھوڑوں کی چوٹوں سے چور چور ہو جاتے ہیں۔

پتھر توڑتے ہوئے کبھی کبھی کوئی قیدی اپنی زبوں حالی کو کوسنے بھی لگتا مگر گیتو زیادہ تر چپ رہتا۔ یہاں آنے سے پہلے بھی اس کے ہاتھ میں ہتھوڑا ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ہی چوٹ میں موٹروں لاریوں اور ٹرکوں کے زنگ خوردہ بمپر سیدھے کر دیا کرتا تھا۔ گیتو گلبرگ کے ایک گیراج میں ہیلپر تھا۔ اس کا وجود سڑے ہوئے موبل آئل، پیٹرول بیروزہ لگے ہوئے گریس میں گم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے نہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچا نہ مستقبل کی فکر کی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو پرانی لاریوں، موٹروں اور بسوں کے نیچے لیٹا ہوا پایا۔ کھیل کود کا زمانہ بھی موٹروں کے مڈگارڈ چمکانے میں گزر

گیا۔ صبح سے شام تک موٹروں کا میل اتارنے کے بدلے اس کو دو ہزار روپے مزدوری ملتی تھی۔ اس میں سے ہزار روپیہ ہوٹل کی روٹی کے اور باقی پیسوں سے گھٹیا عیاشی کرتا تھا۔ اس کے سامان تعیش کی فہرست میں چرس اور گھٹیا شراب کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ چرس بھرے سگریٹ کے کش اس کے ذہن کو ہلکا کرتے رہتے اور پھر نیند اسے گیراج کے ایک کونے میں کسی بس کی پرانی سیٹ پر لے جاتی تھی۔ دن بھر جب تک وہ کھاپی کر موج میں نہیں آتا تھا تب تک خاموش رہتا اسے نہ دوسروں سے کوئی خاص دلچسپی تھی اور نہ اپنے آپ سے۔ وہ مہینے میں ایک مرتبہ اپنے گندے غلیظ کپڑے کھنگال لیتا اور دو مرتبہ میونسپلٹی کے نل پر نہالیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ کسی سماجی کارکن نے معاشرے کی گندی تصویریں اتارنے کے لیے اپنا کیمرہ استعمال کیا۔ اخباروں میں ایک تصویر چھپی جس میں دکھایا گیا تھا کہ کس طرح نوجوان اپنی زندگی کے ساتھ خطرناک کھیل، کھیل رہے ہیں۔ اس میں یہ سین دکھایا گیا تھا کہ سیاست دان بھی نوجوانوں کے ساتھ خطرناک کھیل میں مصروف ہیں۔

مراد قصائی نے اسے یہ تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "اسے پہچانتے ہو؟"

"کون مردود ہے گولی مارو یار!" گیتو نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"ارے پاگل! یہ تم ہو اور کون ہے۔"

مراد قصائی نے اسے بتایا مگر گیتو کو تو اپنی شکل بھی اچھی طرح یاد نہ تھی۔ بس کبھی کبھی وہ اپنی شکل وصورت کو لال خان پان والے کے آئینے میں دیکھ لیتا تھا۔

لاپروائی اس کی زندگی میں اس قدر تھی کہ گیراج میں جب بھی مستری رمضان کی کوٹھی سے سازوں کی آواز اور گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دیتی تو بھی وہ کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتا۔ اس نے کبھی بھی اپنے مالک سے یہ نہیں پوچھا کہ رات کو طبلے کیوں بجتے ہیں۔ اور ڈانس ماسٹر منور حسین کن لڑکیوں کو ڈانس سکھانے لاتا ہے۔ اسے کچھ پوچھنے اور اس بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جو کچھ نہ پوچھے اور کچھ نہ سوچے ایسے آدمی کو بھلا مستری کیوں نہ پسند کرتا۔ اس لیے گیتو کو مستری کے گیراج میں رین بسیرے کی اجازت مل گئی تھی۔

گجرے مرجھاتے رہے پھول کملاتے رہے۔ راتوں کی تاریکیوں میں انسانیت کا خون ہوتا رہا لیکن گیتو نے اپنے دل میں کبھی کوئی چبھن محسوس نہ کی جیسے اس نے خود کو بھلا کر دنیا کو بھی بھلا دیا ہو۔ ایک مرتبہ کسی مولانا نے اسے مسلمان بنانے کے لیے پوچھا تھا۔

"تم عیسائی ہو؟"

"نہیں!"

"ہندو ہو؟"

"نہیں!"

"پھر کون ہو؟"

"بس میں گیتو کلینر ہوں۔" مولانا اُسے غصے سے گھورتا ہوا چلا گیا۔ دین اسلام کے بارے میں گیتو نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ ہاں کبھی کبھی مسجد سے اذان یا مندر سے ناقوس کی صدا سنتا تو نہ جانے کیا سوچنے لگتا۔ اس وقت مراد قصائی کا فقرہ ذہن کے پردے پر دستک مارتا۔

"ارے پاگل! یہ ساری دنیا دھوکہ ہے۔ بس خدا کا نام سچ ہے۔"

اسی طرح ایک صبح جب گیتو ورکشاپ کی صفائی کر رہا تھا تو اس نے مستری کی کوٹھی سے ایک لڑکی کو لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلتے دیکھا۔ ملگجی روشنی میں نظر آیا کہ لڑکی کے بال الجھے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد رات بھر کی جگار کے نشان تھے۔ اور وہ ایک پرانی بس کا سہارا لے کر گیراج میں رکھی ہوئی کائی جمی صراحی اور سلور

کے مڑے تڑے گلاس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک اس کے پاؤں فرش پر پڑے ہوئے ٹائر سے اُلجھ گئے۔ اور وہ دوسرے ہی لمحے چکنے کالے فرش پر دھڑام سے گر گئی۔

گیتو کو غصہ آ گیا لڑکی نے اس کا سارا سرور ختم کر دیا۔ اس کو سہارا دینے کے لیے وہ بے دلی سے اُٹھا اور لاپروائی سے بازو پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ کیا چاہیے؟

"میرا بازو چھوڑ دو۔" لڑکی نے کچھ حقارت سے کہا۔ "میری قمیص پر میلے ہاتھوں کے داغ لگا دیے۔"

"تیرے کپڑوں پر اس دھرتی کے بھی تو داغ ہیں۔" گیتو نے پلٹ کر جواب دیا۔ "ہماری قسمت ہی داغ دار ہے...... تم پیاسی ہو؟"

"ہاں پیاسی ہوں؟" خشک ہونٹ زبان پر پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ گیتو نے اسے گلاس بھر کے دیا اور وہ ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گئی۔ پھر اور پانی پینے صراحی کے پاس بیٹھ گئی۔ مٹھی میں مُڑا تڑا نوٹ زمین پر رکھ دیا۔ گیتو نے لپک کر نوٹ اٹھایا اور پوچھا یہ کیا ہے؟ لڑکی نے جھپٹا مار کر نوٹ چھین لیا اور بولی۔

"یہ نسوانیت کی قیمت ہے۔"

"تمہارا نام نسوانیت ہے؟" گیتو نے غور سے اسے دیکھا اور سوال کیا۔

"بالکل بدھو ہو۔" لڑکی نے ایک بے جان سا قہقہہ لگایا۔

"نہیں میں بدھو نہیں میرا نام گیتو ہے۔" گیتو نے چڑ کر کہا۔ "گیتو کلینر!"

"عجیب نام ہے۔" لڑکی نے نوٹ کو پلو میں باندھتے ہوئے کہا۔ "ضرور تمہارے تیرے باپ نے رکھا ہو گا۔"

"نہیں یہ نام مراد قصائی نے رکھا ہے۔" گیتو نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ "میرا کوئی باپ نہیں۔"

"تیرا کوئی باپ نہیں؟" لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں میرا کوئی باپ نہیں۔ مجھے کچھ یاد نہیں، کچھ معلوم نہیں۔"

اس وقت دونوں کے دلوں پر اداسیوں کے بادل چھانے لگے۔

لڑکی روہانسی ہو گئی۔ اس کے اندر کوئی آواز گونجی۔

"تو کیا میں کسی ایسے گیتو کو جنم دوں گی۔ جس کا کوئی باپ نہیں ہو گا۔ اور وہ کسی گندے گیراج کا ہو کر رہ جائے گا؟"

پھر لڑکی نے سوال کیا۔ "تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"وہ کم بخت بھی مر گئی۔"

"مر گئی؟"

"ہاں مر گئی۔ ہم سب بھی مر جائیں گے۔"

"کیا ہوا تھا اُسے؟"

"پتہ نہیں بس ایک دن اچانک فٹ پاتھ پر مر گئی۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔" گیتو نے بڑی غم زدہ آواز میں لڑکی کے سوالوں کا جواب دیا۔

لڑکی کے تن من میں سنسنی پھیل گئی اور اس کے احساسات کو جھنجھلا دیا۔ اس نے اپنے آپ کو کسی فٹ پاتھ پر دم توڑتے ہوئے محسوس کیا۔ اور حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ سانس گلے میں اٹکنے سی لگی اور زبان سوکھ گئی۔ وہ اپنی حسرت ناک موت کے تصور سے اداس ہو گئی گلاس میں بچا ہوا پانی ایک گھونٹ میں پی گئی۔ پھر گلاس کو صراحی پر رکھتے ہوئے مری مری سی آواز میں کہنے لگی۔ "مجھے ٹیکسی تو لا دو۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔"

گیتو ٹیکسی لایا جو گیراج کے باہر کھڑی ہوئی تھی لڑکی نے اسے دعا دی۔ "خدا تیرا بھلا کرے۔" گیتو آسمان کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا تو لڑکی نے پوچھا۔ "کیوں ہنس

رہے ہو؟" گیتو نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی۔ لمبا کش لگایا اور ڈھیر سا دھواں آسمان کی طرف چھوڑتا ہوا گیراج میں چلا گیا۔

دوسرے دن شام کے قریب گیتو۔ نوما جٹ سے چرس لینے باہر نکلا۔ دروازے کے قریب ہی اسے کل والی لڑکی مل گئی۔ گیتو کو دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"تم روز ناچنے آتی ہو؟" گیتو نے اس سے پوچھا۔

"نہیں، استاد منور حسین سے ناچ سیکھنے آتی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔

"ساری رات......؟"

"پاگل بدھو ہو گیتو!" لڑکی نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "استاد منور حسین اور مستری رمضان ساری رات مفلسی کو پیسے پر نچاتے ہیں۔" لڑکی کا جملہ گیتو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اور وہ نوما جٹ کے اڈے کی طرف چلا گیا۔

وہاں گلفام بیو نے گیتو کو خوب پلائی۔ ٹھرے کی تلخی سے منہ کڑوا ہو گیا۔ تو وہ میز کو لات مار کر باہر نکلا۔ اس وقت گیتو نے اپنے قدموں کو ہوا میں تیرتے ہوئے محسوس کیا۔ دل میں یہ تمنا جاگ اٹھی کہ وہ راستے میں ہی لیٹ جائے لیکن وہ چلتا رہا۔ چلتے چلتے بجلی کے کھمبے کو خوب گالیاں دیں اور خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈنے لگا۔ کچھ نہ ملا تو چاند کو تکنے کی سوجھی اور جب چاند بادلوں میں چھپ گیا تو آسمان کی طرف پتھروں کے ٹکڑے اچھالے۔ آخر لڑکھڑاتے ہوئے جیسے تیسے گیراج کا رُخ کیا اور اندر جا کر اپنے آپ کو بس کی پرانی سیٹ پر گرا دیا۔ دونوں بازو سر کے نیچے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک پیر میں خارش ہوئی، کھجانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اپنے لانگ بوٹ پر پڑ گیا۔ فوراً اس نے اپنے پرانے بوٹوں کو اتار پھینکا۔ عین اسی وقت کسی عورت کی منت سماجت کرنے کی آواز آئی جو رحم کرنے کے لیے پکار رہی تھی۔ گیتو کو ایسا لگا جیسے آواز مستری کی کوٹھی سے آ رہی ہو۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر سستی آڑے آ گئی اور جلد ہی اسے نیند نے دبوچ لیا۔

کتنے ہی دنوں تک گیتو نے پھر اس لڑکی کو نہیں دیکھا۔ ہاں ایک دن غروب آفتاب کے وقت اس نے کوٹھی میں مستری کی آواز سنی۔ وہ غصہ میں کہہ رہا تھا جب تک حکاشہ نہیں آئے گی میں ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔

"وہ آنے کے قابل نہیں ہے۔" گیتو نے ایک کمزور سی آواز سنی۔ وہ اس وقت مارتول سے رنگ پر ٹائر چڑھا رہا تھا۔

"آنے کے قابل نہیں ہے تو پیسے بھی نہیں۔" مستری نے رکھائی سے کہا۔

"مستری کچھ تو خیال کرو۔"

کمزور آواز نے عاجزی سے کہا۔ "ابھی تک تم نے اسے فلموں میں کام بھی نہیں دلایا ہے۔ اور ابھی تک اسے......"

"اس کے اسے پیسے بھی ملتے ہیں کوئی اللہ نام پر نہیں آتی۔" مستری چیخ رہا تھا۔ "اوروں کو تین سو روپے دیتے ہیں۔ اور تیری لڑکی کو تین سو پچاس روپے۔ اور ہاں، اسے کباب اور چانپ بھی بکری کے گوشت کی کھلاتے ہیں۔ سودا فائدہ مند ہے بڑھیا۔"

گیتو کی نظریں وزنی مارتول پر جم گئیں۔ مستری کے جملے اس کو کسی تیز ہتھوڑی سے کوٹنے لگے۔ اس نے اپنے دماغ اور دماغ کی سوچوں کو چٹختے ہوئے محسوس کیا۔ اس کا وجود زخمی ہونے لگا۔ روح کی نفرت مٹھیوں میں بھنچ گئی۔ انسان کی قیمت صرف ساڑھے تین سو روپے؟ جسم کو پامال کرنے کی قیمت صرف ساڑھے تین سو روپے؟ گیتو نے قہقہہ لگایا اور پھر دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا۔ مستری رمضان اور منور حسین گیتو کے قہقہوں کی آوازیں سن کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ گیتو نے گھور کر دونوں کو

"اوئے پپو کے بچے پیسے نکال۔" گلفام پپو نے اور زیادہ بدمست ہونے کے لیے پیسے تو نہ دیے البتہ وہ اسے مراد قصائی کی کوٹھڑی میں لے گیا۔ جہاں جوا کھیلا جا رہا تھا۔ گیتو کو جوا کھیلنے کے لیے گلفام پپو نے کچھ رقم ادھا دی۔ اور اتفاق کی بات کہ اس نے جیت جیت کر سب کو لوٹ لیا۔ اور پھر گلفام پپو کے لاکھ منع کرنے کی پروا نہ کرتے ہوئے جیت کے سارے پیسے ٹھرے میں اڑا دیے۔ اور ایسی بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا کہ وہاں بیٹھے ہوئے سارے گاہکوں کو ہنسی آ گئی۔ اور کچھ تو زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ تو ماجٹ کو کاؤنٹر پر بل ادا کر کے گیتو کے پاس سو سو کے تین ایک پچاس کا نوٹ بچے تھے۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ وہ بڑبڑایا۔

"اب آ گئی ہو گی؟" اس کو اپنے سینے میں آتش فشاں سا بھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔ جس کا لاوا اس کے سارے وجود کو جلانے لگا۔ اِدھر زوردار قہقہے اور دل خراش دیکھا لوہے کے وزنی ہتھوڑے پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور پھر اس نے پوری طاقت سے ہتھوڑا صراحی پر دے مارا صراحی چور چور ہو گئی۔ اور پانی چھلکے فرش پر پھیل گیا۔

"کم بخت نے کچھ زیادہ ہی پی لی ہے۔" منور حسین نے ٹوکا۔

مستری رمضان دانت پیستے ہوئے گیتو کی طرف بڑھا۔ اور ایک زوردار تھپڑ جڑتے ہوئے غرایا۔ "جاہل کے بچے کیا دماغ خراب ہے؟"

گیتو کے قہقہے بادلوں کی گرج کی طرح گونج کر خاموش ہو گئے، دل کی دنیا میں ساون کی جھڑی لگی اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے سیٹ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس رات مستری کے تھپڑ کو بھلانے کے لیے اس نے اتنی پی لی کہ جیب بالکل خالی ہو گئی۔ تب اس نے گلفام پپو کو کندھا پکڑ کر کہا۔

آوازیں......

"یہ تو بالکل آؤٹ ہو گیا۔" کسی نے کہا۔ گیتو نے دونوں مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے کہا۔

"میں آؤٹ نہیں، کھلاس نہیں، ختم نہیں ہوا۔" وہ جیسے تیسے لڑکھڑاتا۔ ڈگمگاتا بجلی کے کھمبے سے ٹکراتا گیراج تک پہنچ گیا۔ اس نے بڑی ہیجانی کیفیت میں سوچا۔ زنگ خوردہ لوہے سے زنگ اتارنے کے لیے وزنی مارتول سے کوٹنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی زنگ خوردہ نٹ بولٹ بھی ہتھوڑے کی ایک ضرب سے دوہرے ہو جاتے ہیں۔

آج مستری کے تھپڑ نے اس کے ذہن کا شعور کا، شعور کا اور بے حسی کا زنگ اتار دیا تھا۔ اس کا ضمیر اور غیرت بے چین ہو کر جاگ اُٹھے تھے۔ اس کی رگ رگ میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ رات بھیگنے لگی تھی۔ مگر پھر بھی اس کا بدن تپ رہا تھا۔ تپش میں آ کر کانپتے ہوئے اٹھا اور رینگتے ہوئے دماغ سے مستری رمضان اور منور حسین کو چھلنی چھلنی کر کے مارنے کا فیصلہ دونوں کی دولت کو شکست دینے کا ارادہ کر لینا آسان نہ تھا۔ سو سو کے تین اور ایک پچاس کا نوٹ نکال کے گیتو نے اپنی مٹھی میں اور زور سے دبا لیے اور کچھ ایسا محسوس کیا جیسے مستری رمضان اور منور حسین کی سانس کو بھینچے ہوئے ہے۔ ایک عجیب سی خوشی کا احساس قہقہوں کا روپ دھار کر رات کی تاریکی میں گونجنے لگا۔

"ہو...... ہو...... ہا...... ہا آج رات میں ان ظالموں کو مات دے دوں گا۔" پھر اچانک کچھ اور بڑبڑاتے ہوئے اس کا لہجہ غمگین ہو گیا اور تمام خوشی کافور ہو گئی۔ "آج کی رات میری کوئی بہن کوٹھری میں نہیں ہو گی۔ غریبی عورت کو ناچنے پر مجبور نہیں کرے گی۔"

گیتو نے پرانے لانگ بوٹ کی ٹھوکر سے گیراج کا دروازہ کھولا۔ اور لپک کر مستری کی کوٹھی کے دروازے پر چیخنے لگا۔

"ارے او مستری رمضان! او کمینے باہر نکل، میں تیرا اور تیری دولت کا دشمن ہوں۔ میں عکاشہ کا بھائی ہوں۔ لے یہ ساڑھے تین سو روپے اور عکاشہ کو باہر بھیج۔"

دروازہ کھلا۔ ایک تھانیدار اور دو پولیس کانسٹیبل باہر نکل آئے۔ گیتو اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی نظریں بدحواسی میں دروازے کی جانب اٹھیں تو جمی کی جمی رہ گئیں۔ مستری رمضان کے ہاتھ میں جام تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک لڑکی ...... نیم عریاں لباس میں بڑے ناز و انداز سے ہونٹوں میں سگریٹ دبائے کھڑی تھی، مگر وہ عکاشہ نہیں تھی۔ مستری رمضان تیزی سے گیتو کی طرف بڑھا اور نفرت بھرے لہجے میں بڑبڑایا۔

"گیتو اب تُو نے سوچنا اور بولنا شروع کر دیا ہے۔ ایسے آدمی ہمیں پسند نہیں ہیں۔" پھر مستری نے تھانیدار کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ ہے گیتو جس نے مراد قصائی کی دکان میں جوا کھیلا اور جس کی تلاش میں آپ یہاں آئے ہیں۔"

سپاہیوں نے گیتو کو ہتھکڑیاں پہنائیں۔ وہ چپ چاپ رہا، نہ کوئی احتجاج نہ فریاد۔ صرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے مستری رمضان کو دیکھتا رہا۔ مستری نے فاتحانہ انداز میں سگریٹ کا لمبا کش لیا اور سگریٹ کا دھواں اپنے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی کے چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

"گیتو! یہ عکاشہ نہیں ہے۔ ہاں ایک دوسری عکاشہ ہے۔ تم جیسے سر پھرے کتنی عکاشاؤں کو بچا سکیں گے؟"

گیتو اب سنٹرل جیل میں سزا کاٹ رہا ہے۔ سپاہی اسے روزانہ بدذائقہ چائے پلا کر اور آدھی روٹی کھلا کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ قومی شاہراہ کے پتھر کوٹنے لے جاتے ہیں۔ گیتو نے پھر سے اپنے آپ کو کسی پتھر کی طرح بے حس کر لیا ہے لیکن پھر بھی جب وہ کسی پتھر پر ہتھوڑا برساتا ہے تو اس کے سامنے پتھر نہیں مستری کا کاسہ سر ہوتا ہے اور اس ضرب میں بڑا غضب اور قہر ہوتا ہے۔

وفا ہے ذات عورت کی

ریاض عاقب کوہلر

آخری قسط

......اور یاد رکھنا شوبز کی دنیا میں بہت زیادہ منافقت پائی جاتی ہے۔ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر، لہجے میں جعلی مٹھاس سمو کر، بداخلاقی پر مکاری اور چاپلوسی کی ملمع کاری کر کے ٹائم گزارا جاتا ہے......

کافی دیر بے حس و حرکت لیٹے رہنے کے بعد اس نے بند آنکھیں کھولیں۔ سامنے دیوار پر گھڑی پر نگاہ ڈالی، ساڑھے نو بجے پر سرگرداں سوئیاں اس کے لیے حیرانی کا باعث بنی تھیں۔ ورنہ اُس کے اندازے میں رات کے دو، تین کا ٹائم ہونا چاہیے تھا۔ مزید چند منٹ اُسی ہیئت میں گزار کر وہ لہولہان احساسات اور نڈھال جسم کو سمیٹتے ہوئے اُٹھی۔ پہلے پہل اسے لگا کہ ٹانگیں اس کے بدن کا بوجھ برداشت نہیں کر سکیں گی۔ اس نے بیڈ کا سہارا لینا چاہا مگر یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ شل ہوتے احساسات نے اس کے قویٰ پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ چند لمحوں میں جیولری اتار کر اس نے کپڑے بدلے۔ کپڑے اور جیولری بیڈ پر ہی چھوڑتے ہوئے اس نے گاؤن ڈال کر نقاب اوڑھی اور پرس اٹھا کر باہر نکل آئی...... اس گھر میں رہنا اب اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

"چوکیدار چچا! ٹیکسی یا رکشہ لے آؤ۔"

"جی بی بی جی!......" کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ مانو حسرت سے ان در و دیوار کو دیکھنے لگی۔ اس کے ہنستے بستے گھر کو جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ اتنی محبت اور چاہت کا دعوے دار جانے کیوں اجنبی بن گیا تھا۔ شہیر کا حالیہ رویہ دیکھ کر اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی شہیر ہے۔ اس کی محبت جس کے لیے سرمایہ حیات تھی۔ جو لباس بدلنے سے پہلے پہننے والے لباس کا رنگ اس سے پوچھنا ضروری خیال کرتا۔ جو اپنی پسندیدہ غذا اس کی وجہ سے ناپسندیدہ خوراک کی فہرست میں شامل کر لیتا۔ شاید یہ پچھلے چند ماہ کی دوری کا پھل ہے اس کے ذہن میں ایک مفکر کا مشہور قول گونجا۔ "اپنے چاہنے والوں کو اپنی کمی ضرور محسوس کرائیں مگر یہ دوری اتنا طول نہ کھینچے کہ وہ آپ کے بغیر جینا سیکھ جائیں۔" شاید شہیر اس کے بغیر جینا سیکھ گیا تھا۔ یا شہرت اور دولت پا کر وہ بدل گیا تھا۔

مگر کہتے ہیں فطرت کبھی نہیں بدلتی...... یقیناً شہیر کا اصل روپ ہی یہی تھا جو دولت شہرت اور اختیار پا کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کی انہی سوچوں کے دوران چوکیدار ٹیکسی لے آیا۔ عقبی نشست پر بیٹھتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو لاری اڈا جانے کو کہا...... اور رومال نکال کر بے ساختہ امڈ پڑنے والے آنسو پونچھنے لگی۔ نقاب میں ہونے کی وجہ سے ڈرائیور اس کی کیفیات سے بے خبر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت حسین رات تھی...... شہیر کی حالت ایسی تھی جیسے ایک بھوکے کے سامنے دستر خوان پر اس کا دل پسند کھانا چن دیا گیا ہو...... بھولی بھالی اور شرمیلی ایمان بھی شرم و حیا کا لبادہ اتار کر بے باکی اور بے حیائی کی نئی تاریخ رقم کر رہی تھی...... اس دل پسند کھیل میں مشغول شہیر معصوم مانو کو بھول گیا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہو گی۔ حیوانی جذبات اور نفسانی خواہشات انسان سے شرف آدمیت ہی نہیں چھینتے اس کے دل سے ہمدردی اور رحم دلی جیسے احساسات بھی ختم کر دیتے ہیں۔

رات کے تھکے ہارے دن چڑھے تک سوتے رہے۔ ایک بجے کے قریب شہیر کی آنکھ ایمان کے شرارت بھرے لمس سے وا۔

"اٹھ جاؤ جناب!...... کوئی چائے پانی کا بندوبست کرو...... تیری بیگم صاحبہ تو زہر کے علاوہ کچھ کھلانے سے رہی۔"

شہیر انگڑائی لیتا اٹھ بیٹھا...... ایمان کی بات ایک لحاظ سے درست تھی کہ مانو کو ناشتہ بنانے کا کہتا اسے خود بھی قبول نہیں تھا۔ نامعلوم وہ رات کا کھانا بھی کھا سکی تھی کہ نہیں۔ یوں بھی اس نے کھانا ہوٹل سے منگوایا تھا اور مانو کے لیے بھی رکھ چھوڑا تھا۔ مگر مانو کے مزاج کو مدِنظر

رکھتے ہوئے اسے سو فی یقین تھا کہ وہ بھوکی لیٹی ہوگی۔ کچن میں رات کے بے ترتیبی سے رکھے ہوئے گندے برتنوں نے اس کے اندازے کی تصدیق کی تھی۔ چوکیدار کو تین بندوں کا ناشتہ لانے کا کہہ کر وہ باتھ روم میں گھس گیا اور پھر جب تک وہ دونوں فریش ہوئے چوکیدار ناشتہ لے آیا تھا۔

''کتنا خیال ہے بیگم صاحبہ کا...... کہ اسے ناشتہ بنانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔'' تین آدمیوں کا ناشتہ دیکھ کر ایمان طنز سے باز نہیں آسکی تھی...... جواباً شہیر کھسیانے انداز میں مسکرانے کے علاوہ کچھ نہ بول سکا۔ ناشتے کے دوران ایمان کی لگاوٹ بھری گفتگو جاری رہی۔ یقیناً اس کی کوشش مانو کو ٹارچر کرنے کی تھی۔ شہیر کے جواب ہوں ہاں تک ہی محدود تھے۔

ناشتے کے بعد اس نے پوچھا۔

''اب شگفتہ کے فلیٹ پہ جانا ہے یا......؟'' فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے وہ اسے سوالیہ نظروں سے گھورنے لگا۔

''تو اور کیا...... ایک تو بہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''کیا خبر آج پھر جاگنا پڑے۔ میرے سرجی کے موڈ کا پتہ تو نہیں چلتا نا؟''

''اچھا چلو تمہیں چھوڑ آؤں''۔ شہیر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایمان کے معنی خیز جملوں کا جواب دینے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ وہ مانو کا لحاظ کر رہا تھا اور اس کی کوشش کسی کے دل میں خنجر اتارنے کے بعد خنجر نکالے بغیر زخموں سے خون کے اخراج کو روکنے والے جیسی تھی۔

''ہاں چلو ڈیئر''۔ وہ اُٹھ کر اس کے بازو کے ساتھ چپک گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ شگفتہ کے فلیٹ میں پہنچ گئے تھے۔ ایمان کو باہر سے ہی الوداع کہہ کر وہ واپس لوٹ آیا۔

مانو! ابھی تک نہیں اٹھی تھی۔ اس نے خواب گاہ میں جھانکا۔ دن کے ٹائم بھی لائٹ جل رہی تھی۔ بیڈ پر اُسے وہی لباس پڑا نظر آیا جو گزشتہ کل مانو نے پہنا ہوا تھا۔ ساتھ ہی جیولری بھی بے ترتیبی سے پڑی تھی۔ اس کا دل ناخوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا۔

''شاید باتھ روم میں ہے۔'' آگے بڑھ کر اس نے باتھ روم کے دروازے کو دھکیلا تو دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ باتھ روم خالی تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کچن کی طرف بڑھا مگر وہاں بھی بے ترتیب برتنوں کا انبار اس کا منہ چڑھا رہا تھا...... کچن سے نکل کر اس نے اسٹڈی روم میں جھانکا اور پھر باہر نکل آیا۔

''چوکیدار چاچا...... بیگم صاحبہ گھر سے باہر تو نہیں نکلیں؟''

''جی صاحب! وہ تو رات کو ہی کہیں چلی گئی تھیں؟'' اس نے ایک خیال کے تحت چوکیدار سے پوچھا۔ چوکیدار کے چہرے پر حیرت کی لہر آ کے گزر گئی تھی۔

''رات کو......؟'' اب حیران ہونے کی باری شہیر کی تھی۔ ''کس ٹائم...... کہاں؟''

''ٹائم تو غالباً دس بجے کا تھا...... کہاں گئیں اس بات سے میں ناواقف ہوں۔ مجھے کہا کہ ٹیکسی لے آؤ...... میں ٹیکسی لے آیا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کے چلی گئیں۔''

''تیرا کام بنتا تھا کہ مجھے اسی ٹائم مطلع کرتے۔'' شہیر نے اسے جھاڑ پلائی۔

''م...... مگر صاحب جی! ...... مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ آپ کی لاعلمی میں کہیں جا رہی ہیں؟'' چوکیدار کی بات صحیح تھی۔ شہیر اس سے بحث کیے بغیر واپس مڑ گیا۔ تھوڑا سوچنے پر اسے مانو کا طرزِ عمل عجیب نہ لگا۔ شہیر کے رویے اور سلوک سے تنگ آ کر وہ لازمی طور پر گھر چلی گئی تھی۔

"اب شاید وہ طلاق کا مطالبہ کردے۔" یہ سوچ اسے پریشان کرگئی۔ مگر اس پریشان سوچ میں سرگرداں رہنے کی بجائے اس کی خیریت پوچھنی ضروری تھی۔ اتنی رات گئے اس کا اکیلے لاہور سے پنڈی کا رُخ کرنا کوئی مناسب فعل نہیں تھا۔ وہ اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تیسری چوتھی بیل پر کال ریسیو کرلی گئی۔

"ہیلو شہیر بھیا...... میں حفصہ بات کررہی ہوں کیسے ہیں آپ؟" شہیر کی سماعتوں میں مانو کی چھوٹی بہن کی آواز گونجی۔

"ہاں گڑیا...... تم کیسی ہو...... اور باجی کدھر ہیں تیری؟"

"وہ تو سوئی ہیں شہیر بھیا...... انہیں تیز بخار ہے۔" حفصہ معصومیت سے بولی۔ وہ بے چاری یقیناً اصل بات سے ناواقف تھی۔

"کس ٹائم گھر پہنچی تھی؟"

"ابھی گھنٹہ ڈیڑھ ہوا ہے پہنچی ہیں......"

"ٹھیک ہے جاگتی ہے تو میرے فون کا بتا دینا۔" رابطہ منقطع کرکے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ آخر وہ اتنی دیر کہاں رہی تھی۔ اگر چوکیدار کا بیان سچ مان لیا جاتا تو وہ دس بجے گھر سے نکلی تھی اگر اسے بارہ بجے والی گاڑی میں بھی سیٹ مل گئی ہو تو اسے ساڑھے چار، پانچ بجے تک گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ جبکہ حفصہ کے کہنے کے مطابق وہ ایک ڈیڑھ بجے گھر پہنچ رہی تھی۔ درمیان کے آٹھ نو گھنٹے وہ جانے کہاں رہی تھی۔

"شاید وہ لاری اڈے سے سیدھی میرے گھر گئی؟" ایک امکانی سوچ اس کے دماغ میں ابھری مگر وہ اس بات کی تصدیق کی جرأت اپنے والد یا والدہ سے نہ کرسکا۔ یوں بھی مانو خیریت سے گھر پہنچ گئی تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

☆☆☆

ایمان کے لیے یہ خبر مسرت کا باعث بنی تھی کہ اس کی مقابل شکست تسلیم کرکے بھاگ گئی ہے۔ وہ مستقل شہیر کے ساتھ شفٹ ہوگئی تھی۔ کھانا پکانے اور گھر کی صفائی کے لیے شہیر نے ایک ادھیڑ عمر ملازمہ رکھ لی تھی جو چوکیدار کی دور پار کی رشتہ دار تھی۔ مانو کی خواب گاہ کو شہیر نے لاک کردیا تھا۔ ایمان اور وہ سٹڈی روم ہی کو بطور بیڈ روم استعمال کرتے تھے۔

ملازمہ کو کام پر آئے دوسرا دن تھا۔ شہیر رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا قلم لکھنے میں مصروف تھا۔ ایمان شوٹنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اس کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا۔ سٹڈی روم کی صفائی کرتے ہوئے ملازمہ نے اچانک شہیر کو آواز دی۔

"صاحب جی!...... یہ کیا ہے؟" شہیر نے ناگواری سے اس کی جانب نظر اٹھائی۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چوڑیوں کا سیٹ تھا جو غالباً پردے کے ساتھ ہی سلا ہوا تھا۔ شہیر اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"پپ...... پتہ نہیں صاب......! یہ پردے کے کونے کے ساتھ سلائی کرکے رکھی گئی تھیں۔ میں نے سوچا شاید...... کسی مقصد سے پڑی ہوں گی؟" ملازمہ کے لہجے میں الجھن تھی۔

"ٹھیک ہے...... تم صفائی کرو میں دیکھ لیتا ہوں یہ کیا ہے"۔ ملازمہ کام میں مصروف ہوگئی اس نے پُرخیال انداز میں پردے کو دیکھا۔ چوڑیوں کے سیٹ پر سے پیکنگ نہیں اتری تھی۔ غور کرنے پر اسے پتہ چلا کہ پیکنگ کا رنگ اور پردے کا رنگ ایک جیسا ہی تھا۔ گہرے سبز رنگ کے پردے تھے اور اسی رنگ کی پیکنگ، اس کی وجہ لازماً ان کی موجودگی کو پوشیدہ رکھنا تھا۔

شہیر نے پردے کے کونے کو چھوڑا تو وہ کھڑکی کے کونے میں فٹ ہو گیا۔ ایک حوتع خیال کے تحت کمرے سے باہر نکل کر اس نے کھڑکی کے کونے سے جھانکا تو ایک جھماکے کی طرح اس پر بات واضح ہو گئی۔ وہاں سے دیکھنے پر اسے اپنی رائٹنگ ٹیبل واضح نظر آئی جس پر بیٹھ کر وہ ساری ساری رات لکھنے میں بتا دیتا۔ وہ چوڑیاں مانو نے لگائی تھیں چونکہ پچھلے چند ماہ سے ان کی بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی اور وہ اسے لکھتے ہوئے دیکھ نہیں پاتی تھی۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا تھا کہ کھڑکی سے ہی اسے دیکھتی رہتی۔ شہیر کے دل میں اپنی مانو کی محبت نے سر ابھارا، وہ معصوم لڑکی بلاشک وشبہ اسے چاہتی تھی۔ اسے لکھتے ہوئے کئی بار یہ احساس ہوا تھا کہ کوئی اسے گھور رہا ہے۔ مگر اپنا وہم سمجھتے ہوئے اس نے اس پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ چوڑیوں کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ پریشان سا صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ مانو کے ساتھ ہونے والی زیادتی نے اس پر پچھتاوے کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس یہ پچھتاوے شاید کسی بہتری کا سبب بنتے مگر اسی وقت ایمان کی آمد اسے گہری سوچوں سے باہر لے آئی۔ وہ اس وارفتگی سے لپٹ کر خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ اس کے پُرجوش انداز نے شہیر کی انا کو اپنی اہمیت کا احساس دلایا اور وہ جو چند لمحے پہلے مانو کو منا لانے کا سوچ رہا تھا دوبارہ اپنی انا کے خول میں سمٹ گیا۔ ''کیسا گزرا دن؟'' ایمان کا جوش ٹھنڈا پڑا تو وہ پوچھنے لگا۔

''بہت مزا آیا جان..... مگر تیری کی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔'' وہ جواباً چہکی۔

شہیر نے کہا۔ ''ابھی! میں مسلسل تو تیرے ساتھ نہیں آسکتا نا.....؟ البتہ کبھی کبھار چکر لگا لیا کروں گا۔''

''مگر آج تو تمہیں آنا چاہیے تھا ناں؟'' وہ شکوہ کناں ہوئی۔ ''پہلا دن تھا شوٹنگ کا۔''

''تم نے مجھے دعوت ہی نہیں دی۔'' شہیر نے مسکرا کر بہانہ بنایا۔

''جگا تو رہی ہوں..... صاحب کی نیند ہی پوری نہیں ہو رہی تھی۔'' وہ لاڈلی بیوی کے سے انداز میں بولی۔

''ویسے بڑی جلدی آ گئی ہو؟..... میں بس ابھی ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔''

''تیرا ناشتہ بھی تو عصر کے ٹائم پر ہوتا ہے۔'' وہ گولڈ کلر کی نازک سی ریسٹ واچ پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی..... وہ قیمتی گھڑی اسے شہیر ہی نے لے کے دی تھی۔

''اچھا فریش ہو جاؤ..... پھر آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔ ڈنر باہر ہی کریں گے۔'' شہیر نے کہا اور وہ سر ہلاتے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

شہیر کہیں دو ماہ بعد گھر جا سکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ والدین اس سے مانو کے متعلق استفسار کریں گے مگر ماسٹر سلیم اختر نے سرسری لہجے میں بھی اس سے دریافت نہیں کیا تھا۔ موسیٰ اور یوشع بھی اسے خوش وخرم نظر آئے تھے۔ اپنا بیڈروم اسے پہلے کی طرح صاف ستھرا ملا تھا۔ صفائی کا یہ اہتمام اس کی ماں کی مرہونِ منت ہی ہو سکتا تھا۔

وہ ایک دن سے زیادہ وہاں نہ ٹھہر سکا اور واپس لاہور آ گیا۔ پہلے پہل اس کا خیال تھا کہ شاید مانو طلاق کا مطالبہ کرے گی دو ماہ گزرنے کے بعد بھی اس کی جانب سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں آیا تھا۔ نہ اس کے والد ہی نے کسی قسم کا گلہ شکوہ کیا تھا۔ اب یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ مانو نے اس علیحدگی کا گھر والوں کے سامنے کیا جواز پیش کیا تھا۔ پھر اپنے والدین کا رویہ بھی اسے عجیب سا لگا تھا۔ انہوں نے فون پر بھی اس سے مانو

کی بابت دریافت نہیں کیا تھا۔ اس کی توجیہ وہ اپنے ذہن میں یہ کرتا تھا کہ شاید مانو اپنے گھر سے ہی ان سے فون پر بات چیت کر لیتی ہو گی اور وہ سمجھتے ہوں گے کہ مانو، شمیر کے ساتھ ہی ہے۔ مگر اس کی گھر آمد پر بھی والدین کا باز پرس نہ کرنا ظاہر کرتا تھا کہ ان کے مابین کشیدگی والدین کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اور پھر اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ اس دن مانو صبح سویرے ہی گھر پہنچ گئی تھی۔ اور اپنے والدین کے سوالات سے بچنے کے لیے لازماً اس نے پہلے سسرال جانا ہی مناسب خیال کیا ہو گا۔ مگر اپنے والدین کا مانو کے بارے کسی قسم کا استفسار نہ کرنا اسے ضرور حجب کر رہا تھا...... خود اپنے اندر بھی وہ اتنی جرأت مفقود پاتا تھا کہ اسے موضوع پر ان سے کوئی بات کرتا۔

اس کی واپسی پر ایمان اس سے یوں ملی تھی کہ جیسے عرصے کے بچھڑے ملتے ہیں۔

ایمان آفندی نے سات آٹھ ماہ میں ہی فلم کی شوٹنگ مکمل کر لی تھی۔ اور پھر فلم کے ریلیز ہونے کے ساتھ ہی ایمان کو دھڑا دھڑ فلموں کی آفر ہونے لگی۔ تین، چار اکٹھی فلمیں سائن کرنے کے بعد اس نے ایک چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لی اور وہاں پر شفٹ ہو گئی۔ اس بارے اس نے شمیر کو مطلع کرنے پر اکتفا کیا تھا...... جس کی وجہ سے شمیر کے دل میں ہلکی سی خفگی بھی پیدا ہوئی تھی کہ کم از کم اسے شمیر سے اجازت ضرور لینی چاہیے تھی...... وہ ہفتہ بھر تو منتظر رہا کہ جب وہ دوبارہ اس سے رابطہ کرے گی تو وہ اسے ضرور باور کرائے گا مگر اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ شہرت اور دولت کی آمد انسان کو اپنے محسنوں کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ مجبوراً اسے خود کال کرنی پڑی مگر نمبر اسے بند ملا۔ ہفتہ بھر مزید گزرنے کے بعد اس نے دوبارہ فون کیا مگر نمبر اسے بند ہی ملا۔

"شاید اس نے نمبر تبدیل کر لیا ہے۔" اس نے سوچا اور ایک دن اسے ملنے کے لیے اس کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ کوٹھی کے گیٹ پر کھڑے چوکیدار کے استفسار نے اسے بدمزہ سا کیا مگر وہ برداشت کر گیا کہ وہ غریب اس سے واقف نہیں تھا۔ انٹرکام پر اس نے شمیر کا نام بتا کر کسی سے پوچھا اور پھر اس کے لیے گیٹ کھول دیا۔ کار پورچ میں کھڑی کر کے وہ اندر داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم میں نازلی کو دیکھ کر اسے ہلکی سی حیرت اس لیے بھی ہوئی کہ اس کا انداز واضح انداز میں چغلی کھا رہا تھا کہ وہ اس گھر کی مالکن نہیں تو حصہ دار ضرور ہے۔

"آئیں شمیر جی!...... بڑے عرصے کے بعد زیارت کرائی ہے۔" اس کے بولنے کے انداز نے بھی شمیر کے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔ شمیر کو اس کے انداز میں پہلے والی مروت، اخلاق اور اس کے لیے احترام کا جذبہ مفقود نظر آیا۔ مگر وہ نہ تو اسے ملنے آیا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی غرض ہی تھی۔

"ایمان سے ملنا تھا۔" اس نے بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول کیا تھا۔

"بے بی تو اس وقت آرام کر رہی ہے...... آپ تشریف رکھیں کوئی چائے پانی ہو جائے۔"

"نہیں...... بس ایمان سے ملنا تھا...... اس کا کمرہ کون سا ہے میں خود اسے جگا دیتا ہوں۔" شمیر کے لیے عام سلوک قابل برداشت نہیں تھا۔ اس کے ایمان کے ساتھ جس قسم کے تعلقات تھے ان سے شاید نازلی واقف نہیں تھی تبھی یوں بوگس بہانے سے ٹرخا رہی تھی۔

"شمیر جی بتایا تو ہے بے بی آرام کر رہی ہے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"مجھے ایمان سے ملنے کے لیے غالباً تیری اجازت کی ضرورت نہیں پڑے گی؟" شمیر کا پارہ بلند ہونے لگا۔"

"بھلا وہ کیسے؟" نازلی کے لہجے میں استہزاء کا عنصر نمایاں تھا۔

"یہ اس سے پوچھ لینا۔" وہ غصے سے بولا۔ "اور اب برائے مہربانی مجھے اس کی خواب گاہ بتا دیں۔"

"ویری ..... ویری جناب..... میں اس کی بڑی بہن ہوں اور جانتی ہوں اسے کس سے ملنا ہے اور کسے ڈرائنگ روم سے چلتا کرنا ہے۔"

"ہونہہ!..... بڑی بہن....." شبیر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "وہ کیا کہتے ہیں۔

"کمائیں میاں خان خاناں، اڑائیں میاں فہیم"

"مسٹر شبیر! پچھلے چند ماہ جو تم نے گل ناشگفتہ کے ساتھ گل چھرے اڑاتے گزارے ہیں ان لمحات میں اگر تم ایک مرتبہ بھی اس معصوم اور بے کس لڑکی سے پورا نام پوچھ لیتے تو وہ لازماً کہتی ایمان علی..... غزالہ علی اور شگفتہ علی کی چھوٹی بہن..... مگر کیسے پوچھتے؟ تمہارا مطمع نظر تو ہوس تھا۔ ایک دوشیزہ کی لہولہان روح اور کرچی کرچی احساسات سے تجھے کیا واسطہ۔" نازلی کے الفاظ میں شامل نفرت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"شبیر کے لیے یہ خبر تعجب کا باعث تھی کہ ایمان، نازلی اور شگفتہ کی سگی بہن ہے اور اگر یہ سچ تھا تو صاف ظاہر تھا وہ ایک منصوبے کے تحت ہی اس کے قریب آئی تھی اور اس کا شبیر کے قریب ہونا تینوں بہنوں کی ملی بھگت تھا۔ اپنے منصوبے میں وہ سو فیصد کامیاب رہی تھیں۔ اور اس بلندی کے لیے استعمال کی جانے والی سیڑھی کی اب ان کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ یوں بھی ایمان جیسی تو خیز ہیروئن کے ساتھ کسی مرد کا دم چھلا کامیابی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ جب تک ایمان کو شہرت نہ مل گئی اس نے شبیر سے علیحدگی ہی میں عافیت سمجھی۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ جتنے دن وہ شبیر کے قریب رہی تھی اس نے شاپنگ اور آؤٹنگ کی آڑ میں شبیر کے بینک بیلنس کو اچھا خاصا دھچکہ پہنچایا تھا۔ اور وہ جو ایک بڑی کوٹھی خریدنے کی تمنا دل میں پالے ہوئے تھا وہ التوا کا شکار ہو گئی تھی۔

"واہ مس غزالہ عرف نازلی صاحبہ!..... کتنی معلوم اور ڈھکی ہو تم تینوں بہنیں۔ داد دینی چاہیے تمہاری معصومیت کی۔"

وہ شبیر کے طنز کو خاطر میں لائے بغیر اطمینان سے بولی۔ "تو کیا تمہیں باہر جانے کا رستہ معلوم ہو گا؟"

اس کا بدتمیز اور تمسخر بھرا لہجہ ناقابل برداشت تھا۔

وہ دھاڑا۔

"شٹ اپ۔"

"یو شٹ اپ۔" وہ کوئی ڈرتی نہیں تھی اس سے کہ خاموش رہتی۔

اور پھر شبیر کے کچھ کہنے سے پہلے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر ایمان نے باہر جھانکا۔ اسے دیکھ کر شبیر کے بگڑے تیور اعتدال پذیر ہونے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سارے ڈھکوسلے نازلی کی اپنی اختراع تھے۔ مگر جب وہ بولی تو شبیر کے سر پر گویا بم پھٹ پڑا۔ اس کے کانوں میں سنسناہٹ ہونے لگی اور آنکھوں میں نیلے پیلے ستارے ناچنے لگے۔ وہ بمشکل خود کو سنبھال سکا تھا۔

"باجی کون ہے یہ؟ ..... اور کیوں چلا رہا ہے؟ ..... کم از کم شرفا کے گھر جا کر بولنے کا ڈھنگ بندے کو سیکھ لینا چاہیے۔"

اپنے بارے ایمان کے ریمارکس اگر اس نے خود نہ سنے ہوتے تو کسی دوسرے کہنے پر مر کر بھی یقین نہ کرتا۔ بھولی بھالی، منس مکھ اور سیدھی سادی ایمان اسے کسی ڈائن سے کم نظر نہ آئی۔ شبیر کی گویائی وقتی طور پر سلب ہو گئی تھی۔ یوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی جانب گھورتے پا کر ایمان دوبارہ بولی۔

"باجی..... دو ملازموں کو بلا کر اسے باہر نکالو۔

www.paksociety.com

خواہ مخواہ نیند خراب کر دی ایڈیٹ نے۔" یہ کہہ کر اس نے دھڑام سے دروازہ بند کیا اور غائب ہو گئی۔

نازلی نے کہا۔ "مسٹر...... اتمہاری تسلی ہو گئی ہو تو تشریف لے جائیں۔"

شبیر کی خاطر خواہ تسلی ہو گئی تھی۔ اگر وہ مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو شاید حواس کھو بیٹھتا۔ ایمان سے اس کی جذباتی وابستگی ماورجتی تو نہیں تھی لیکن بلا مبالغہ وہ اسے بلا شرکت غیرے ذاتی چیز سمجھتا تھا۔ اندرونی ابال پر قابو پانے میں اسے چند منٹ لگے۔ اس دوران نازلی اطمینان سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے سے طیش کا عنصر ناپید تھا۔

"مس نازلی......! میں نے طوائفوں کی طوطا چشمی کے واقعات کتنے پڑھے تو بہت تھے لیکن کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ شکریہ کہ تم لوگوں کے طفیل یہ تجربہ بھی حاصل ہو گیا۔ بہر حال بہت بھونڈا۔ بدتمیز اور گھٹیا انداز اپنایا ہے تم لوگوں نے کنارہ کشی کا۔"

"گھٹیا لوگوں کے لیے گھٹیا انداز اپنانا مجبوری بن جاتی ہے۔" نازلی اتنی آسانی سے شرمندہ ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"ہاں بس افسوس تو اسی بات کا ہے کہ میری رکھیل کی بڑی بہن مجھے گھٹیا کہہ رہی ہے جو خود بھی ...... خیر چھوڑو گندگی کو الٹنے پلٹنے سے بدبو ہی پھیلے گی۔" اس کے طنز کو نازلی نے ہلکے سے استہزائی قہقہے سے اڑا دیا تھا۔ شبیر کا وہاں مزید رکنا بے کار تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا۔

☆☆☆

"تمہیں آنا پڑے گا میاں۔" اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آفندی مصر ہوا۔ نازلی کی کوٹھی سے وہ بمشکل گھر پہنچا تھا کہ ریحان آفندی کا فون آ گیا۔ وہ فلم کی کامیابی کی خوشی میں پارٹی ارینج کر رہا تھا۔ شبیر نے شرکت کے سلسلے میں معذرت کرنی چاہی تھی مگر آفندی کا اصرار جاری رہا اور اسے ماننے ہی بنی۔

"ٹھیک ہے بھیا...... میں آ جاؤں گا۔"

"ویسے انکار کی کوئی خاص وجہ تھی؟" آفندی متجسس ہوا۔

"نہیں......" وہ اصل بات سے پہلو تہی کر گیا۔ "بس ذرا صحت خراب تھی۔"

"اتنی نازک مزاجی بھی اچھی نہیں ہوتی میاں...... ذرا سی صحت کیا خراب ہوئی غریبوں کی پارٹی اٹینڈ کرنا بھی کارِ دارد بن گیا۔"

"درحقیقت ...... میں کسی وجہ سے آنا نہیں چاہ رہا تھا۔"

"تو وجہ ہی تو پوچھی ہے نا جناب سے"۔ آفندی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"بھیا پارٹی میں کچھ ایسے چہرے ہوں گے جو مجھے سخت ناپسند ہیں...... اس لیے ذرا بدمزگی سی ہوئی...... سوچا چلو پارٹی میں ہی نہ جاؤں۔"

"یار کون ہیں وہ بدبخت ......؟ حکم کرو انہیں بلاتے ہی نہیں ہیں۔"

شبیر نے ہنس کر کہا۔ "بس چھوڑو بھیا میں انہیں برداشت کر لوں گا...... بلکہ انہیں بھی تو کوفت ہو گی نا میری موجودگی میں۔"

"گڈ...... اور یاد رکھنا شوبز کی دنیا میں بہت زیادہ منافقت پائی جاتی ہے۔ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر، لہجے میں جعلی مٹھاس سمو کر، بداخلاقی پر مکاری اور چاپلوسی کی ملمع کاری کر کے ٹائم گزارا جاتا ہے...... بہت سے ایسے کردار ہوتے ہیں جنہیں ہاتھ ملانے کو دل نہیں چاہتا مگر معانقہ کرنا پڑ جاتا ہے...... یہ ہنستے مسکراتے اور روشن چہرے صرف دیکھنے کی حد تک بارونق ہیں ورنہ

حقیقتاً یہ اتنے تاریک اور بے رونق ہیں کہ تیری سوچ سے بالاتر ہے۔"

"پہلے اگر کوئی شبہ تھا بھی سہی تو اب ختم ہو گیا ہے بھیا۔" شبیر پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

"اچھا چھوڑو اس فضول بحث کو..... یہ بتاؤ بھابی کو ساتھ لا رہے ہو کہ نہیں؟"

بانو کے ذکر پر شبیر کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ مگر اپنی حالت پر قابو پاتا ہوا وہ بظاہر مسکرا کر بولا۔

"پہلے کبھی آئی ہے بھیا؟ ..... کہ اب آئے گی؟ ...... اور اب تو یوں بھی ناممکن ہے کہ وہ چند دنوں کے لیے پنڈی گئی ہوئی ہے۔"

"اصل میں میری آخری پارٹی تھی تو سوچا بھابی بھی شرکت کرتی۔ بے شک نقاب اوڑھ کے آتی۔"

"آپ نے ڈرامہ ضرور بنوانا تھا۔" شبیر نے مسکرا کر کہا۔ "اور آخری پارٹی کی بات مجھے ہضم نہیں ہوئی؟"

"بس میاں!..... اب تھک گیا ہوں۔ عدنان اور کامران کا اصرار بھی شدت اختیار کر گیا ہے اور دونوں ہر حال میں ہم میاں بیوی کو امریکہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ سمعیہ کا شوہر بھی اب امریکہ میں سیٹل ہو گیا ہے تو ہم بوڑھے میاں بیوی کا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔"

عدنان و کامران ریحان کے بیٹے تھے جو امریکہ میں سیٹل تھے جبکہ سمعیہ اس کی بیٹی تھی چند ماہ پہلے ہی جس کا بیاہ ہوا تھا۔

"یعنی ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں؟" شبیر شکوہ کناں ہوا۔

"تمہیں اہمیت تو خیر بہت زیادہ ہے مگر اس طرف آپ اکیلے ہیں اور دوسری جانب تین ہیں۔ تو میاں چاہے گنا جائے، چاہے تولا جائے ہر صورت ان کا پلڑا بھاری پڑتا ہے۔"

"جی ہاں..... پھر وہ خون کے رشتے ہیں اور میں منہ بولا..... تو فرق تو ہوگا نا؟" شبیر خواہ مخواہ قنوطیت کا شکار ہو رہا تھا۔

"بات خون یا احساس کے رشتے کی نہیں ہے شبیر۔" آفندی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا..... "اگر تم میرے سگے بھائی بھی ہوتے تب بھی بیٹوں کا حق زیادہ تسلیم کیا جاتا ہے۔"

"مذاق کر رہا تھا بھیا"۔ شبیر جلدی سے بولا۔

"ورنہ میں خوب جانتا ہوں اولاد والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔"

"تھینکس گاڈ....." آفندی نے سکھ بھرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

جواباً شبیر نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اگرچہ اداکار نہیں..... ڈرامے لکھتا تو ہوں......"

اور ریحان آفندی کی ہنسی بھی اس کی ہنسی کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کافی شاندار پارٹی کا اہتمام کیا تھا آفندی نے۔ ایمان کو خوب پذیرائی ملی تھی۔ وہ سارا ٹائم اپنی فلم کے ہیرو کے ساتھ جڑی لوگوں سے داد وصول کرتی رہی۔ فلم کا ہیرو ایک بار شبیر کے قریب آیا تو اس وقت بھی وہ اس کے قریب ہی رہی۔

"سر جی!..... اتنے اچھے مکالمے اور اتنی شاندار اور یونیک کہانی لکھنے کا شکریہ۔" شبیر سے بڑے تپاک مصافحہ کرتے ہوئے اس نے لہجے میں اخلاص سمونے کی کوشش کی تھی جو بہرحال اتنی ناکام نہیں ہوئی تھی۔

"یہ تم لوگوں کی اپنی محنت بھی تھی مسٹر فیروز"۔ شبیر نے شائستہ انداز میں جواب دیا۔ اس دوران نہ تو ایمان اس سے مخاطب ہوئی اور نہ ہی شبیر نے کوئی ایسی کوشش کی تھی۔ اس کے تاثرات سے صبح کی گفتگو کا کوئی

پتہ نہیں چل رہا تھا۔

نازلی اور شگفتہ بھی پارٹی میں موجود تھیں۔ شہیر سے مکمل بے نیازی اپنائے ہوئے شہیر کی عادت یوں بھی سب سے الگ تھلگ بیٹھنے کی تھی مگر پچھلے چند ماہ سے وہ اور ایمان ہر پارٹی میں اکٹھے نظر آتے تھے آج انہیں علیحدہ دیکھ کر کچھ لوگوں کو حیرت ہوئی تھی اور ان کچھ میں آفندی بھی شامل تھا۔ باقی تو شہیر سے دریافت کرنے کی جرأت نہ کر سکے مگر آفندی خود کو نہ روک پایا، ڈنر شروع ہوا تو شہیر بریانی کی پلیٹ لے کر پیچھے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اُسے گھوم پھر کر کھانا پینا پسند نہیں تھا۔ آفندی بھی اس تائم اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا وجہ ہے لڑائی کی؟" بغیر کسی تمہید اور وضاحت کے اس نے براہ راست سوال داغا آواز البتہ اتنی پست رکھی تھی کہ کوئی تیسرا نہ سن پاتا۔

مرغی کی ٹانگ سے زور آزمائی کرتے ہوئے شہیر نے اس موضوع سے پہلو تہی کا سوچا مگر پھر سوال کرنے والی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسے ارادہ بدلنا پڑا۔

"اب وہ مشہور ہو چکی ہے...... ایک سپر سٹار کے لیے میرا قرب شاید نقصان دہ ثابت ہوتا۔"

"مگر تم اس کے محسن ہو؟" آفندی کے انداز میں حیرانی کا تاثر موجود تھا۔

"ہونہہ...... محسن۔" شہیر کے ہونٹوں پر اذیت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "احسان کا بدلہ وہ ادا کر چکی ہے۔"

"میں تجھے دکھی دیکھ رہا ہوں میاں ...... غالباً ایمان صاحبہ کی بے نیازی کا اثر لیا ہے جناب نے۔"

"شاید"۔ شہیر نے حقیقت کو جھٹلانا مناسب نہ سمجھا۔

"تجھے شاید میری باتوں کی سمجھ نہیں آئی؟" آفندی کے لہجے سے درشتی جھلکی۔ "میں نے مفصل انداز میں بریف کر دیا تھا کہ تجھے کس قسم کے لوگوں سے پالا پڑ سکتا ہے۔ پھر کسی مطلبی، خود غرض کے رویے کو دل پر لینا سوائے بیوقوفی کے کیا ہے؟"

"بھیا! احساسات، نصیحت کے تابع نہیں ہوتے۔" شہیر صاف گوئی سے بولا۔ "وہ کیا بولتے ہیں دل پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔"

"جی کر رہا ہے تیرے کان کھینچوں...... بیوقوف نہ ہو تو۔" ایسی سختی اور درشتی کسی اپنے غم خوار کے لہجے میں ہی ہو سکتی تھی۔

شہیر شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ "بھیا مجھے نہیں آتی لوگ مکاری و خود غرضی کو معصومیت اور بھولپن کے لبادے میں کیسے لپیٹ لیتے ہیں؟ ...... ان کی کمینگی، گھٹیا اور بازاری پن، سراسر اپنائیت اور خلوص کا تاثر دیتا ہے۔ اور جب حقیقت کھلتی ہے تو پچھتاوؤں کی آگ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا۔"

"یاد ہے میں نے اس دن کیا کہا تھا......؟ کہ کسی کو اپنا سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔"

"جی بھیا...... اور آپ نے جس بات سے منع کیا تھا میں نے وہی کیا۔"

آفندی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"چلو آئندہ احتیاط کرنا۔"

"میں اسے چھوڑوں گا تو نہیں۔" شہیر نے ارادہ ظاہر کیا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرنے والے۔" آفندی یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "خبردار جو کوئی ایسی حرکت کی ...... یہ سپر اسٹاری چند دن کا کھیل ہوتی ہے۔ اسے اپنے حال پر چھوڑ دو اور تماشا دیکھو...... تیرا فن سدا بہار ہے اس کے پاس عارضی صورت ہے۔ اور یاد رکھنا اس قسم کی مطلبیوں کا انجام بہت بھیانک ہوا کرتا ہے۔"

"بھیا!...... میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا

اور نہ کسی کو دھوکہ ہی دیا...... پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟" ایسا کہتے وقت اسے معصوم مانو بھول گئی تھی۔

"شاید نادانستگی میں کسی کا دل دکھا دیا ہو میاں؟"
آفندی کی بات پر اچانک اس کے ذہن میں مانو کا افسردہ چہرہ ابھرا اور اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

اس وقت شہاب مرزا وہاں آنکلا۔
"کیا ٹپس دے رہے ہو شبیر صاحب کو بھی؟...... کچھ ادھر بھی نظر کرم ہو جائے۔"

"آئیں شہاب صاحب بیٹھیں۔" آفندی نے اسے بیٹھنے کی دعوت دی۔ "ہم بس نارمل گپ شپ کر رہے تھے...... اور شبیر میاں کو میری ٹپس کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ یہ خود اپنے کام کے ماہر ہیں۔"

"تو ہمیں مستفید فرمائیں ناں اپنے تجربات سے...... ہم تو ماہر نہیں ہیں نا۔" شہاب مرزا قہقہہ لگا کر بولا۔

"کسر نفسی ہے آپ کی...... ورنہ اب تک میں خود جناب سے رہنمائی لیتا رہا ہوں۔"

ریحان آفندی ترکی بہ ترکی بولا وہ تینوں ہنس پڑے۔ اسی وقت چند پروڈیوسر اور ہدایت کار ٹائپ بندے آگئے اور شبیر نے وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔

پارٹی کے اختتام پر آفندی نے اسے جانے کی اجازت نہیں دی تھی...... سب کے جانے کے بعد وہ اسے کافی دیر سمجھاتا رہا۔ آخر میں وہ اسے کہہ رہا تھا......

"یاد رکھنا میاں، اپنے جذبات ہمیشہ قابو میں رکھنا...... اور نادانستگی میں کسی کا آلہ کار نہ بن جانا اس فیلڈ میں شہرت حاصل کرنے کے لیے اپنی بدنامی آسانی سے گوارا کرلی جاتی ہے۔ بلکہ ہیروئنیں جان بوجھ کر ایسی حرکت کرتی ہیں کہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔

بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟

دور کیوں جائیں ہماری ایک واجبی سی اداکارہ جس کے کیریئر پر نہ تو کوئی خاص فلم ہے اور نہ وہ صورت کے لحاظ ہی سے کوئی ملکہ حسن ہے اور اداکاری کے میدان میں بھی گئی گزری ہے اس کے باوجود ملک کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہے۔ اور وجہ یہی ہے کہ پڑوسی ملک جا کر اس نے اپنی عزت اور حیا کا تو جو جنازہ نکالا ہے اسے چھوڑو۔ اپنے وطن کی حرمت اور آن تک داغدار کرنے کی کوشش کی...... صرف سستی شہرت حاصل کرنے اور میڈیا کا موضوع بنے رہنے کے لیے یعنی پہلے تو اپنی حیا سوز تصویریں رسالے کے سرورق کے لیے کھنچوائیں...... اور رسالے کی اشاعت کے بعد اس پر مقدمہ کر کے لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی...... اور یہ ایک نہیں اس قسم کے کرداروں سے یہ فیلڈ بھری پڑی ہے۔ کسی نے حیا سوز تصاویر کھنچوا کر لوگوں کی توجہ حاصل کی تو کوئی خود کو اغواہ کرا کے میڈیا کا موضوع بنی اور کسی نے کسی مشہور شخصیت کے ساتھ اپنے غلط تعلقات کو ہوا دے کر شہرت حاصل کی...... اس لیے میری جان جو قدم اٹھانا خوب سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کے اٹھانا۔"

"میں آپ کے احکامات مد نظر رکھوں گا بھیا۔"
شبیر کو آفندی اپنے سگے بھائی کی طرح ہی دکھائی دے رہا تھا۔

"او کے!...... اب رات کافی گزر چکی ہے گھر جا کر آرام کرو۔ شاید کوئی تمہارا منتظر ہو۔"

"بھیا بتایا ہے میری بیوی پنڈی میں ہے۔"
"سوری...... خیال نہیں رہا تھا۔" آفندی نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "پھر یہیں میرے پاس جھٹ آرام کرلو...... یوں بھی رات دو تین گھنٹوں کی مہمان ہے۔"

"نہیں میں چلوں گا......" شہیر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر آنٹی سے الوداعی مصافحہ کر کے باہر نکل آیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ گھر میں تھا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے نازلی کی استہزائی گفتگو اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی۔ ایمان کا بیگانہ رویہ رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ اسے شدت سے کسی ایسے غمگسار کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے کندھے سے لگ کر وہ اپنے زخمی احساسات اور لہولہان جذبوں کا مداوا کرتا کوئی ایسا جو اس کا بالکل اپنا ہوتا۔ جو اس کے جذباتی استحصال کی چارہ جوئی کرتا گو آنٹی کی نصیحتیں اور مشورے اس کے لیے مشعل راہ تھے مگر وہ شہیر کو سرپرست سا لگتا تھا۔ اس سے تو شہیر نے مانو کے روٹھنے کی بات بھی چھپائی ہوئی تھی۔ اور پھر شہیر کو جو غم تھا اس کا مداوا کوئی عورت ہی کرسکتی تھی، کوئی ایسی عورت جس کے دل میں شہیر کی محبت موجزن ہوتی اور ایسی اس دنیا میں صرف ایک تھی جسے وہ ناراض کر چکا تھا۔ اس وقت اسے اپنا رویہ یاد آیا...... ایک بازاری عورت کی خاطر اس نے مانو پر کتنا ظلم ڈھایا تھا...... ایک شوہر پرست عورت کے لیے اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا تھا کہ اس کا شوہر اپنے گھر میں غیر عورت کے ساتھ کمرے میں بند ہو...... ایسی غیر عورت جس کا مطمع نظر ہی اس کی بیوی کو نیچا دکھانا ہو...... شہیر کو لگا اس نے مانو کو ناقابل تلافی دکھ سے ہمکنار کیا تھا...... ایسا دکھ جس کا مداوا ناممکن ہو...... ایسا درد جو لاعلاج ہو...... ایسی کسک جس کے نقوش اَن مٹ ہوں۔

"کاش ...... ہوس نے میری آنکھوں پر پٹی نہ باندھی ہوتی۔" اس کے دل سے آہ نکلی اور اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوتے چلے گئے۔ اپنے غم اور دکھ کو بھول کر وہ مانو کے درد کو محسوس کر کے تڑپنے لگا۔

"اچھا بتاؤ نا......؟ اگر بہت سی دولت اور شہرت مل جائے اور مجھ سے بھی خوبصورت لڑکیاں تجھے میسر آ جائیں تو کیا مجھے چھوڑ دو گے؟" اس کے ذہن میں مانو کا سوال گونجا...... جواباً اس نے بڑی سختی سے مانو کے اندیشے کو جھٹلایا تھا۔ مگر وقت آنے پر اسے سارے وعدے بھول گئے تھے۔ اسے یاد آیا مانو نے کہا تھا۔

"تمہاری ساری ضرورتوں کا خیال رکھوں گی...... بس تم میری جگہ کسی دوسری عورت کو نہ دینا۔ کبھی مجھے نظر انداز نہ کرنا۔ کسی عورت کو مجھ پر ترجیح نہ دینا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ درکار نہیں۔" اور اس نے وعدہ کر کے وقت آنے پر اس کے الٹ کیا تھا۔

"مانو......" اس کے لبوں سے کراہنے کے انداز میں نکلا اور وہ خیالوں ہی خیالوں میں اس سے گفتگو کرنے لگا۔

تو نے عہد نبھایا پورا میں وعدوں کا کچا نکلا

"ہاں مانو میں تیری نظروں سے گر چکا ہوں...... اس قابل ہوں کہ مجھ سے نفرت کی جائے مجھے دھتکارا جائے۔ میری محبت جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوئی۔ سارے دعوے ریت کے گھروندے ثابت ہوئے۔ میرے وعدے کبھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکے۔ مانو میں تیری نفرت اور باز پرس کے لائق بھی نہیں ہوں۔" وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ اس اعلیٰ ظرف لڑکی نے اس سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ ایسا ظلم کیوں کر رہا ہے۔ اور پھر وہ پچھلے سال بھر سے اس سے غافل تھا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ آیا مانو نے کسی بچے کو جنم دیا تھا یا بچی کو...... کیونکہ جن دنوں وہ روٹھ کر گئی تھی وہ امید سے تھی لیکن ایمان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے اس سے اتنا بھی نہ ہوسکا تھا کہ اپنے ہونے والے بچے کی ہی سن گن لے لیتا۔ اچانک اسے لگا کہ غم کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اور پچھتاوے کی آگ، لاوے کا روپ دھار چکی ہے اس عالم میں کسی ایسے غمگسار کی

طلب مزید بڑھ گئی جس کے سامنے وہ جی کا بوجھ ہلکا کر سکتا...... شکیل جیسے دوست کو بھی وہ کھو چکا تھا۔

"شاید میری چاہت کر اسے ترس آجائے۔" اس نے موبائل نکال کر اسے کال کرنے کا سوچا مگر پھر اسے نمبر ڈائل کرنے کا حوصلہ نہ ہوا...... اس کی خودداری اور انا کسی کے سامنے جھکنے پر تیار نہ تھی۔ اگر شکیل اس کی کال ریسیو نہ کرتا یا اٹینڈ کر کے طنز و تشنیع سے اس کا کیا یاد دلاتا تو شاید وہ یہ توہین برداشت نہ کر پاتا۔

اس سے لیٹا نہ گیا اور وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ کھڑکی کے پردے کے ساتھ سلی چوڑیوں کے سیٹ پر پڑی۔ وہ قریب ہو کر دیکھنے لگا...... ملازمہ نے ایک دفعہ انہیں ہٹانے کی بابت پوچھا تھا مگر شہیر نے سختی سے منع کر دیا تھا...... کیوں ......؟ اس بات سے وہ اس وقت خود بھی ناواقف تھا۔ مگر اب اس کیوں کا جواب اسے مل گیا تھا کہ مالو کی محبت شروع دن سے اس کے دل میں بسی تھی...... وقتی طور پر بھٹکنے کے باوجود وہ اسے اسی شدت سے چاہتا تھا دل میں نہاں چاہت اس وقت ظاہر ہوئی جب وہ اس کی دسترس سے دور ہو گئی تھی۔ جب تک مالو کا حصول اسے مشکل نظر آتا رہا وہ اس کی چاہت میں دن رات سلگتا رہا مگر جب وہ حاصل ہو گئی تو وہ اس کی قدر نہ کر سکا...... شوبز کی آوارہ اور آزاد خیال لڑکیاں صرف اپنے مقصد کی خاطر اس کے قریب ہوتی تھیں اور وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ کسی منفرد شخصیت کا مالک ہے۔ اس قابل ہے کہ اسے چاہا جائے۔ اور اس کی یہ غلط فہمی نازلی، شگفتہ اور ایمان نے بڑی آسانی سے رفع کر دی تھی۔

سٹڈی روم سے باہر نکل کر وہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہیں بیٹھ کر اس کی مالو اسے تکا کرتی تھی۔ وہ مالو جواب اس کی نہیں رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ اس نے وہاں کشن پڑے دیکھا تھا۔ وہ اُسے کشن پر بیٹھ کر ہی دیکھا کرتی تھی اور یقیناً اس دن اسے کشن اٹھانا یاد نہیں رہا تھا۔ مگر شہیر کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ وہ کشن وہاں کیوں پڑا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید صوفے وغیرہ جھاڑتے ہوئے مالو نے وہاں رکھا ہوگا۔

صبح کی اذانوں کی آواز کانوں میں پڑتے ہی اس کے قدم باتھ روم کی جانب اُٹھ گئے۔ جانے کتنے عرصے سے وہ نمازیں پڑھنا ترک کر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دل میں ندامت کا بوجھ لیے مسجد کی طرف گامزن تھا۔ انسان جتنا بھی گناہ گار ہو آخری آسرا تو وہی ہے۔ اور انسان چاہے بھی اس کے علاوہ کوئی ایسا در نہیں ڈھونڈ سکتا جہاں اس کے دکھوں کا مداوا ہو سکے۔ مسجد سے واپس آ کر اس نے دوبارہ سونے کی کوشش کی اور اس بار وہ کامیاب رہا تھا۔

☆☆☆

پچھلے چند دن سے اس کی طبیعت لکھنے کی طرف مائل نہیں ہو رہی تھی۔ قلم پکڑتے ہی مالو کی یادیں امڈ پڑتیں۔ اور وہ قلم رکھ کر پردے سے سلی چوڑیوں کو گھورتا رہتا۔ گھر سے نکلنا قریباً اس نے چھوڑ دیا تھا۔ بس مسجد تک جاتا اور نماز پڑھ کر واپس آ جاتا۔ ریحان آفندی امریکہ جا چکا تھا۔ اس کا جی لاہور سے اچاٹ ہو گیا اور وہ مستقل پنڈی شفٹ ہونے کا سوچنے لگا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پنڈی جا کر وہ کیا کاروبار کرتا سکول کی نوکری اس نے چھوڑ دی تھی اور لکھنے پڑھنے کے علاوہ وہ کچھ جانتا نہیں تھا آخر کیا کرتا وہاں جا کر ...... پھر مالو کے روٹھنے کے بعد وہ بمشکل چند مرتبہ گھر جا سکا تھا۔ ماں، باپ کا خفگی بھرا رویہ اسے نادم کر دیتا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس سے مالو کی بابت دریافت نہیں کیا تھا۔ مگر شہیر بچہ تو نہیں تھا کہ ان کے احساسات سے انجان ہوتا...... اس کے والد ماسٹر سلیم کو تو رسمی علیک سلیک کے علاوہ اس سے بات چیت گوارہ ہی نہیں تھی...... دونوں

بچے بھی اس سے مانوس نہیں تھے۔ لے دے کے ایک ماں ہی تھی جو اس کی ضرورتوں کا بھی خیال کرتی اور جھٹ بیٹھ کر اس سے بات بھی کر لیتی ...... گھر بھی وہ اپنے کمرے تک محدود رہتا اور اگلے دن واپس چل پڑتا۔

اس دن اسے بیڈ روم کی صفائی سوجھی اور وہ جھاڑو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ مانو کے جانے کے بعد اس نے بیڈ روم کو مستقل لاک کر دیا تھا۔ اپنے اس وقت پہنے ہوئے کپڑے اور جیولری مانو اسی طرح بیڈ پر پھینک گئی تھی۔ پہلے وہ ہر ہفتے اپنی نگرانی میں ملازمہ سے صفائی کراتا۔ بیڈ پر پڑی جیولری اور کپڑوں کو اس نے کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ ایمان نے دو تین مرتبہ بیڈ روم میں شفٹ ہونے کی ضد کی تھی مگر وہ ٹال گیا تھا۔

"کیوں؟"

اس کیوں کا جواب بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے "کیوں" تھے جنہیں کھوجنے میں وہ ناکام رہا تھا۔

وہ بمشکل صفائی سے فارغ ہوا تھا کہ موبائل بجنے لگا۔ شہاب مرزا کی کال آ رہی تھی۔

"جی مرزا صاحب!......" اس نے کال ریسیو کی۔

"شمیر صاحب!......کام کہاں تک پہنچا؟"

"فی الحال تو ہاتھ بھی نہیں لگا سکا ہوں مرزا صاحب۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"بھائی آپ کے مکالموں کا انتظار ہے......اور میرا ارادہ تو اس جمعہ سے شوٹنگ کی ابتدا کا تھا۔"

"اچھا ڈرامے کی ہیروئن کا چناؤ کر لیا ہے؟"

"بات فائنل تو نہیں کی مگر وہی ہو گی جسے آپ نے تلاش کیا تھا......شگفتہ علی۔"

"اور اگر میں کہوں کہ اسے مرکزی کردار نہ دیں تو......؟" شمیر کے اندر انتقامی جذبے نے سر ابھارا۔

"دیکھیں شمیر صاحب!......ہمارے تعلقات اس نہج کے تو نہیں کہ ہم ایک دوسرے کی بات کو نہ ٹال سکیں، مگر پھر بھی میں آپ کی بات نہیں ٹالوں گا۔ البتہ حیرانی ضرور ہے کہ وہ لڑکی جو خود آپ نے متعارف کرائی ہے اس کی راہ میں روڑے اٹکانا...... کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"شہاب صاحب!...... جو بات آپ کو تسلیم ہے وہ اسے نہیں ہے جس کے ساتھ یہ احسان کیا گیا ہے۔"

"تو نہ ہو......؟ آپ کا مقصد احسان جتلانا تو نہیں تھا ناں؟......اور بالفرض وہ کسی گستاخی کی مرتکب ہو چکی ہے تو تعلقات منقطع کرنا ہی کافی رہے گا خواہ مخواہ مقابلے میں آپ کی شہرت اور نیک نامی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"شہاب صاحب!......میری بس اتنی کوشش ہو گی کہ میرے لکھے مکالمے اس کی زبان سے ادا نہ ہوں۔" شمیر کے لہجے میں نامعلوم سی ترشی تھی۔

"تو بھئی فلم یا ڈرامہ بنانے والے آپ سے پوچھ کر تو کاسٹ تشکیل دینے سے رہے۔" شہاب مرزا اسے سمجھانے لگا۔

"جو مجھ سے ڈرامہ یا فلم لکھوانے کا متمنی ہو گا اسے کم از کم اتنی بات ماننی پڑے گی کہ کاسٹ میں شگفتہ یا اس کی بہنیں شامل نہ ہوں۔" شمیر اپنی بات پر اڑ گیا تھا۔

"تو لکھاریوں کا کوئی کال تو نہیں ہے؟" شہاب مرزا الجھا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے؟" شمیر کو اس کی ہنسی ناگوار گزری تھی۔

"یعنی......اگر میں مُصر رہتا کہ شگفتہ کاسٹ میں شامل رہے گی تو آپ مکالمہ نہ لکھتے؟" شہاب مرزا کو بھی

شہیر کا بدلا ہوا لہجہ کھل گیا۔

"لاریب......" شہیر ہٹ دھرمی سے بولا۔

"جواب دیتے ہوئے تعلقات ہی کا کچھ بھرم رکھ لیتے؟" شہاب مرزا کو اس کے جواب پر دکھ ہوا تھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے کہا کہ ہمارے تعلقات اس نہج کے نہیں کہ ایک دوسرے کی بات نہ ٹال سکیں۔" شہیر نے اس کا کہا لوٹایا۔

"مگر ساتھ یہ بھی تو کہا تھا کہ آپ کی بات نہیں ٹالوں گا۔" شہاب مرزا نے صفائی پیش کی۔

"شہاب صاحب!...... معافی چاہوں گا...... مگر حقیقت یہی ہے۔" شہیر اپنے کہے سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

"مسٹر شہیر......! شگفتہ نہ تو اس ڈرامے کے لیے ناگزیر تھی اور نہ میں نے اسے آفر ہی کی تھی...... بلکہ آپ کے کہنے پر میں ڈرامے کے لیے اسے سائن کرنے کا ارادہ ترک کرنے والا تھا۔ لیکن آپ نے جس طرح اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لیا...... مجھے اچھا نہیں لگا۔ عزت نفس میں بھی رکھتا ہوں...... کسی کا خشک لہجہ اور دو ٹوک رویہ مجھے بھی برا لگتا ہے۔"

"میں کسی کو غلط فہمی میں رکھنے کا قائل نہیں۔" شہیر اس کے شکوے کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔

"اوکے مسٹر شہیر......! میں آپ کا لکھا ڈرامہ واپس بھجوائے دیتا ہوں...... معاوضے کی ادائیگی یوں بھی مکالمے کی تکمیل پر ہوتی تھی...... اور سوری...... آئندہ آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔" شہاب مرزا کے لہجے سے سخت خفگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تھینکس" ۔ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ گو شہاب مرزا سے اس کے تعلقات کافی اچھی نوعیت کے تھے۔ مگر اس وقت بات کا رخ کوئی ایسی سمت اختیار کر گیا کہ وہ ہٹ دھرمی پر اتر آیا تھا نہ اس نے پرانے تعلقات خاطر میں لائے اور نہ اپنے سود و زیاں کا سوچا۔ اور پھر اس وقت اس کی ضد نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ اس نے شہاب مرزا کی کال منقطع کرتے ہی فصیح عالم کا نمبر ملا لیا۔

"جی شہیر صاحب؟" کال اٹینڈ کرتے ہوئے اس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔ "غالباً آپ نے بقیہ نصف مکالمے مکمل کر دیے ہیں۔"

"وہ تو ہو ہی جائیں گے فصیح صاحب...... اس وقت تو ایک بات پوچھنی تھی۔"

"جی ضرور؟"

"فلم میں مرکزی کردار کون ادا کر رہا ہے؟"

"فیروز۔" فصیح عالم کے لہجے میں ہلکی سی حیرانی تھی۔

"نہیں...... میرا مطلب ہیروئن کون ہے؟"

"ایمان علی......" فصیح نے اسی انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

جواب گول کرتے ہوئے شہیر نے پوچھا۔ "فلم کی شوٹنگ شروع تو نہیں ہوئی؟"

"فی الحال تو نہیں ہوئی...... بس چند دن میں ہوا چاہتی ہے۔"

"تو ایسا ہے فصیح صاحب کہ میں کچھ خاص وجوہات کی بنا پر مکالمے نہیں لکھ سکوں گا۔ آپ مہربانی فرما کر میرے لکھے ہوئے مکالمے واپس بھیج دیں...... اور اگر مکالموں کے بغیر فلم کی کہانی ناقابل قبول ہو تو وہ بھی واپس کر دیں...... معاوضہ آپ کو واپس مل جائے گا۔"

"خدا خیر کرے شہیر صاحب! بڑا اکھڑا اکھڑا سا لہجہ ہے...... اور کون سی خاص وجہ ہو گی مکالمے نہ لکھنے کی؟"

"شاید جواب دینا مجھے پسند نہ ہو؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں ترشی کا اثر شامل ہو گیا تھا۔

"اوہو بھئی...... کچھ پتہ تو چلے؟" فصیح نے حیرانی سے پوچھا۔ "کون سی خطا ہو گئی ہم سے؟"

"وجہ جاننا ضروری ہے کیا؟" شہیر ایمان علی سے اپنی دشمنی صیغہ راز میں ہی رکھنا چاہتا تھا۔

"ہاں...... کیونکہ اس کے بعد ہی ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔"

"ایمان علی...... اس کی وجہ ایمان علی ہے۔ جس فلم میں یہ محترمہ جلوہ گر ہوں گی اس کے مکالمے کم از کم میں نہیں لکھ سکتا۔" شہیر نے حقیقت پھوٹ دی۔

"عجیب بات ہے...... ایمان سے دشمنی کا بدلہ ہم سے لے رہے ہو......؟ آپس کی دشمنی میں ہمیں تو نہ گھسیٹو یار۔"

"فصیح صاحب!...... آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے اس کے علاوہ اداکاراؤں کا ملنا مشکل ہو۔ اس سے کئی گنا اچھی، خوبصورت اور طرح دار لڑکیوں سے فلمی صنعت بھری پڑی ہے۔"

"شاید یہی بات وہ رائٹر کے متعلق کہے۔" فصیح نے لگی لپٹی رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"صحیح کہا...... وہ کہنے کا حق رکھتی ہے...... اور اسی وجہ سے میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ آپ کسی دوسرے مصنف سے رجوع کریں۔" ...... شہیر اس صاف گوئی کا برا منائے بغیر بولا۔

"دیکھیں شہیر صاحب!...... آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ شوٹنگ کی ساری تیاریاں مکمل ہیں یوں آخری وقت میں آپ کا انکار بڑی بدشگونی ہے۔"

"فصیح صاحب......! فلم میں کسی اداکار یا اداکارہ سے کیا ہوا معاہدہ منسوخ کرنا کوئی نئی بات نہیں۔"

"ہاں...... مگر کوئی وجہ بھی تو ہو معاہدے کی منسوخی کی۔"

"اگر میرا انکار کوئی وجہ نہیں ہے تو بصد شوق آپ دوسرا مصنف تلاش کر لیں۔"

"ٹھیک ہے محترم......! پھر فلم بھی وہی لکھ لے گا۔" فصیح نے جھلا کر کہا۔

"جائز بات ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "فلم کا مسودہ واپس بھجوا دیں...... میں وصول شدہ معاوضے کا چیک مسودہ لانے والے کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔"

اور شہیر کی بات ختم ہوتے ہی فصیح عالم نے بغیر کسی الوداعی کلمے کے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

فصیح عالم سے بات ہوئے دو تین دن گزر گئے تھے لیکن اس نے نہ تو فلم کا مسودہ واپس بھیجا تھا اور نہ رقم ہی کی واپسی کا کچھ مطالبہ کیا تھا۔ عجیب بے کیف اور بے مزہ دن گزر رہے تھے۔ لگتا تھا زندگی کی رونقیں ہی ختم ہو گئی ہوں۔ مانو کی یاد نے الگ محاذ کھولا ہوا تھا۔ جہاں اس سے علیحدگی کے تصور سے سانسیں رکنے لگتیں وہیں منانے کے خیال سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی۔ آخر وہ کیا منہ لے کے جاتا ماسٹر احمد سعید کے پاس...... اس کی ساس عائشہ خاتون بہت نیک، نرم خو اور درگزر کرنے والی عورت تھیں مگر شہیر کا جرم بھی تو ایسا گھٹیا تھا کہ وہ اس کا سامنا نہ کر پاتا۔ سب سے بڑھ کر مانو کی ذات کا مسئلہ تھا۔ کیا وہ اس کے سلوک کو معاف کر پاتی...... بھلے والدین کی منشا پر وہ اس کے ساتھ آ جاتی مگر ریزہ ریزہ اور بکھری مانو کو وہ کیسے سمیٹتا۔ اس کی شخصیت اور کردار مانو کے سامنے مسخ شدہ اور کریہہ انداز میں کھل چکا تھا اب پہلے والی محبت اور چاہت فقط قصہ پارینہ تھی۔ اس نے مانو کی محبت کا جس طرح حشر کیا تھا وہ تصور ہی سے ماوراء تھا۔ ایک غیر عورت کو اپنے مقابل پا کر اس نے شہیر کے قدموں میں جھکنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کے پسندیدہ لباس میں سج دھج کر اسے اپنی بے لوث چاہت اور مدام رفاقت کا یقین دلانے کے لیے وہ کتنی

حسرت، امید اور تمنا سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ مگر اس نے نفسانی خواہشات کا پلو تھام کے اس کا غرور و فخر خاک میں ملا دیا تھا۔ ایک بازاری عورت سے ہار وہ کیسے برداشت کر پاتی۔ یہ بات اسے اور زیادہ دکھی اور غمگین کر دیتی کہ ایمان اس کے موبائل سے ماڈو کو چیلنج کر چکی تھی۔ گو اس بات کا ایمان نے بہت بعد میں اعتراف کیا تھا اور طرفہ تماشا یہ کہ اس کے بعد بھی وہ ایمان سے تعلقات منقطع نہ کر سکا تھا۔

انہی بیہم سوچوں میں وہ راتوں کی نیند اور دن کا آرام کھو بیٹھا تھا۔ رائٹنگ سے بھی اس کا دل اچاٹ رہنے لگا تھا۔ کوئی دوست، غم خوار ایسا نظر نہیں آ رہا تھا جسے وہ دل کا حال کہہ پاتا۔

ملازمہ کھانے کا پوچھنے آئی، تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بس چائے لے آؤ۔'' اور وہ ''جی صاحب'' کہتے واپس مڑ گئی۔

ملازمہ کے چائے لانے سے پہلے چوکیدار نے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔

''ڈرائنگ میں بھیج دو۔'' کہتے ہوئے اس نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

''السلام علیکم۔'' کہہ کر اندر داخل ہونے والے دونوں آدمی اس کے صورت آشنا تھے۔ ان میں ایک فصیح عالم کا سیکرٹری اور رفیع عالم کا سیکرٹری تھا۔

رفیع عالم کے سیکرٹری کو دیکھ کر شہیر کو اچنبھا ہوا مگر وہ حیرانی ظاہر کیے بغیر ان کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''آئیں جناب۔'' اس نے فرداً فرداً دونوں سے مصافحہ کر کے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تھینکس'' کہتے ہوئے دونوں بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے شہیر نے ملازمہ کو بلا کر ان کے لیے بھی چائے کا بتایا پھر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''شہیر صاحب!...... ہم مسودے لے کر حاضر ہوئے تھے۔'' فصیح عالم کے سیکرٹری رفیق نے گفتگو کی ابتداء کی۔

''مسودے......؟ کہ مسودہ؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''وہ جی...... میں بھی فلم کا مسودہ اور مکالمے لایا تھا۔'' رفیع عالم کے سیکرٹری اسد خان نے اس کی حیرانی دور کرتے ہوئے کہا۔ ''رفیع صاحب کہہ رہے تھے کہ انہوں نے بھی ایمان علی ہی کو سائن کیا ہوا ہے اور آپ چونکہ کسی ایسی فلم کے مکالمے لکھنے کے لیے راضی نہیں جس میں وہ پرفارم کر رہی ہو تو اس نے مناسب سمجھا کہ آپ کی سٹوری اور مکالمے واپس کر دیے جائیں۔''

رفیع عالم، فصیح عالم کا سگا بھائی تھا۔ الگ الگ فلم کمپنیوں کے مالک ہونے کے باوجود رفیع نے بھائی کے کہنے پر شہیر کی لکھی فلم کا مسودہ واپس کر کے گویا اس کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا۔ رفیع عالم کے لیے اس نے کہانی اور مکالمے مکمل کر کے بھجوائے ہوئے تھے اور اس سے معاوضہ بھی وصول کیا ہوا تھا اس وجہ سے وہ ایمان کے فلم میں کام کرنے کی بابت پوچھنے پر اس نے گریز کیا تھا۔ لیکن اس کی جانب سے پہل نے شہیر کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے وہ نارمل لہجے میں بولا۔

''رفیع عالم صاحب کا شکریہ ادا کر دینا...... اور کہنا ان کا یہ احسان یاد رہے گا۔'' اس وقت ملازمہ چائے اور لوازمات کی ٹرے کے ساتھ پہنچ گئی۔

چائے رکھنے کے بعد شہیر نے اسے چیک بک لانے کا کہا۔

چائے پی کر اس نے دو چیک مطلوبہ رقم کے کاٹ کر ان کے حوالے کیے اور فلم کی کہانی اور مکالمے کے

مسودے ان سے وصول کرلے۔

☆☆☆

یکم پر وہ گھر میں خرچے کی رقم بھی نہ بھیج سکا کہ اس کے اکاؤنٹ میں واجبی سی رقم ہی بچا رہ گئی تھی۔ اپنی بچت وہ ایمان کی شاپنگ اور ناز برداریوں پر اڑا چکا تھا۔ اور اس سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ کچھ لکھ ہی نہیں سکا تھا۔ جو لکھا تھا وہ انتقامی کارروائی کی نذر ہو گیا تھا۔ معذرتی فون پر اس کے والد نے فقط یہ کہا تھا کہ "کوئی بات نہیں بیٹا...... ہمارا گزارا اچھا چل رہا ہے۔" اس سے اگلا ماہ بھی خالی گزرا...... اپنی عادت کے برخلاف اس نے دو تین فلمسازوں سے بات کی، کچھ ڈرامہ نگاروں سے بھی رابطہ کیا مگر فصیح عالم اور شہاب مرزا نے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے اس کے خلاف باقاعدہ محاذ کھول رکھا تھا شاید اس کی انتقامی کارروائی کی بات نازلی سسٹرز تک بھی پہنچی تھی کہ وہ بھی اس کے خلاف سرگرم عمل ہو گئی تھیں۔ ایک دو چھوٹے فلمسازوں نے فلم کے مسودے میں دلچسپی ظاہر کی مگر انہوں نے جس معاوضے کی پیش کش کی وہ نہ ہونے کے برابر تھا اگلی یکم پر اس نے آخری جمع پونجی سے کار میں چند لیٹر پٹرول ڈلوایا اور ایک شوروم میں پہنچ گیا۔ کار بیچ کر اس نے آدھی رقم والد کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی بقیہ رقم سے اُس نے ایک نئی بائیک خریدی۔ گھر پہنچ کر اس نے چوکیدار اور ملازمہ کو تنخواہ اور تھوڑی سی اضافی رقم دے کر فارغ کر دیا کہ اب وہ ملازم افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

مزید ایک مہینے کی مسلسل ناکام کوششوں کے بعد جب وہ بالکل مایوس ہو چلا تھا کہ ایک نئے فلمساز نے از خود اس سے رابطہ کیا۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی کرن کا نظر آنا اُسے خوش کر گیا۔ اگلے دن وہ اس کے دفتر میں تھا۔ رسمی مصافحے کے بعد وہ صوفہ سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"پلیز بیٹھیں شہیر صاحب!......" وہ قریباً شہیر کا ہم عمر ہی تھا۔ فہیم نام کا وہ جواں سال فلمساز اپنے کیریئر کی پہلی فلم بنانے جا رہا تھا۔

شہیر "ٹھیک" کہہ کر بیٹھ گیا۔

"فلم کا مسودہ لائے ہیں؟"

اس کے پوچھنے پر شہیر نے ہینڈ بیگ سے فلم کا مسودہ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ مسودہ لے کر وہ اس پر سرسری نظر دوڑانے لگا۔

"شہیر صاحب!...... واقعی آپ بہت اچھا لکھتے ہیں...... بہرحال معاوضہ طے کر لیا جائے۔"

"بالکل...... آپ بتائیں؟" شہیر پچھلے دو تین ماہ سے کافی تنگ ہو رہا تھا۔ اس میں پہلے والا اعتماد مفقود ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے فہیم کو ہی معاوضہ طے کرنے کی دعوت دی۔

"نہیں صاحب!...... میرے لیے یہ طے کرنا اس لیے بھی مشکل ہے کہ میری پہلی فلم ہے جبکہ آپ کا آئے روز کا کام ہے...... بس جو دوسروں سے لیتے ہیں وہ مجھے بھی بتا دیں۔"

ایک لمحہ سوچ کر شہیر نے اپنا معاوضہ بتا دیا۔ اور پھر فہیم کے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ مگر یہ اطمینان اس وقت ہوا بن کر اڑ گیا جب دروازہ کھول کر ایمان علی داخل ہوئی۔

"تمہاری میٹنگ ختم بھی ہوئی کہ نہیں۔" وہ فہیم سے جس انداز میں مخاطب ہوئی تھی وہ ان کے درمیان گہری بے تکلفی کو ظاہر کر رہا تھا۔

"میں بس فارغ ہی ہوں جانی۔" فہیم مسرت سے بولا۔ "ایک سائن کرنے ہیں اور چلتے ہیں۔"

اسی وقت ایمان علی نے صوفے پہ بیٹھے شہیر کی طرف متوجہ ہوئی۔ حالانکہ وہ اندر داخل ہوتے ہی اسے دیکھ چکی تھی مگر اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسی وقت شہیر پر

اس کی نظر پڑی ہو۔ وہ شوخی سے بولی۔

"ہائے مسٹر شبیر!...... ہاؤ آر یو۔"

جواباً اس نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"ارے آپ تو غالباً پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں...... میں نے سوچا مجھے تعارف کرانا پڑے گا......" فہیم کے لہجے میں چھلکتی حیرانی کا مصنوعی پن شبیر کی باریک بیں نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔

"بہر حال پھر بھی روایت نبھاتے ہوئے کہے دیتا ہوں ...... شبیر صاحب! ان سے ملئے مس ایمان علی جو میری پہلی فلم کی ہیروئن ہیں۔" اس تعارف کے ساتھ ایک خصوصی درخواست بھی کروں گا کہ آپ فلم کی ہیروئن کے مکالموں پر نظرثانی فرما کر انہیں مزید جاندار بنائیں...... بس یوں کہ ہیروئن فلم میں چھائی نظر آئے۔"

شبیر نے ایمان علی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شبیر کے اندر کشمکش شروع ہوگئی...... اس کی انا اور خودداری ایک بہت بڑے امتحان کی زد میں تھی...... اس نے ہار جانے کا سوچا، شکست تسلیم کرنے میں اسے عافیت نظر آئی۔ دولت کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ ایمان علی اسے ٹھکرا کر پہلے بھی اس کی توہین کا باعث بنی تھی۔ "ایک توہین اور سہی۔ ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔ اور پھر یہ کوئی چوری نہیں...... ڈاکہ نہیں تھا کسی کے مال پر ناحق قبضہ نہیں تھا۔ کہتے ہیں کسی شہسوار کے رستے پر گہری کھائی آ جائے تو اسے عبور کرنے کے لیے وہ چند قدم پیچھے ہٹتا ہے تاکہ کھائی عبور کرنے کے لیے لمبی چھلانگ لگا سکے۔ وہ بھی اگر وقتی طور پر، کسی مصلحت کے تحت اپنے کہے سے ہٹ جاتا تو کیا مضائقہ تھا۔

اور پھر جانے کتنی دیر بعد اسے فہیم کی آواز سنائی دی۔

"شبیر صاحب!...... خیر تو ہے کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آیا۔

"فہیم صاحب!...... معذرت چاہوں گا...... میں یہ سودا منسوخ کرتا ہوں، شاید آپ کو حیرانی ہو...... لیکن جس فلم میں مس ایمان علی کام کریں گی وہ کم از کم میری لکھی ہوئی نہیں ہوگی۔" یہ بات کرتے ہوئے اسے لگا کہ ایک بہت بھاری بوجھ اس کے سر سے اتر گیا تھا...... اور اپنی نگاہوں میں گرنے سے بچ گیا تھا۔ شاید اس فلم کا معاوضہ ہمیشہ اس کے ضمیر پر بوجھ بنا رہتا۔ اور پھر اپنی بات کا اثر اسے ایمان کے چہرے پر نظر آیا اس کے ہونٹوں پر رقصاں ہنسی بھاپ کی طرح اڑ گئی تھی۔ چہرے کی شادابی جو مسکراہٹ اور خوشی کے مرہون منت تھی عجیب قسم کی کرختگی اور تلخی میں ڈھل گئی تھی۔

فہیم نے کہا...... "شبیر صاحب!...... ایمان سے اتنی دشمنی کی کوئی وجہ؟"

"آپ انجان بن رہے یا شاید میرے منہ سے سننے کے خواہاں ہیں۔" شبیر نے صوفے سے اٹھ کر اس کے سامنے سے فلم کا مسودہ اٹھایا اور ہینڈ بیگ میں ڈالنے لگا اس کا اعتماد لوٹ آیا تھا۔

"چلو ایسے ہی سمجھ لیں۔" فہیم شاید اس توہین کے احساس کو کم کرنا چاہ رہا تھا جو اسے شبیر کے اپنے سامنے سے مسودہ اٹھانے پر ہوئی تھی۔

"مس ایمان آپ کو بہتر طور پر بتا دیں گی...... خدا حافظ...... اور ہاں چائے واقعی کمال بنی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے استہزائی نگاہ ایمان علی پر ڈالی اور لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے جانے لگا۔

"شبیر صاحب!......" فہیم نے اسے آواز دی وہ رک کر پیچھے دیکھنے لگا۔

"گو آپ کا انداز بہت توہین آمیز ہے...... مگر پھر بھی میں وجہ آپ کے منہ سے سننے کا خواہش مند ہوں۔"

"میری وائف کا اصرار ...... بلکہ حکم سمجھو۔" اس نے صریحاً جھوٹ بولا۔ اور پھر نعیم کی بات سنے بغیر باہر نکل آیا۔ مانو کا ذکر اس نے ایمان کو جلانے کے لیے کیا تھا۔ گو اس بات سے مانو کی ہونے والی توہین کا ازالہ تو ممکن نہیں تھا مگر پھر بھی کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر تھا۔

جیسے ہی وہ پارکنگ میں پہنچا کسی کی کال آنے لگی۔ موبائل نکالنے پر اُسے انجان نمبر نظر آیا "یس......" موبائل نکال کر اس نے کال ریسیو کی۔

"شمیر صاحب بات کر رہے ہیں۔" نسوانی آواز سن کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ کہ پچھلے چند ماہ سے اسے یعنی کوئی کال نہیں آئی تھی۔

"جی شمیر بول رہا ہوں۔"

"سر ...... میں نسرین بول رہی ہوں ...... شاید آپ کو یاد نہ ہو مگر آپ سے ملاقات ہو چکی ہے...... آپ نے آفندی صاحب کو سفارش کر کے مجھے ڈرامے میں کام بھی دلایا تھا۔"

"جی نسرین......؟" اس کے ذہن میں ایک قبول صورت لڑکی کا ہیولہ ابھرا۔

"سر میرے پاس تفصیل بتانے کا تو وقت نہیں ہے...... بس اتنا سمجھ لیں کہ آج آپ نے نعیم عالم سے فلم کے مسودے کا سودا نہیں کرنا۔"

"کیوں......؟" اسے شدید حیرانی محسوس ہوئی۔

"سر وہ فصیح عالم کا بیٹا ہے...... اور کل شہاب مرزا، فصیح عالم اور نعیم عالم شہاب مرزا کے آفس میں آپ سے کسی توہین کا بدلہ لینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ایک واجبی سی اداکارہ ہے نازلی ...... وہ بھی اُن کے ہمراہ تھی ...... میں زیادہ تفصیل میں تو نہیں جان سکی بس اڑتی اڑتی بات ہی میرے کانوں میں پہنچی ہے۔"

"تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟"

"شہاب مرزا نیا ڈرامہ بنا رہا ہے...... آڈیشن دینے گئی تھی۔ اُسی وقت ان کی باتیں سنیں ...... میں کل ہی آپ کو یہ سب بتا دیتی مگر میرے پاس آپ کا نمبر نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے صوبر سے لیا ہے اور اسی وقت آپ کو رنگ کر دیا۔"

"اتنی مہربانی کس لیے؟"

"یونہی سر...... آپ کے متعلق ان کی توہین آمیز گفتگو مجھے پسند نہیں آئی۔ پھر آپ میرے محسن بھی تو ہیں کہ آپ کی وجہ سے مجھے چند ڈراموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔"

"تھینک یو مس نسرین...... نمبر میرے پاس آ گیا ہے کبھی حالات نے اجازت دی تو آپ کے احسان کا بدلہ ضرور اتاروں گا...... خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" نسرین نے کہا اور اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا...... نادانستگی میں بھی وہ اس آزمائش پر پورا اترا تھا فصیح عالم کا منصوبہ دوجمع دو چار کی طرح اس کے سامنے واضح ہو گیا تھا۔ اپنے بیٹے کو سامنے رکھ کر اس نے شمیر کو بے عزت کرنا چاہا تھا۔ شاید شمیر کی تنگ دستی کی خبر اس تک پہنچ گئی تھی اور ایسا لازماً اس کے کار بیچنے کی وجہ سے ہوا تھا...... موٹر سائیکل پارکنگ سے نکال کر وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ فصیح عالم نے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے ایک عمدہ چال سوچی تھی مگر شمیر کو اس کے رب نے بچا لیا تھا۔

اس کا دل لاہور سے اچاٹ ہو گیا...... اور وہ واپسی کی سوچنے لگا۔ واپسی کا ارادہ شاید چند دن مزید ڈانوا ڈول رہتا اگر اس کا ایمرجنسی فون نہ آ جاتا۔ وہ روح فرسا خبر اسے ماں نے سنائی کہ اس کے والد کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے اور وہ ہسپتال میں داخل ہے۔ اس نے پنڈی جانے میں دیر نہ لگائی۔ ماسٹر سلیم واقعی کافی سیریس تھا...... ڈاکٹروں سے پتا چلا کہ اس کے دل کا والو ایک

دم بند ہو گیا تھا اور ڈاکٹروں نے بند والو کو کھولنے کے لیے بائی پاس آپریشن تجویز کیا تھا...... اور پھر اللہ کے کرم سے ماسٹر سلیم کا آپریشن کامیاب رہا...... آپریشن کے اخراجات اور اس کے بعد مہنگی دواؤں کی خریداری نے شبیر اور اس کے والد دونوں کے اکاؤنٹ میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ ان کی آمدن کا واحد ذریعہ ماسٹر سلیم کی پنشن رہ گیا تھا جس سے شاید مہینے بھر کی دال روٹی بھی نہ چل پاتی۔

ڈیڑھ دو ہفتے بعد شبیر نے دوبارہ لاہور کا رُخ کیا۔ اور اپنی رہائش میں موجود سارا سامان مع موٹر سائیکل کے بیچ دیا۔ صرف مانو کے کپڑے، جیولری، اپنے کپڑے اور جس پردے کے ساتھ مانو کی چوڑیاں سلی تھیں وہ اپنے ساتھ پنڈی لے آیا۔ مالک مکان کا حساب وہ بے باق کرتا آیا تھا۔ اس رقم نے بھی ماہ ڈیڑھ ماہ سے زیادہ ساتھ نہیں دینا تھا۔ اسے آمدن کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا تھا۔ پہلے اس کے پاس سکول ماسٹر کی جاب تھی اور پھر تصنیف کی مد میں بھی اتنی رقم مل جاتی کہ گھر کا انتظام اچھی طرح چلتا...... مگر جب اسے فلمیں اور ڈرامے لکھنے کا موقع ملا تو سکول جانا اس نے ترک کر دیا تھا۔ اور اب لازمی طور پر اتنے عرصے کی غیر حاضری کے بعد اسے کسی نے جاب پر بحال نہیں کرنا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں سرگرداں تھا کہ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔

"شکیل بیٹا آیا ہے پتر......؟"

"شکیل......؟ کہاں ہے؟" اتنے عرصے بعد شکیل کی آمد نے اسے حیران کر دیا تھا۔

"تیرے ابو کے ساتھ بیٹھا ہے......" کہہ کر اس کی ماں باہر نکل گئی۔

"اوہ...... تو بیمار پرسی کے لیے آیا ہے"...... وہ خود کلامی کرتے ہوئے اٹھا اور والد کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

"السلام علیکم"۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" اس کا والد اور شکیل بیک زبان بولے۔ شکیل اس سے مصافحے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسے ہو شکیل؟" مصافحہ کرتے ہوئے شبیر کو وہ بیتے لمحات یاد آ گئے جب اس کی شکیل سے تلخ کلامی ہوئی تھی۔ آج اسے اپنے گزشتہ سلوک پر ندامت ہو رہی تھی۔ مگر کہتے ہیں کہ کمان سے نکلا تیر اور بیتا وقت واپس نہیں آتے۔ اس وقت اگر وہ یہ خیال کر لیتا کہ اختیار، دولت اور شہرت بھی صورت کی طرح عارضی اور ختم ہو جانے والے ہوتے ہیں تو آج اسے نادم چہرے سے اپنے دوست کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

"الحمدللہ...... فٹ اینڈ فائن"۔ شکیل کے لہجے میں گزشتہ ملاقات کی تلخی کا اثر محو تھا۔

"بیٹھو۔" اسے بیٹھنے کا کہہ کر وہ خود بھی بیٹھ گیا۔

"بھابی اور بچے کیسے ہیں؟"...... بیٹھتے ساتھ شکیل نے سوال کیا۔

"اچھے ہیں۔" اس نے والد کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا جو شکیل کے سوال پر بیٹے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"شاید کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے تم دونوں کی؟" ماسٹر سلیم نے شکیل کے انداز اور سوالوں سے ان کے درمیان فاصلے کو جانچ لیا تھا۔

"جی انکل!......" شکیل سعادت مندی سے بولا۔ "یہ مستقل لاہور رہنے لگا تھا اور میرا قیام پنڈی میں ہے بس آہستہ آہستہ دوری ہو گئی...... اب بھی شاید یہ آپ کی بیماری کی وجہ سے آیا ہے؟"

"ہاں بیٹے...... ایسا ہی ہے۔" اس نے شکیل کی تصدیق کی۔ اسی وقت شبیر کی ماں چائے کے برتنوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ چائے پینے کے دوران وہ شبیر

کے والد سے محو کلام رہا۔ زیادہ تر گفتگو ان کی بیماری کے متعلق تھی۔

"اچھا انکل...... اب چلوں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کامل کی نعمت سے نوازے۔" چائے پی کر وہ جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آمین......" والد کے ہمراہ شہیر بھی بے ساختہ بولا۔

ماسٹر سلیم سے مصافحہ کر کے وہ ان کے کمرے سے نکلے۔

"شکیل...... اب تک خفا ہے یار۔" شہیر اس موقع کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"بالکل ہی نہیں......" شکیل ہنسا...... "بس دکھ یہ ہے کہ بہت دیر کر دی۔"

"شکیل میں شرمندہ تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔

"ہاں اس قسم کی بکواس کے بعد ہونا بھی چاہیے۔" شکیل کا قہقہہ بلند ہوا اور وہ بھی مسکرا دیا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا۔

"اسی کو دوستی کہتے ہیں۔" پھر وہ شکیل سے مخاطب ہوا۔

"تھوڑی دیر بیٹھو گے نہیں تم سے کچھ بات کرنی ہے؟"

"تیری دعوت کا منتظر تھا۔" شکیل اعتراف کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیا۔ اسے کمرے میں بٹھا کر شہیر نے اپنے سارے حالات اسے تفصیل سے سنا دیے۔

"بھابی سے دوبارہ رابطہ نہیں ہوا؟" شہیر کی بات ختم ہوتے ہی وہ مستفسر ہوا

"نہیں۔" شہیر نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کے ماں باپ سے کوئی بات ہوئی ہو، کوئی گلہ شکوہ...... کوئی شکایت...... تیرے والدین یا تجھ سے کہا ہو؟"

اس مرتبہ بھی شہیر کا جواب نفی میں ہلتا ہوا سر تھا۔

"شہیر!...... تو نے بھابی کے ساتھ جانے انجانے میں جو کچھ کیا میں اس پر روشنی ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ تجھے خود بھی اس کا احساس ہے۔ اب مسئلہ ہے اسے منا کر لانے کا...... اور جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ مشرقی عورت ہے اور مشرق کی بیٹیاں اپنے خاوندوں کو مجازی خدا سمجھتی ہیں...... ان کی خطاؤں، لغزشوں اور مظالم کو بھلانے میں مبالغہ آمیز حد تک چلی جاتی ہیں...... شوہر پرستی ان کے خمیر میں گندھی ہوتی ہے...... البتہ اس کے والدین کا میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا برتاؤ کیا ہوگا...... بہرحال اپنے والد کو بیچ میں ڈالو امید ہے مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"شکیل...... اتنے سہانے سپنے نہ دکھاؤ یار یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ پہلے والی مانو مجھے قیامت تک نہیں مل سکتی دوست...... میں نے بہت برا کیا، بڑی زیادتی کی...... اور جہاں تک تعلق ہے اس کے والدین کو راضی کرنے کا وہ اتنا کٹھن مرحلہ ہو نہ ہو مانو کو پانا بہت مشکل ہے...... کہتے ہیں نا دل شیشے کی طرح ہوتا ہے اور شیشہ اگر ٹوٹ جائے تو جوڑنے پر بھی اس میں بال رہ جاتا ہے پھر مانو کا دل تو میں نے کرچی کرچی کر دیا تھا۔ ان کرچیوں کو سمیٹنا مشکل ہوگا تم جوڑنے کی بات کرتے ہو۔"

"تمہیں تو پہلے بھی اس کی محبت کا یقین نہیں تھا؟" شکیل اس کی باتوں سے متفق نہیں تھا۔

"دیکھو شکیل...... وہ محبت اب خواب ہوئی...... پہلے میرے پاس صورت نہیں تھی سیرت تو تھی۔ بے لوث چاہت، بے پایاں محبت، خلوص و وفاداری اور صرف اسی کا ہونے کے غرور نے مجھے سرخرو کیا...... اور اب......؟ ہونہہ۔" شہیر طنزیہ انداز میں ہنکارا۔ "اب سیرت و کردار تو گنوایا دنیاوی دولت بھی منہ موڑ گئی۔ مفلسی نے یوں لپیٹ میں لیا ہے کہ جان کے لالے پڑے ہیں۔"

آمدن کا ایک ہی ذریعہ باقی ہے اور وہ ہے ابو جان کی محدود پنشن...... دونوں بچوں کو بھی اچھے سکول سے اٹھانا پڑا، اب سرکاری سکول میں جاتے ہیں...... یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ گھر اپنا تھا ورنہ شاید......" شبیر خاموش ہو گیا۔ اس شاید کے آگے ہر بات واضح تھی۔ بات ادھوری ہوتے ہوئے بھی پوری تھی۔

"دیکھو فلمیں لکھنا ضروری تو نہیں...... تم اچھے لکھاری ہو تصنیف و تالیف کے ذریعے بھی اچھا خاصا کما سکتے ہو؟"

"ہوں نہیں تھا...... اب کاغذ سامنے رکھے گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں مگر نہ تو کوئی تھیم سوجھتا ہے نہ کسی لفظ و حرف کی ترتیب سمجھ آتی ہے۔ یقیناً میں نے قلم کی حرمت پامال کی ہے اور مانو کی طرح قلم کے لیے بھی معتوب ہو گیا ہوں۔"

"کچھ زیادہ ہی تو جذباتی ہو رہے ہو......؟"

"نہیں...... حقیقت پسند ہوں۔ سب کچھ تیرے سامنے ہی تو ہے۔"

"اچھا یوں کرو مجھ سے کچھ رقم لے کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرلو۔"

"چھوٹا موٹا کاروبار......؟" شبیر نے اپنی ہنسی اڑائی۔ "مثلاً پان سگریٹ کا کھوکھا ڈال لوں، چاول چھولے بیچنا شروع کردوں یا پھر سبزی کی ریڑھی لگا لوں؟"

"دکان کھولنے میں مجھے تو کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔" شکیل سنجیدہ تھا۔

"بھائی ساری زندگی درس و تدریس اور لکھائی پڑھائی میں صرف ہوئی ہے۔ قباحت نہ بھی ہو مگر اس کا رتو ہے نا؟...... کہانی میں خرید و فروخت کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھانا علیحدہ فن ہے۔ حقیقی زندگی میں یہ سب بروئے کار لانا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل ہے میرے لیے۔"

"تو بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرو۔ کسی پرائیویٹ سکول میں ٹیچنگ شروع کردو اور اس کے ساتھ محکمہ تعلیم میں نوکری کی بحالی کی درخواست دے دو۔ اللہ کرم فرمائے گا۔" شکیل نے معقول قسم کا مشورہ دیا۔

"صحیح کہا دوست...... مگر افسوس میں ذہنی طور پر اس قابل نہیں کہ بچوں کو پڑھا سکوں اور پھر پرائیویٹ سکول بہت کم تنخواہ دیتے ہیں۔"

"اپنے ذہن کو ٹھیک کرو دوست...... اس طرح چارپائی پر لیٹنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا اور نہ ہی سہانے ماضی کی یاد میں مستقبل کو تاریک کرنا مفید ہوگا؟"

"کوشش کروں گا کہ کوئی نوکری کرلوں۔" اس نے شکیل سے اتفاق کرنے میں عافیت جانی مگر اس کا یہ ارادہ دل میں مقید رہا۔ شکیل کے جانے کے بعد وہ روزانہ نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلنے کا سوچتا مگر اس سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ جمع پونجی مہینے سے زیادہ نہ چل سکی اس کے بعد مجبوراً وہ نوکری کی تلاش میں نکلا حالانکہ یہ کام اسے بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا۔ وہ دن کی تلاش بسیار کے بعد ایک پرائیویٹ سکول میں اسے جاب مل گئی۔ تنخواہ اس کی توقع سے بھی کم تھی۔ مگر زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا...... اس نے پانچ چھ ہزار ماہانہ پر سکول جوائن کرلیا۔

کہتے ہیں مصیبت اکیلی نہیں آتی...... ایک دن سکول سے واپس آتے ہوئے اسے بڑے بیٹے کے ایکسیڈنٹ کی روح فرسا خبر ملی۔ کوئی نامعلوم موٹر سائیکل سوار اسے ٹکر مار کر بھاگ گیا تھا۔ چونکہ یہ حادثہ ان کی اپنی گلی میں پیش آیا تھا اس لیے ایک شناسا جلدی سے اسے قریبی ہسپتال لے گیا اور پھر وہیں سے شبیر کے گھر فون کردیا اسے یہ خبر باپ کی زبانی سننے کو ملی۔ اس نے وہیں سے متعلقہ ہسپتال کا رخ کیا۔ مونی کے سر میں

چوٹ آئی تھی اور وہ بے ہوش تھا۔ ایک بازو بھی فریکچر ہوا تھا۔ موسیٰ کے علاج کے اخراجات ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی صورت اس کے دماغ میں چکرائے اس کا جواب اسے مانو کے زیور بیچ کے دینا پڑا۔ ڈیڑھ دو ہفتے کی غیر حاضری نے اس سے وہ ٹوٹی پھوٹی جاب بھی چھین لی تھی۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب ان کے گھر پہلا فاقہ آیا...... اس کی انا اور خودداری اسے کسی کے سامنے سوال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے قدم ایک دفعہ پھر نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ اس مرتبہ بھی اسے پرائیویٹ سکول میں ویلکم کہا گیا تنخواہ کے نام پر برائے نام رقم ہی تھی۔ سکول کی نوکری کے ساتھ اس نے دوبارہ قلم سنبھالا مگر قلم اس سے خفا تھا۔ نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔ ہر وقت کی سوچوں اور ناکافی غذا نے اس کی صحت پر برے اثرات ڈالنا شروع کر دیے تھے۔ مسلسل بے آرامی نے اسے چڑچڑا کر دیا تھا۔ اور پھر وہ نوکری کا مہینہ بھی پورا نہیں کر پایا تھا کہ بچوں کے والدین کی مسلسل شکایت پر کہ اس نے غصے میں آ کر چند بچوں پر ہاتھ اٹھایا تھا سکول ہیڈ ماسٹر نے اسے نوکری سے جواب دے دیا۔ البتہ یہ مہربانی اس نے کی تھی کہ اس کے بیس بائیس دن کی تنخواہ کے بجائے پورے مہینے کی تنخواہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔

یہ صدمہ اسے چارپائی کا مہمان بنا گیا۔ یوں بھی بیماری کو غریبوں کے گھر سے بہت الفت ہوتی ہے۔

"بیٹا کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتے؟" اسے مسلسل کھانستے اور چارپائی پر کروٹیں بدلتے دیکھ کر اس کی ماں فکرمندی سے بولی۔

"ہاں تاکہ یہ چند ہزار بھی ڈاکٹر لے اڑے۔" اس نے تلخی سے سوچا۔ مگر ایسی بات ماں کو کہہ کر وہ اس کا دل نہیں دکھا سکتا تھا۔

"ٹھیک ہوں ماں ...... بس تھوڑی سی حرارت ہے...... بخار کی گولی لیتا ہوں ٹھیک ہو جائے گا بخار۔"

مگر اس کا بخار ٹھیک نہ ہو سکا۔ تیسرے دن اس کی ماں نے زبردستی اس کے والد کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلوا لیا کہ اس کا بخار بہت شدت اختیار کر گیا تھا۔ اور پھر ڈاکٹر کی ٹریٹ منٹ سے بخار تو ٹھیک ہوا مگر وہ اپنی حالیہ تنخواہ نہ بچا سکا۔

"پتر ایک مشورہ کرنا تھا۔" وہ چھت میں جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا کہ اس کا والد کمرے میں داخل ہوا...... مانو کے جانے کے بعد یہ پہلا دن تھا جب والد اس کے کمرے میں آیا۔

"آئیں ابو جان بیٹھیں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو پتر۔" اس نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"حکم کریں ابو جان؟"

"پتر یہ گھر کافی بڑا ہے اور ہماری ضرورت سے زیادہ ہے...... اگر اس کا کچھ حصہ بیچ دیں اور اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کر لیں تو میرا خیال ہے ہم مالی مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

والد کی بات نے اسے تڑپا دیا تھا۔ یہ گھر اس کے باپ کے خون پسینے کی کمائی تھا۔ اور پھر جس وقت دونوں بھائی ان سے علیحدہ ہوئے تھے انہیں بھی شبیر نے مناسب رقم ادا کی تھی۔

"نہیں ابا جی...... یہ گھر نہیں بکے گا۔" اس کے لہجے میں عزم تھا۔ "میں کوئی حل نکالتا ہوں۔"

"کیا حل نکالو گے پتر؟" اس کا والد دکھی ہو گیا۔

"ابا جی...... اگھر میں کچھ فرنیچر پڑا ہے قالو چھے یہ ڈبل بیڈ ہے میری کتابیں، ان کے شیلف الماریاں وغیرہ یہ سب بیچ کر ایک سیکنڈ ہینڈ ٹیکسی لے لیتا ہوں۔ رقم کم پڑ گئی تو شکیل یا کسی بھائی سے ادھار لے لوں گا۔ امید ہے اچھا گزارا چلے گا؟"

"تم...... ٹیکسی چلاؤ گے؟" اس کے والد کے لہجے

میں چھلکتا دکھ بڑھ گیا تھا۔

"کیا حرج ہے ابو جان......؟ بھیک تو نہیں مانگ رہا نہ چوری یا ڈاکہ ہی ہے۔"

"اس سے بہتر تھا ٹیوشن سنٹر کھول لیتے۔" والد نے مشورہ دیا۔ "میں بھی مدد کر دیا کروں گا۔"

"نہیں ابو جان۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "آج کل میں پڑھنے پڑھانے کی صلاحیت سے تہی دست ہوا بیٹھا ہوں۔"

"چلو ...... جو مرضی میں آئے کرو...... لیکن یہ سامان بیچنے کے بجائے شکیل اور دونوں بھائیوں سے تھوڑی تھوڑی رقم لے لو۔" یہ کہہ کر ماسٹر سلیم جانے لگا۔

"ابو جان......!"

"جی پتر......؟" وہ پیچھے مڑا۔

"ابو جان میں شرمندہ ہوں۔" وہ جرأت مجتمع کرتے ہوئے بولا۔

"ایسا نہیں کہتے پتر...... یہ سرد و گرم زندگی کا حصہ ہیں۔"

"ابو جان......! میں نے جو آپ کو دکھ دیا ہے اس کے لیے نادم ہوں۔"

"کچھ کام بندہ نادانگی میں کر بیٹھتا ہے۔ ارادہ کچھ ہوتا ہے اور نتائج بالکل برعکس، باقی تیری فرماں برداری میں ہمیں کچھ شک ہوتا تو ہمارے دو بیٹے اور بھی ہیں اور یقیناً ان کے گھر کے دروازے ہمارے لیے کھلے ہوں گے۔"

"آپ نے مجھ سے بازپرس نہیں کی؟"

"مانو بیٹی نے اس دن مجھے سب بتا دیا تھا جب وہ صبح کے ٹائم یہاں پہنچی تھی۔ اور پھر تیری مجرمانہ خاموشی نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔"

"پھر بھی......! آپ اصل بات تو کرید سکتے تھے نا؟" شہیر شکوہ کناں ہوا۔

"نہیں، مانو بیٹی نے ہمیں قسم دی تھی کہ نہ تو تجھ سے استفسار کریں نہ معترض ہوں اور نہ تجھے مجبور ہی کریں گے کہ اسے منالاؤ۔"

"اور اس کی قسم اتنی اہم تھی کہ آپ نے مجھے صفائی کا موقع ہی نہ دیا...... بس قصور وار گردان لیا۔"

"نہیں...... اس کی قسم سے زیادہ تیرا رویہ اس کا سبب بنا...... تم نے اس کے بارے میں بالکل چپ سادھ لی تھی...... اگر تم سچے ہوتے تو ضرور واویلا کرتے۔"

"یعنی میرا شور شرابا ہی میرے سچ کا گواہ ہو سکتا تھا...... خاموشی نہیں۔" شہیر بحث پر اتر آیا۔

"نہیں برخوردار!...... سچ کسی نہ کسی طرح نظر آ ہی جاتا ہے۔ اسے نہ تو شور شرابے سے چھپایا جا سکتا ہے اور نہ خاموشی ہی سے اس پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ یہ تو بس انسان کی حرکات و سکنات، رویے اور کیفیات سے ظاہر ہوتا ہے...... باقی اگر وہ جھوٹی ہوتی تو صبح اذانوں کے وقت آ کر یوں نہ دہائی دیتی...... اور آفرین ہے اس بچی پر کہ تیرے ایسے ناروا سلوک کے باوجود وہ پہلے سسرال آئی کہ اس ٹائم گھر جانے سے گھر والوں کو اصل حقیقت کا پتہ چل جاتا۔"

"ابو جان...... اس دن اس نے کیا بات کی تھی؟" شہیر کو دوبارہ مانو کے غم نے آلیا تھا۔

"بہت سی باتیں کی تھیں بیٹا۔" ماسٹر سلیم خیالوں میں کھو گیا۔ جیسے مانو کی باتیں یاد کر رہا ہو۔ "کہہ رہی تھی تیرا اصل روپ اب اس کے سامنے آیا ہے۔ اور یہ کہ تو نے اسے کہیں کا نہیں رکھا...... اور جو لڑکی والدین کے طے کیے رشتے کو ٹھکراتی ہے وہ یونہی ٹھوکریں کھاتی اور دنیا کا تماشا بنتی ہے...... ہم نے اسے کافی تسلی دی تھی کہ تجھے سمجھا لیں گے...... مگر اسے تم پر سے یقین اٹھ گیا تھا...... اور پھر اس نے جاتے وقت قرآن پر ہم میاں بیوی

کو قسم دی تھی کہ تجھ سے کسی بات کا ذکر نہیں کریں گے...... کہہ رہی تھی اگر میرا شوہر از خود تمہیں مجھے لانے کے لیے بھیجتا ہے تو آ جاتا۔ میں تمہاری بات نہیں ٹھکراؤں گی...... میں کل بھی تمہاری بیٹی تھی آج بھی ہوں اور آئندہ بھی رہوں گی...... لیکن اگر ہم اپنی مرضی سے گئے تو وہ قطعی واپس نہیں آئے گی اور جس دن بھی ہم جائیں گے وہ پہلے قرآن پر ہم سے حلف لے گی کہ ہم تیرے کہنے پر وہاں گئے ہیں اور تجھے بھی ہم نے اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ ہمیں اسے گھر سے لانے کا کہو...... مجھے ڈر تھا کہ اگر کبھی ہم نے از خود کوشش کی اور اس نے سچ سچ حلف اٹھوالیا تو شاید ہم جھوٹ نہ بول سکیں نتیجتاً دکھ کی زیادتی اسے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور نہ کر دے۔ میرا مطلب خلع کے مطالبے سے ہے۔"

والد کی تفصیلی بات سن کر شمیر کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

"بیٹے اگر تو ایک دفعہ جھوٹے منہ بھی ہمیں کہہ دیتا تو وہ اب تک یہاں آ چکی ہوتی وہ صرف تیری پکار کی منتظر تھی...... بلکہ اب بھی ہو گی۔"

"صحیح کہا ابا جان...... مگر میں قصوروار ہوں اور سزا کا مستحق ہوں...... یوں بھی اب میری معاشی حالت کافی دگرگوں ہے۔ دھوکے باز اور بے وفا تو پہلے ہی تھا اب قلاش و مفلس بھی ہو گیا ہوں......"

ماسٹر سلیم نے اسے سمجھانے کے لیے لبوں کو حرکت دی مگر پھر اسے مانو کا دیا حلف یاد آیا اور وہ ہونٹ بھینچے وہاں سے نکل گیا۔

شمیر کو شکیل اور دونوں بھائیوں سے آسانی سے اتنی رقم مل گئی تھی کہ اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ ٹیکسی خرید لی تھی۔ شکیل نے اس کے ٹیکسی چلانے کے فیصلے کو سراہا تھا۔

"حلال رزق اگر جھاڑو مار کر بھی کمایا جائے تو قابل فخر ہے دوست۔"

"صحیح کہا...... مگر اپنے مرتبے سے نیچے آنا بہت دشوار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اپنی عزت نفس کے گلے پر چھری پھیرنے کے مترادف۔"

"یہ سب خیال بیمار سوچ کا شاخسانہ ہوتے ہیں جناب۔" شکیل نے اسے تسلی دی۔ "کون سا مرتبہ اور کون سا اسٹیٹس...... وہ کیا کہتے ہیں......؟

بلندی کا بھروسا کیا
کبھی ہم تھے جہاں تم ہو

اور پھر یہ بھی سوچو نا گھر پڑے رہو گے تو کھاؤ گے کہاں سے...... یہ پاپی پیٹ تو مرتبے اور کلاس سے واقف نہیں ہوتا۔" شکیل کی بات حقیقت کے مطابق تھی...... شمیر وہاں سے اٹھ آیا۔ دو تین ہفتوں کے اندر اس کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے اپنے حال پر بھی ہنسی آتی...... اپنی تعلیم اور گزشتہ مرتبہ اسے گہری سوچوں کے سمندر میں اچھال دیتا۔ مگر پھر بچوں کا مستقبل اور بوڑھے والدین کی خدمت گزاری کا خیال اسے تقویت دے جاتا۔"

وقت گزرنے کے ساتھ اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ کس ٹائم کس جگہ سواری زیادہ ہوتی ہے۔ صبح کے ٹائم رہائشی علاقوں میں...... دوپہر کو سکولوں، کالجوں کے سامنے۔ رات گئے لاری اڈوں میں...... فلائٹ کے ٹائم ائیرپورٹ اور ٹرین کی آمد کے وقت ریلوے سٹیشن پر......

ایک دن وہ ایک مسافر کو شہر کے مضافات میں اتار کر واپس لوٹ رہا تھا...... چھٹی کا ٹائم گزر گیا تھا۔ رستے میں گرلز سکول کی نشاندہی کرنے والے بورڈ کو دیکھ کر اس نے ٹیکسی کا رخ کسی ممکنہ سواری کی امید میں سکول کی طرف موڑ دیا۔ مگر کوئی سواری اسے نظر نہ آئی۔ اکا دکا کم عمر بچیاں اسے پیدل ہی گھر کی جانب جاتی دکھائی دیں۔ یقیناً ان کے گھر پیدل مسافت پر تھے۔ وہ مایوس ہو کر وہاں سے جانے ہی لگا تھا کہ اس کی امید بر

آئی۔ وہ نقاب پوش خواتین نے سکول کے گیٹ سے نکل کر دائیں بائیں نظر دوڑائی اور پھر اسے دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔

اس کے قریب پہنچنے پر وہ اس سے کرایہ طے کرنے لگیں۔ عام ٹیکسی ڈرائیوروں کے برعکس وہ بہت سلجھا ہوا اور تعاون پسند تھا۔ شاید ہی کوئی مسافر اس کی ٹیکسی کو مسترد کرتا ان کے بیٹھتے ہی وہ ٹیکسی آگے بڑھانے لگا تھا کہ اس سے کرایے کے متعلق بات کرنے والی بولی "بھائی ایک منٹ ہماری ایک سہیلی نے آنا ہے۔" اور پھر یہ بات اس کے منہ میں تھی کہ ایک لڑکی سکول کے گیٹ سے برآمد ہوئی۔ شبیر گیٹ سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ متوسط طبقے کی ننانوے فیصد خواتین مردوں کے گھورنے کا بہت برا مناتی ہیں اور ایک ڈرائیور کی کامیابی کا راز نظر کی حفاظت میں مضمر تھا۔

"چلو بھائی۔" تیسری لڑکی کے بیٹھتے ہی وہ بولی۔

"شبیر نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

"آج تو پرنسپل کا غصہ دیکھنے والا تھا۔" ٹیکسی کے آگے بڑھتے ہی وہ دن بھر کے قصوں کو جت گئیں...... اور یہ تو ہر پیشے سے منسلک آدمیوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیشے سے متعلقہ امور پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ پچھلے دو تین ہفتوں سے شبیر تسلسل سے مختلف پیشوں سے وابستہ افراد کی گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"مجھے تو میڈم کا غصہ بالکل جائز لگ رہا ہے۔" سب سے آخر میں آنے والی لڑکی بولی یہ آواز کانوں میں پڑتے ہی ٹیکسی بری طرح لہرائی تھی شبیر بڑی مشکل سے ٹیکسی کو سنبھال سکا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ٹیکسی کسی مصروف شاہراہ پر نہیں تھی ورنہ ایکسیڈنٹ ہونے میں کوئی امر مانع نہیں تھا۔

سریلی چیخوں کے تھمتے ہی شبیر کو مختلف سوال سنائی دیئے ...... تینوں بیک زبان بولی تھیں۔ "خیر تو ہے؟ ...... بھائی ٹھیک تو ہو......؟ ......کیا ہوا؟"

"سوری میں ...... ذرا ہاتھ بہک گیا تھا۔" اس کا لہجہ ندامت سے پُر تھا اور اس دفعہ قیامت آخر میں سوار ہونے والی لڑکی پر ٹوٹی تھی جو لامحالہ مانو تھی۔ اس کی آواز کو شبیر کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں سر راہ اس سے ٹکرا جائے گی۔ شبیر کے مضبوط اعصاب بڑی مشکل سے اسے سہارے ہوئے تھے۔ بڑائی کے بول بولنے والا آج ایک ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں خود کو پاتال سے زیادہ گہرائی میں محسوس کر رہا تھا۔

"ویسے ایک لحاظ سے بہتر ہے۔" ایک تلخ سوچ اس کے اندر گونجی۔ "میں تھا ہی اس قابل کہ میری تذلیل ہوتی ...... کم از کم مانو تو خوش ہو گی ...... میں نے اپنے برتے، شہرت اور دولت کے بل پر اس کی توہین کی تھی ...... مذاق اڑایا تھا۔ اب وہ ان تینوں چیزوں سے تہی دامن دیکھ کر کچھ سکون تو محسوس کرے گی ...... شاید میرا معذرت چاہنا بھی اسے اتنا خوش نہ کرتا۔"

"ساحرہ کیا بات ہے؟ ...... خاموش کیوں ہو گئی ہو؟" جواباً اس کی مدہم آواز ابھری۔

"کچھ نہیں ثمینہ...... سر میں درد ہے۔"

"محترمہ خوشی برداشت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" شبیر نے ثمینہ نامی لڑکی کو کہنا چاہا مگر پھر بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔

"ابھی ٹیکسی میں بیٹھتے وقت تو بڑا چہک رہی تھیں؟"

"اب نہیں چہک رہی ...... تمہیں کوئی پرابلم؟" گو ثمینہ کا لہجہ اور انداز بالکل طنزیہ نہیں تھا مگر مانو کی آواز میں واضح طور پر تلخی گھلی تھی۔

"ارے تم تو لڑنے لگیں۔" تیسری لڑکی نے مداخلت کی۔ "اور ثمینہ تم جانتی ہو ساحرہ بیٹھے بیٹھے اپ

سیٹ ہو جاتی ہے...... پھر اسے چھیڑنے کا مطلب؟"
"میں نے کب چھیڑا ہے اسے؟" ثمینہ صفائی دینے لگی۔
شہیر نے بیک مرر میں دیکھتے ہوئے اس پر نگاہ ڈالی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔
"بے پایاں خوشی ہضم کرنا بھی کار دارد بن جاتا ہے۔" شہیر کا دماغ اسی کے احساسات کا قیافہ لگانے میں مصروف تھا۔
"بس بھائی ہمیں یہیں اتار دو؟" یہ کہنے والی ثمینہ تھی۔
شہیر نے بریک لگائی۔ وہ دوسری لڑکی کے ہمراہ باہر نکلی۔ اور پھر اچانک مانو بھی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔
"ارے سائرہ!...... تم نے آگے نہیں جانا؟"
دوسری لڑکی اس سے پوچھنے لگی جبکہ ثمینہ پرس کھول کر کرائے کی ادائیگی میں مصروف تھی۔
"میں یہاں سے پیدل چلی جاؤں گی۔" دھیمے لہجے میں کہہ کر وہ دونوں ساتھیوں کو خدا حافظ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔
"یہ واقعی اپ سیٹ ہے۔" ثمینہ اپنی ساتھی سے مخاطب تھی۔
شہیر آہستہ روی سے آگے بڑھ گیا اور پھر گلی کے موڑ تک وہ بیک مرر میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔
اس کی طبیعت بگڑنے لگی تھی...... وہ ٹائم سے پہلے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بیڈ روم میں کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔ اس کی طبیعت لمحہ بہ لمحہ بگڑ رہی تھی۔
اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔
"بیٹا خیریت تو ہے جلدی لوٹ آئے؟" قریب آ کر اس نے شہیر کے ماتھے کو چھو کر حرارت کا اندازہ لگایا۔ مگر اس کے بدن کی حرارت اتنی زیادہ نہیں بڑھی تھی کہ ماں کو بخار کا پتہ چلتا۔
"ماں جی نیند آ رہی تھی اس لیے لوٹ آیا۔" اس نے صریحاً جھوٹ بولا۔
اس نے پوچھا۔ "چائے بنا لاؤں؟"
"نہیں امی...... چائے نیند کو اڑا دے گی۔"
"اچھا سو جاؤ۔" وہ کمبل درست کر کے باہر نکل گئی۔ اور شہیر کو سوچوں کے حوالے کر گئی۔ مانو کی یادوں کے سمندر میں جوار بھاٹا کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اچانک ہی اس کے ذہن پر چھایا یا جمود ٹوٹا وہ کمبل سے باہر نکلا اور اگلے لمحے اس کا قلم مانو کی یاد میں کاغذ پر خوشبو بکھیر رہا تھا......

کسی کی مسکراہٹ پر،
اداؤں پر، وفاؤں پر
کسی کے قہقہے کی بازگشت دلربائی پر۔
کسی کی شوخ باتوں، نازنخروں، جھلاہٹ پر۔
کسی کی آنکھ سے نمکین جھرنے کی روانی پر
کسی ضدی، کسی برہم، کسی اکھڑ کے غصے پر
کہ سنجیدہ سوالوں کے بہت چنچل جوابوں پر
مجھے تیرا گماں ہوگا۔
اسی دم یاد آؤ گی۔
کبھی ساحل سے ٹکراتی ہوئی موجوں کی مستی پر
کہ سبزہ زار پر بکھرے ہوئے موتی کے قطروں پر
کبھی بادِ بہاری کے صبح دم سائیں سائیں پر
دسمبر کی کثیلی اور برفیلی ہواؤں پر
کبھی کوئل کی کوکو پر
کبھی بلبل کی بولی پر
کبھی پی پی پپیہے کی
کبھی چڑیا کی چوں چوں پر
کبھی وسط چمن میں مور کے بے خود تھر کنے پر

چکور دو چاند کے قصوں پہ یوں اپنے بدلنے پہ
میری انجمن بڑھے گی تو
مجھے تم یاد آؤ گی
کبھی سرسوں کی زردی تو کنول، لالے کی سرخی پہ
کبھی سورج مکھی کی گردش پیہم کے شیوے پہ
گلابی پھول سے اٹھتی ہوئی بھینی سی خوشبو پہ
نظر میری پڑے گی جب؟
چنبیلی موتیے، نرگس کے گجروں پہ

سنوں گا جب؟
کھنک کنگن کی چوڑی کی
کسی پازیب کی چھم چھم
کسی لمبے پراندے سے باندھے گھنگھرو کی چھن

چھن پہ
تیری آمد کا شک ہوگا
یقیناً یاد آؤ گی
کسی کی زلف برہم کے بکھر جانے کی حالت پہ
کسی کی زلف سے آنچل سرک جانے کے منظر پہ
رخ تاباں سے یوں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی لٹ پہ
کسی کی جھیل آنکھوں کی وہ شرمیلی وضاحت پہ
لب شیریں گلابی کے اثر انگیز جادو پہ
کبھی گالوں کے گڑھوں پہ
کبھی کانوں کے زیور پہ
کبھی جھلمل فروزاں ناک کے ننھے سے کوکے پہ
جو حسن بے خبر کی بے نیازی کا رس ہوگا
کہ تم کو یاد کرنے کا وہ پل کتنا حسیں ہوگا
بہت ہی یاد آؤ گی
یقیناً یاد آؤ گی
قسم سے یاد آؤ گی......

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یقیناً کسی اپنے کو بیگانے کے روپ میں دیکھنا بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ کتنی بیگانی لگ رہی تھی وہ کہ ایک دفعہ آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر اتنی بے اعتباری کہ چند سو گز اس کے ساتھ اکیلا جانا بھی گوارہ نہ کیا۔

وہ دوبارہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اس کے جسم میں حرارت بڑھنے لگی۔ اس کی ماں عصر کی نماز کی اطلاع دینے آئی تو اس کا بدن بھٹی بنا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ پریشان سی ہوگئی اور جا کر ماسٹر سلیم کو بیٹے کی ناگفتہ بہ حالت کا بتانے لگی۔ اس نے ڈاکٹر کو بلانے میں دیر نہ لگائی۔

ڈاکٹر میڈیسن دے کر چلا گیا۔ مغرب کی اذانوں میں چند منٹ رہتے ہوں گے جب ماسٹر سلیم نے اپنے گھر کے دروازے پر کسی گاڑی کو رکتے محسوس کیا۔ وہ اس وقت صحن میں بیٹھا اخبار بینی میں مصروف تھا "شاید شہیر واپس آگیا ہے؟" اس کے دماغ میں سوچ لہرائی مگر پھر اسے یاد آیا کہ شہیر تو اپنے بیڈ روم میں بیمار پڑا تھا۔ اسے زیادہ دماغ سوزی نہ کرنی پڑی کہ بیرونی دروازہ کھول کر ایک نقاب پوش خاتون گھر میں داخل ہوئی اور پھر جب اس نے نقاب الٹا تو وہ بے ساختہ سرشاری اور حیرانی کے ملے جلے جذبات سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں نے بیٹی جیسی بہو کو پہچاننے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ مانو نے کمبل میں لپٹا بچہ بھی اٹھایا ہوا تھا۔

"ارے شہیر کی ماں!......" وہ خوشی سے چیخا۔
"دیکھو تو کون آیا ہے۔"

وہ کچن میں تھی بوکھلا کر باہر نکلی کہ اپنے شوہر کو اتنا خوش اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مانو کو دیکھ کر وہ بھی خوشی سے بے قابو ہو کر آگے بڑھی۔

"میری پیاری بیٹی۔" کہہ کر اسے لپٹا لیا۔
ملنے ملانے کا سلسلہ ختم ہوتے ہی خدیجہ خاتون

نے بچہ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔
"ماشاء اللہ کتنی پیاری ہے..... کیا نام رکھا ہے میری پوتی کا؟"
"ماہ نور....." مانو دھیمے لہجے میں بولی۔ اور پھر پوچھنے لگی۔ "اس کے ابو کہاں ہیں امی؟"
"اپنے کمرے میں ہے بیٹی..... بیمار پڑا ہے۔"
"کیا ہوا.....؟ نمبر کے ٹائم تک تو ٹھیک ٹھاک تھے۔" مانو گھبرا گئی تھی۔
"تمہیں کہاں ملے نمبر کے ٹائم؟" خدیجہ نے شوخی سے پوچھا۔
"امی میں سکول میں جاب کرتی ہوں نا؟ آج واپسی پر اپنی ساتھی ٹیچرز کے ہمراہ ان کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔"
"اوہ..... اسی لیے آج ٹائم سے پہلے واپس آ کر بستر میں گھس گیا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے بخار بھی ہو گیا ہے۔"
"امی جان میں ان سے مل لوں؟" مانو حیا آلود لہجے میں مستفسر ہوئی۔
"بیٹی تیرا اس سے ملنا مجھے خوشی سے سرشار کر دیتا ہے۔ اور کون خوش نہیں ہونا چاہتا؟"
ماسٹر سلیم ممنونیت سے بولا۔ "بیٹی تو نے ہماری خوشیاں لوٹا دی ہیں۔ میری دو بہوئیں اور بھی ہیں، مگر تو بہو نہیں بیٹی لگتی ہے، سدا خوش رہو بیٹی۔"
مانو اعتماد سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

شمیر عجیب سی بے کلی اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ پھر اُسے محسوس ہوا کوئی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہے۔ اس نے سوچا شاید والدین میں سے کوئی ہے۔ کمبل کے کونے سے ایک ہاتھ رینگ کر اندر آیا اور اس کی پیشانی پر جم گیا..... اس کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی۔ ایک جانا پہچانا لمس، ایک مانوس سی خوشبو۔
"شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں"۔ اس نے خود کلامی کی۔ اچانک کمبل اس کے چہرے سے ہٹا اور لب احمریں کا حلاوت بھرا لمس اسے اپنے ماتھے پر محسوس ہوا۔ کسی کے قرب کی آگہی نے اس کے ان اندیشوں کو جھٹلا دیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں مانو کا صبیح روشن اور پُر رونق چہرہ اس کی پیاسی نگاہوں کو شربت دیدار دے رہا تھا۔
"مانو؟" اس نے عجیب کیفیت میں ہولے سے پکارا۔ دیکھنے کے باوجود دل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔
"جی..... جی..... جی..... میرے شمیر، میرے سرتاج۔" اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا سر شمیر کی چوڑی چھاتی پر رکھ دیا۔
"نہیں، نہیں، نہیں یہ خواب ہے سپنا ہے، میں پاگل ہو چکا ہوں، جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں..... یہ....." شاید اس کی اوٹ پٹانگ گفتگو جاری رہتی مگر مانو کو اس کے ہونٹ بند کرنے کا طریقہ آتا تھا۔
شمیر کے بازوؤں نے مانو کے جسم کے گرد حلقہ بنایا اور رو دیا..... وہ خوشی کے آنسو تھے، اپنے گناہوں کا اعتراف تھا یا کسی شکوے کا اظہار اُسے کچھ پتہ نہ تھا۔
"نہیں میری جان نہیں..... میں آ گئی ہوں نا..... تیری مانو، تیری بلی تیری گڑیا، تیری ننھی پری اب کاہے کا غم، اب کس بات کا رونا..... اتنی دیر بھی تو نے خود کرائی ہے۔ ایک ہلکی سی آواز تو دیتے تیری کنیز چشم براہ تھی بھاگ کر تیرے پاس آ جاتی۔"
"کس منہ سے آواز دیتا..... کن الفاظ سے پکارتا۔ میرا گناہ معاف کرنے کے قابل تو نہیں تھا۔ میں نے تو..... میں نے تو سارے وعدے، ساری قسمیں توڑ دی تھیں..... میری چاہت وفا، محبت کے سارے دعوے

تو ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے پھر میں کیسے حوصلہ کرتا۔ جسے ایک بار پہلے دھوکا دیا ہو وہ کیسے مجھ پر اعتبار کرتی ...... نہیں مانو نہیں ...... میں نے بہت ظلم کیا تھا۔ بہت بڑی زیادتی کا مرتکب ہوا تھا۔ ایک عظیم جرم مجھ سے سرزد ہوا تھا۔"

"تو نے کچھ بھی نہیں کیا سمجھے نا؟" مانو نے آنکھیں نکالیں ...... وہ شبیر کی نفسیات سے واقف بھی تھی اور جانتی تھی کہ اسے کس طرح نارمل کیا جا سکتا تھا۔ "اب اگر کوئی ڈائیلاگ بولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" اور پھر اس سے پہلے کہ شبیر کوئی جواب دیتا دروازے پر دستک ہوئی اس کے ساتھ خدیجہ خاتون کی آواز آئی۔

"مانو بیٹی ...... گڑیا کو تو سنبھالو میں شام کی نماز پڑھ لوں۔"

"آئی امی۔" وہ شبیر سے علیحدہ ہو کر دروازے کی طرف بڑھ گئی ...... بچی کو لے کر وہ لوٹی تو شبیر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا بخار جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

"تو یہ ماہ نور صاحبہ ہے۔" مانو کے قریب آتے ہی وہ مسکرایا۔

"تجھے کیسے پتہ؟" مانو بچی اس کی گود میں لٹا کر اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"خود تو کہتی تھیں کہ بچی ہوئی تو ماہ نور نام رکھوں گی اور بیٹا ہوا تو اویس ......"

بچی شبیر کے لمس سے سہم کر رونے لگی تھی۔

"ارے گڑیا ...... یہ وہی گندا پاپا تو ہے کہ ساری ساری رات جس کی باتیں تجھے بتاتی تھی۔" مانو نے یہ سب نارمل انداز میں بچی سے لاڈ کرتے ہوئے کہا تھا مگر وہ جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔

ان کی وہ رات گزرے ڈیڑھ سال کا حال احوال سناتے گزری تھی۔ اس وفا شعار لڑکی نے اسے یوں معاف کر دیا تھا گویا اس کی کوئی غلطی ہی نہ تھی۔ نہ کوئی طعنہ، نہ طنز و تشنیع نہ گلہ شکوہ اور نہ کوئی بھی پچھلی باز پرس ہی۔ اپنے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ اس دن گھر جا کر اس نے والد صاحب کو صرف اتنا بتایا تھا کہ اس کا شوہر سے جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ اپنے گھر آ گئی ہے۔ اس کا والد غصے تو بہت ہوا مگر پھر مانو کے سمجھانے بجھانے پر خاموش رہا تھا۔ بچی کی پیدائش کے وقت وہ ایک بار پھر آگ بگولہ ہوا تھا اور اس نے شبیر سے باز پرس کا عندیہ دیا مگر پھر مانو کی اس دھمکی پر کہ اگر اس کے باپ نے شبیر سے بات کی تو وہ گھر سے کہیں دور بھاگ جائے گی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ بچی کی پیدائش کے بعد مانو کو والد کی وساطت سے ایک پرائیویٹ سکول میں بطور ٹیچر نوکری مل گئی تھی اسکول جوائن کیے اسے دوسرا مہینہ تھا۔

آج شبیر کو ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دیکھ کر اسے سخت دھچکہ لگا تھا۔ اور پھر شکیل بھائی سے فون پر استفسار کرنے پر اسے شبیر کے سارے حالات معلوم ہوئے تھے۔ جس کے بعد اس نے واپسی میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"مانو! ...... تم اب بھی مجھے پہلے کی طرح چاہتی ہو ......؟"

"نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "پہلے سے تھوڑا زیادہ۔"

"پتا ہے ......؟ میں کتنا مفلس اور قلاش ہو گیا ہوں؟"

"اچھا ہے نا ......؟" اس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں بھرتی ہوئی وہ بولی۔ "دولت اور شہرت دیکھ کر خواہ مخواہ بازاری عورتیں میرے شہزادے کو الجھانے آ جاتی ہیں۔"

شبیر کو اس کم عمر لڑکی کی ذہانت پر حیرانی ہوئی کہ اس کی بے راہروی کو کس طرح غیر عورتوں کے کھاتے میں ڈال رہی تھی۔ اور اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں

تھی کہ وہ شہیر کے دل میں جاگزیں احساسِ جرم کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

"بات کو مذاق میں مت ٹالو یہ حقیقت ہے۔"

"اچھا نہیں ٹالتی مذاق میں ...... تم یہ بتاؤ کوئی سکول کیوں نہیں جوائن کر لیا۔"

"سچ بتاؤں؟"

"تو کیا مجھ سے جھوٹ بولو گے؟"

"میں ذہنی طور پر اس قابل ہی نہیں تھا کہ درس و تدریس جیسا مقدس پیشہ اختیار کر سکتا۔ اس کے ساتھ پرائیویٹ سکولوں کی تنخواہ بھی تو بہت کم تھی۔"

"خیر اب میں تجھے ڈرائیوری تو نہیں کرنے دوں گی۔"

"تو پھر ......؟ ...... کیا کروں، روڈ پر مزدوری تو مجھ سے بھی نہیں ہو سکتی۔"

"شہری! ...... دیکھو نا اتنا بڑا گھر ہے ایک پورشن میں ٹیوشن سنٹر کھول لیتے ہیں۔ بچوں کو تم پڑھانا بچیوں کو میں سنبھال لیا کروں گی۔"

"ابو جان کا بھی یہی منشا تھا مگر......"

"اگر مگر چھوڑو ...... میں آ گئی ہوں نا تیرا دماغ درست کر دوں گی۔"

"پتا ہے...... میں صبح ناشتہ کرتا ہوں اور پھر شام کا کھانا کھاتا ہوں ...... آج جناب کی آمد سے اب تک بھوکا بیٹھا ہوں۔"

"میں نے تو نہیں کہا تھا اپنی کم عمر بیوی کے لاڈ اٹھانے لگ جاؤ، کھا لیتے شام کو۔" وہ شرارت سے بولی۔

شہیر کے لبوں پر مسکراہٹ کھلتے دیکھ کر وہ دوبارہ بولی۔

"اب یہ خوشامدانہ ہنسی بند کرو لاتی ہوں کھانا...... میں بھی صبح سے بھوکی ہوں اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک دوسرے کو کھانا کھلا رہے تھے۔

☆☆☆

ٹیوشن سنٹر ان کی توقعات سے بھی زیادہ کامیاب ہوا تھا۔ ایک ماہ کے اندر انہیں اتنے شاگرد مل گئے تھے کہ انہیں مزید داخلہ بند کرنا پڑا۔ مانو کی آمد نے شہیر کا چڑچڑاپن، مایوسی، بے دلی اور ترش روئے کو بھاپ کی طرح اُڑا دیا تھا۔ اور پھر انہی دنوں سرکاری سکول سے اس کا کال لیٹر بھی آ گیا۔ اسے نوکری پر بحال کر دیا گیا تھا...... اس ضمن میں شکیل کی کوششیں قابلِ قدر تھیں...... شہیر کے مقدر کا سورج بادل سے نکل کر دوبارہ جگمگانے لگا تھا۔ ایک دن وہ عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹا تو دیکھا بیڈ کے ساتھ ہی رائٹنگ ٹیبل اور لکھائی کا سامان پڑا تھا...... ساتھ ہی ٹیبل پر چائے کا بھرا تھرماس بھی رکھا تھا۔

"یہ کیوں......؟" وہ حیرانی سے مستفسر ہوا۔

"بہت آرام کر لیا جناب۔" مانو اطمینان سے بولی۔ "اب اپنا کام شروع کر دو۔"

"مانو! ...... یقین مانو اب نہیں لکھا جاتا۔ سمجھو یہ صلاحیت ہی ختم ہو گئی ہے مجھ میں، اس دن جب تجھے اتنے عرصے بعد دیکھا تھا تو نا معلوم کیسے ایک نظم لکھ دی ورنہ تو اس طرف سوچ ہی نہیں آتی۔"

"اچھا لکھو مت...... بس یہاں بیٹھ کر ایسا پوز بنالو جیسے لکھ رہے ہو۔ اور میں تمہیں دیکھتی رہوں گی۔"

"جیسے چوڑیوں کے سیٹ میں سے دیکھا کرتی تھی ہے نا؟" شہیر نے ہنس کر کہا۔

"تو تجھے پتہ چل گیا تھا؟" مانو کے چہرے پر حیا آلود سرخی پھیل گئی۔

"تیرے جانے کے بعد پتہ چلا تھا...... اگر اس وقت پتہ چل جاتا تو تجھے گود میں اٹھا کر اندر نہ لے آتا۔"

شہیر وارفتگی سے بولا۔ "اور وہ پردہ میں نے اب

تک سنبھالا ہوا ہے۔"

"اچھا وہ وقت اب گزر گیا ہے۔ ابھی جو کہا ہے وہ کرو۔" مانو پرانے وقت کو یاد کرنے سے کترا گئی کہ دکھوں کو کریدنے سے کرب ہی ملتا ہے۔

"جو حکم سرکار......" شہیر نے کاغذ سامنے رکھ کر قلم سنبھالا اور قلم کی نب کاغذ پر رکھ کر مانو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"میں نے کہا لکھنے کا پوز بناؤ...... تم میری طرف دیکھ کر کمی کر رہے ہو۔" وہ بگڑ گئی...... اور شہیر جلدی سے سر جھکا کر کاغذ کو دیکھنے لگا...... اور اسے پتہ نہ چلا کہ کب اس کے قلم نے حرف اگلنا شروع کر دیے۔ چند لمحوں بعد وہ ماحول سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب اسے مانو نے آواز دی۔

"بس کرو نا......؟ کیا ساری رات جاگنے کا ارادہ ہے؟"

"ہونہہ......!" وہ چونک گیا...... گھڑی پر نگاہ دوڑائی تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ اپنے سامنے لکھے ہوئے کاغذوں کا انبار دیکھ کر وہ خوشی سے چلایا...... "مانو جان!...... میں لکھ سکتا ہوں۔"

"ہاں مجھے پتہ ہے...... اب سو جاؤ...... نیند آ رہی ہے۔ تمہیں سکول بھی جانا ہے صبح۔" شہیر نے سر ہلاتے ہوئے قلم رکھ دیا۔

☆☆☆

ایک سال میں اس کے تین ناول اور ایک مجموعہ کلام شائع ہو گیا تھا۔ گھر کے حالات بہتر ہو گئے تھے۔ مانو سے اس کی محبت ایک قسم کی عقیدت میں ڈھل گئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی اسے ملعون کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ شہیر کو محسوس ہو رہا تھا وہ اسے پہلے سے بھی بڑھ کر چاہنے لگی ہے۔

اتوار کی صبح وہ دیر سے ناشتہ کرتا کہ عموماً نماز پڑھ کر وہ دوبارہ سو جاتا تھا۔ اس دن اتوار ہی تھی جب ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے مانو بولی۔

"آج اخبار میں تیرے بارے بھی خبر آئی ہے؟"

"میرے بارے؟...... خدا خیر کرے کیا غلطی ہو گئی مجھ سے؟"

"سنڈے میگزین میں اداکارہ ایمان علی کے بارے ایک فیچر چھپا ہے اس میں تیرا ذکر بھی ہے۔" ایمان کے ذکر پر مانو کے لہجے میں چھپی نفرت اس سے اوجھل نہیں تھی۔

"کیا بکواس لکھی ہے انہوں نے؟" شہیر کے ذہن میں آنٹدی کی باتیں تازہ ہو گئیں کہ اداکارائیں سستی شہرت کے حصول کے لیے کس طرح کسی دوسرے کی ذات کو استعمال کرتی ہیں۔

مانو مسکرائی۔ "نہیں بات تو خیر انہوں نے بہت اچھی لکھی ہے کہ ایمان صاحبہ کی مسلسل تیسری فلم باکس آفس پر فلاپ جا رہی ہے۔ پہلی فلم کے بعد وہ کسی جاندار کریکٹر میں نمودار نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے علاوہ پہلی فلم کے مکالمے بہت جاندار تھے کہانی بھی عام ڈگر سے ہٹ کر تھی اور ایسی کہانیاں لکھنا شہیر صدیقی صاحب جیسے رائٹر ہی کا خاصا ہے۔ آپ کے ایک دم منظر سے غائب ہونے پر بھی مضمون نگار نے حیرانی کا اظہار کیا ہے۔ آخر میں اس نے ایمان علی کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ اپنا کیریئر بچانا چاہتی ہے تو اسے کسی ایسی فلم میں کام کرنا چاہیے کہ نہ صرف جس کی کہانی اچھی اور یونیک ہو بلکہ مکالمے بھی جاندار ہوں ---- ورنہ دوسری صورت میں اس پر فلاپ ہیروئن کا ٹھپہ لگنے کا اندیشہ ہے۔ اور ایسا ہونے کی صورت میں اس کے پاس شوبز کی دنیا کو خیرباد کہنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں بچے گا۔"

شہیر خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ اس نے تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

"شہری ایک بات کہوں؟" بانو کے سنجیدہ لہجے پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اور بولا۔

"کبھی منع کیا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے ایک بار پھر تجھے فلمی دنیا سے بلاوا آنے والا ہے۔" بانو کے لہجے میں پنہاں اندیشے اسے حیران کر گئے۔

"تو......؟" اس نے بانو کا عندیہ لینا ضروری سمجھا۔

"تو یہ کہ مجھے نہ تو کوٹھی بنگلے کی خواہش ہے اور نہ قیمتی گاڑی کی تمنا۔ روکھی سوکھی کھا لوں گی پھٹا پرانا پہن لوں گی...... لیکن نہ تو تجھے شیئر کر سکتی ہوں اور نہ تیرے بن رہ ہی سکتی ہوں۔" شہیر کو بانو کے پہلے والے اندیشے یاد آ گئے جب وہ اس کے فلمی دنیا میں جانے پر بالکل ناخوش تھی مگر وہ اچھے مستقبل کے لیے بھاگ گیا تھا اور وہاں جا کر اسے سوائے شرمندگی، ذلت اور افلاس کے کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ناشتے کی ٹرے ایک طرف لڑھکا کر وہ اٹھا اور بانو کے کندھوں سے تھامتے ہوئے وارفتگی سے بولا۔

"یہ گھر کسی کوٹھی بنگلے سے کم نہیں ہے۔ قیمتی گاڑی بھی آ جائے گی...... اچھا کھلاؤں گا اچھا پہناؤں گا اور فلمی دنیا تو چھوڑو، تم جس بات سے منع کرو گی بے چوں و چرا اس تسلیم کروں گا......؟"

"اور اگر ایمان صاحبہ خود تجھے منانے آ گئیں پھر؟"

"ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔" اس کے ذہن میں ایمان کا استہزائی چہرہ ابھرا۔

"ہم فرض کر لیتے ہیں؟" بانو بضد ہوئی۔

"شاید میں جواب دے چکا ہوں۔"

"کیا......؟"

"کہا تو ہے ماہ نور کی ماں کا حکم چلے گا۔" شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پہلی غلطی بھولی نہیں ہے مجھے۔"

"اچھا پتا ہے ابھی جو فیچر آپ کو پڑھ کر سنایا ہے یہ پچھلے ہفتے کے سنڈے میگزین میں چھپا تھا۔"

"کیوں آج نظر پڑی ہے اس پر؟"

"نہیں پچھلے ہفتے ہی پڑھ لیا تھا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"تو آج اس کا ذکر چھیڑنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"کیونکہ آج آپ کا ایک خصوصی مہمان آیا ہوا ہے۔" بانو نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

"کون ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "اور پہلے بتانا تھا نا۔ خواہ مخواہ غریب کو انتظار کی زحمت دی۔"

"ایمان علی صاحبہ ہیں۔ پچھلے دو گھنٹے سے براجمان ہیں...... 9 بجے آئی تھی، میں نے بتا دیا صاحب جی آرام فرما رہے ہیں بعد میں تشریف لے آؤ، تو کہنے لگی یہیں انتظار کر لوں گی۔ چائے پلا دی ہے...... شیلف سے آپ کا نیا ناول لے کر مزے سے مطالعہ فرما رہی ہے۔"

"جاؤ...... اسے بتا دو میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔"

"کیوں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے کیا؟" بانو نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں...... میں نہیں چاہتا کوئی بدمزگی پھیلے، گھر میں آئے مہمان کو بے عزت کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔"

"اس سے ملاقات نہ کرنا کیا بے عزتی کے زمرے میں نہیں آتا۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟" شہیر نے زچ ہو کر پوچھا۔

"میں یہ چاہتی ہوں کہ تیری محبت اور تیری ناراضی کی حق دار صرف میں ہوں۔" بانو نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "میں کبھی بھی یہ بات برداشت نہیں کروں گی کہ تم کسی اور سے خفا رہو۔ یاد رکھو خفا صرف اپنوں

سے ہوا جاتا ہے اور تیری اپنی صرف مانو ہے۔ تیری ماہ نور کی ماں مجھے۔"

مانو کے فلسفے نے اسے حیران کر دیا تھا۔ پہلی بار اس پر یہ کھلا کہ کسی سے خفا ہونا بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہوتا ہے...... مانو کا فلسفہ سمجھنے کے باوجود وہ بولا۔

"اس نے بھی تو مجھے ملنے سے انکار کیا تھا...... میں بھی اس کے گھر چل کر گیا تھا۔"

"وہ رویہ ایسی عورتوں کی نفسیات ہوتا ہے...... اور یاد رکھنا بدلہ برابر کی سطح والوں سے لیا جاتا ہے، کمتر کو معاف کر دینا چاہیے۔"

"صحیح کہا...... جیسے تم نے مجھے معاف کر دیا۔" شہیر نے آہستہ سے کہا۔

"شہری......" مانو کے لہجے میں دکھ، غم، احتجاج، ناراضی اور پتا نہیں کیا کیا شامل تھا۔ "میں نے، میں نے کب ایسا کیا ہے۔ مجھے تو ہزاروں گلے لاکھوں شکوے تھے۔ مگر ڈرتی تھی۔ تو انا پرست تھا خوددار تھا حساس تھا۔ شاید خود کو نقصان پہنچا لیتا...... میں کیسے تیرا نقصان گوارا کرتی......؟ کیسے ہمیشہ کی جدائی برداشت کرتی...... بتاؤ نا؟ کیسے کرتی...... یہ بھی تو سوچ اپنوں اور غیروں سے تعلقات کی نوعیت جدا ہوتی ہے...... پھر تم اپنے سٹیٹس سے گر کر نیچے آ گئے تھے یہاں تک کہ ٹیکسی ڈرائیور بننے پر مجبور ہو گئے کیا میں اتنی کم ظرف تھی کہ تمہیں طعنہ دیتی، اپنے سر کے سائیں سر کے تاج کو۔ جب ناراض ہونے کا وقت تھا میں نے صبح کا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور رات کو ہی تیرا گھر چھوڑ دیا تھا...... بعد ازاں اگر تیری دولت و شہرت میں اضافہ ہوا ہوتا تو شاید مانو گھٹ گھٹ کے مر جاتی تیرے پاس نہ آتی...... اب تو تجھے میری ضرورت تھی میں تجھے کیسے اکیلا چھوڑتی۔" مانو کی آنکھوں میں تیرتی نمی نے اسے تڑپا دیا تھا۔ وہ اسے گلے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"پگلی مذاق کر رہا تھا تم تو سنجیدہ ہو گئیں۔"

"آئندہ ایسی بکواس نہ کرنا...... ورنہ اتنے طعنے دوں گی کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔"

"میری توبہ جی......" شہیر نے کانوں کو ہاتھ لگایا ...... اچھا اب چلو نا؟ تیری دوست سے مل لیں۔"

"میری موجودگی میں کھل کر بات نہیں کر سکے گی؟"

"تو نہ کر سکے۔"

"نہیں تم اکیلے جاؤ...... میں نہیں جاؤں گی۔"

اور شہیر سر ہلاتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

وہ نہایت سادہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ سر پر دوپٹہ بھی اوڑھ رکھا تھا۔ شہیر اس کا لباس دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا مگر اپنا چہرہ اس نے ہر قسم کے تاثر سے خالی رکھا۔ وہ شہیر کے نئے ناول کے مطالعے میں کھوئی تھی اس کے قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھایا اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو پلیز......" اسے بیٹھنے کا کہہ کر شہیر نے اس کے سامنے نشست سنبھال لی۔

"تھینکس جی۔" وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ ناول اس نے گود میں رکھ لیا تھا۔

"فرمائیں......؟" شہیر کے لہجے میں گہری اجنبیت تھی۔

چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"شرمندہ ہوں...... مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، نادانگی میں ہیرا ملک کوہ نور ہیرا اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھی...... پچھتاوں کی آگ میں جل رہی ہوں......"

"اٹس او کے محترمہ!...... جو ہوا اسے بھول جاؤ۔" اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

"سر جی!...... آپ کی خفگی جائز ہے۔ آپ کا گلہ بجا ہے......"

"میں نہ خفا ہوں اور نہ کوئی گلہ ہی کیا ہے۔ اور نہ اس کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔"

"سر غزالہ باجی نے مجھے غلط گائیڈ کیا میں اس کی باتوں میں آ گئی تھی۔"

"جب کہہ دیا کہ جو ہوا اُسے بھول جاؤ...... میں نے معاف کر دیا وہ سب، اب اس کے علاوہ کچھ کہنا ہے تو فرمائیں۔"

"سر میں قلمی دنیا کو خیر باد کہنا چاہتی ہوں۔"

"مشکل کیا ہے......؟ کسی نے باندھا ہوا تو ہے نہیں۔ چھوڑ دو۔"

"سر کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے سچ مچ اپنا لیں...... اپنی عزت بنا لیں۔"

اس کی آفر نے شبیر کو ششدر کر دیا تھا...... مگر اس کی حیرانی زیادہ دیر برقرار رہی اور وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا...... "تجھے کئی ایسے حمول اور بااثر مرد مل جائیں گے جو تجھے خوشی سے اپنا لیں گے۔"

"مگر میں اس دل کا کیا کروں جو صرف شبیر جی کے لیے دھڑکتا ہے۔"

شبیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا...... "ٹھیک ہے، اگر آپ کو میری دوسری بیوی بننا منظور ہے تو بسر و چشم۔"

شبیر کا اعتماد بھرا لہجہ سن کر اس کی آنکھوں میں اضطراب کی لہریں اٹھیں۔ نظریں جھکا کر اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر لجا کر بولی۔

"شبیر جی!...... میں شاید اپنی سوکن برداشت نہ کر سکوں۔"

"کوئی بات نہیں...... تم شادی کر لو مجھ سے میں وعدہ کرتا ہوں پہلی بیوی کو علیحدہ کر دوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"مم...... میں امی ابو سے مشورہ کر لوں پھر آپ کو بتاؤں گی۔" اس مرتبہ وہ گھبراہٹ سے گڑبڑا گئی تھی۔

"آفر کرتے وقت والدین یاد نہیں تھے؟"

"مجھے کیا معلوم تھا آپ اب تک مجھے اسی طرح چاہتے ہیں؟" وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

"چاہت کبھی ختم نہیں ہوا کرتی۔"

"صحیح کہا جی...... تو آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں۔" اس نے دعوت دینے والے انداز میں پوچھا۔

"شام کو...... میں کیا کر رہا ہوں......؟ ٹھہرو پوچھ لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بانو کو آواز دی۔

"بیگم...... ارے او بیگم...... اجی ماہ نور کی ماں۔"

بانو جو لامحالہ ان کی باتوں پر کان لگائے ہوئے تھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

"جی فرمائیں۔"

"وہ پوچھنا یہ تھا کہ آج شام کو میں کیا کر رہا ہوں۔"

"کیوں......؟"

"ایمان علی صاحبہ پوچھ رہی تھیں۔"

اور پھر بانو کے کچھ کہنے سے پہلے وہ گھبرا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"سر!...... میں ابھی چلوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

شبیر نے اسے آواز دی۔

"مس ایمان......"

"جی سر!" وہ رکتے ہوئے مڑی۔

"تائی صاحبہ سے عرض کر دیجیے گا کہ یہ ڈرامے کسی اور کے لیے ترتیب دے...... مجھے اپنی حیثیت کا پتہ ہے...... اور یہ بھی کہہ دینا کہ تیرے بجائے اگر وہ مس یونیورس کو بھی بھیجتی تو مجھے اس غلاظت اور ان کانٹوں میں نہیں گھسیٹ سکتی تھی۔ جس سے میری بانو مجھے نکال کے لے آئی ہے...... اب میں بکاؤ نہیں رہا کسی کی ملکیت ہوں۔"

اس بار اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ایمان وہاں سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی مانو نے آنکھیں نکالیں۔

"کیا بکواس کر رہے تھے..... دوسری شادی کرو گے؟ اور پھر پہلی بیوی کو چھوڑ دو گے بہت شوق ہے دوسری شادی کا؟"

"ہا..... ہا" شمیر نے قہقہہ لگایا۔

"بکی بکی تکمی نہ کرو..... جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

"مانو پتا ہے یہ کس لیے آئی تھی؟" اور پھر مانو کی سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ "یہ تجدید تعلق کے لیے آئی تھی ...... اور خود کو بطور رشوت پیش کرنے آئی تھی۔ کیونکہ یہ اچھی طرح جانتی ہے میں بہت سستا ہوں بالکل ہی بے قیمت ...... مگر یہ بات اسے پتا نہیں تھی کہ میں جس کی ملکیت ہوں وہ اس بے حیثیت شخص کو کتنا سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے۔"

"ڈائیلاگ بازی چھوڑو اور یہ بتاؤ تم نے اس کی شادی کی پیش کش کیوں قبول کی؟"

"کیونکہ میں جانتا تھا وہ ڈرامہ کر رہی ہے مجھے اپنی چاہت کا یقین دلانے کے لیے۔ اس کا خیال تھا میں شادی کے بجائے وہی پہلے والے گھٹیا تعلقات کی بحالی پر زور دوں گا جس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار ہو کے آئی تھی۔ لیکن میں نے اس کی سوچ کے برعکس شادی کے لیے ہاں کر دی اس نے پینترہ بدل کر سوکن کا رونا رویا..... اس کی وہ شرط بھی میں نے بے چوں و چرا قبول کر لی..... نتیجتاً اسے والدین کی اجازت کا بہانہ کرنا پڑا..... اور پھر خود ہی شام کی مصروفیات کا پوچھ کر گویا میرے ذہن میں پرانے غلیظ تعلقات کو اجاگر کرنا چاہا۔ پھر وہی روز و شب کی قربتیں اور وصال کے مزے شمیر صاحب کے منتظر تھے مگر افسوس بی مانو کے رعب نے

اسے محروم کردیا۔"

"شہری ایک بات پوچھوں...... خفا تو نہیں ہو گے؟" مانو ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔

"خفا ہو بھی جاؤں تو کیا کرلوں گا۔" شہیر شرارت سے باز نہ آیا۔

"پلیز شہری!...... میں سنجیدہ ہوں؟"

"پوچھو...... نہیں ہوتا ناراض۔"

"کیا پہلے میری محبت میں کمی دیکھی تھی کہ دوسری عورتوں کے چکر میں پڑ گئے تھے؟"

شہیر کے چہرے پر اذیت بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔ "مجھے ڈر تھا تم کچھ ایسا ہی پوچھو گی۔"

"برا لگا ہے تو جواب نہ دو۔" مانو سے اس کا زخمی لہجہ برداشت نہ ہوا۔

"نہیں مانو...... یہ وہ سوال ہے جس سے میں ڈرتا بھی تھا اور اس کا منتظر بھی تھا اور یہی وہ سوال ہے جسے گزشتہ دو سالوں سے میں بڑی شدت سے سوچتا رہا ہوں...... تم کل بھی میری محبت، چاہت اور خواہش تھیں آج بھی ہو اور ان شاء اللہ آئندہ بھی رہو گی۔ مگر یہ حضرت انسان جو ہے نا بڑا ناشکرا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کی قدر نہیں کرتا۔ لیکن جب کوئی نعمت چھن جاتی ہے تب اسے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نعمت کتنی اہم اور ضروری تھی مگر یہ بھی قانون فطرت ہے کہ چھنی گئی نعمت واپس نہیں ملتی...... نہ گئی جوانی لوٹتی ہے نہ اندھے کو بینائی ملتی ہے۔ ذیابیطس کے مریض کے لیے میٹھا حسرت بن جاتا ہے اور بلڈ پریشر کا مریض نمک کو ترستا ہے...... میں نے بھی نفسانی خواہشات کی پیروی کر کے تم جیسی محبت کرنے والی لڑکی کو گنوا دیا تھا...... اور تیرے جانے کے بعد مجھے تیری محبت کی قدر آئی پر اس وقت پانی سر سے بلند ہو گیا تھا...... اور شاید میں اسی طرح گھٹ گھٹ کے مر جاتا...... تمہاری یاد ایک ناکام حسرت کی صورت پہلو میں دبی رہتی...... مگر ایسا نہ ہوا۔ تم واپس آگئیں، تم نے مجھے ساری خامیوں، کجیوں اور کمزوریوں سمیت قبول کر لیا...... کیوں......؟ اس کیوں کا جواب یقیناً یہی ہے کہ تم اپنی محبت کو پانے کے لیے لوٹی تھیں۔ تم ایک بے وفا سے کیے گئے عہد کو نہ توڑ سکیں...... وہ شخص جس نے تیرے مان کا کوئی پاس نہ رکھا، جس نے تجھے ایک بازاری عورت کے سامنے شرمندہ کیا...... جھوٹی سی شہرت اور چند ٹکوں کے بل پر تیری سچی و کھری محبت کا مذاق اڑایا...... وہی بے وقوف اور جاہل جب بکھرا تو اسے سمیٹنے کے لیے تو نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں ضائع نہ کیا۔ مانو تم واقعی وفا کی پتلی ہو۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ عورت کا خمیر ہی وفا کی مٹی سے گوندھا گیا ہے اس کی زندہ مثال ہو تم۔"

"یہ کسی نئے ناول کے ڈائیلاگ ہوں گے ہے نا؟" وہ خوابناک لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"ہاں مانو!...... سچ کہا تو نے اور پتا ہے ناول کا نام کیا ہے؟"

"کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

شہیر نے کہا۔ "وفا ہے ذات عورت کی۔"

"اب بس بھی کرو۔" مانو بڑے فخر، مان اور چاہت سے مسکرائی۔ "اور جاؤ ماہ نور جاگ گئی ہے...... اتوار کے دن اسے سنبھالنا تیری ذمہ داری ہے...... یاد ہے نا شادی سے پہلے ہی ہم نے یہ طے کیا تھا کہ اتوار کے دن بچوں کو آپ سنبھالیں گے۔"

شہیر موبائل نکالتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے مس ایمان علی کو ہی بلا لیتا ہوں وہ لازماً اتوار کے دن میری ذمہ داری میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہو جائیں گی۔"

"شرم تو نہیں آتی ہوگی......" اسے گھورتے ہوئے مانو شور مچاتی ماہ نور کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ شہیر سرشاری سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ (ختم شد)

* * *

"یہ لوگ میرے پاس کاروں پر سوار ہو کر آتے ہیں اور ان کی واپسی پیدل ہوتی ہے..... ہیں نا الو کے پٹھے!"

الو کے پٹھے

عبدالحفیظ بشر

چوہدری محمد دین کی مین بازار میں کریانے کی دکان تھی جہاں تھوک و پرچون دونوں طرح سامان ملتا تھا۔ شہر کے چھوٹے دکاندار اور ارد گرد دیہات کے دکاندار اپنی ضرورت کے لیے وہاں سے سودا خریدتے تھے۔ پرچون کے گاہک بھی دور دور سے ضروریات زندگی وہاں سے لینے آتے تھے جو انہیں دیگر دکانوں کی نسبت سستی مل جاتی تھیں۔ اس دکان کی وجہ سے ان کے گھر میں خاصی خوشحالی تھی۔

اولاد میں ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ بیٹی اور بڑے بیٹے کی شادی ہو چکی تھی اور دونوں خوشگوار زندگی

گزار رہے تھے۔ چھوٹا بیٹا عدنان ابھی پڑھ رہا تھا۔ اس نے ایف ایس سی کا امتحان پاس کر لیا تھا مگر بدقسمتی سے نمبر کم ہونے کی وجہ سے اسے میڈیکل کالج میں داخلہ نہ مل سکا۔ عدنان ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن اس کی قسمت میں نہ تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان جو منصوبہ بندی کرے، اس میں کامیاب بھی ہو۔ کچھ فیصلے انسان نہیں کرتا، تقدیر کرتی ہے یعنی تدبیر پر تقدیر حاوی ہے۔ کچھ لوگ اس مقولے کو نہیں مانتے اور ان کا کہنا ہے کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ بہرحال اپنی اپنی سوچ ہے۔

عدنان میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملنے پر بڑا دلبرداشتہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس ناکامی کا بڑا صدمہ لیا تھا اور ڈپریشن میں رہنے لگا تھا۔ اس کو ذہنی پر مصروف کرنے کے لیے باپ نے اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیا۔ اس کا بڑا بھائی پہلے ہی باپ کے ساتھ کام کرتا تھا عدنان نے کچھ عرصہ تو دکان پر کام کیا لیکن پھر جلد ہی اس کام سے اکتا گیا۔ اس کا ذہن آٹے، دال چاول وغیرہ کے کام کو قبول ہی نہیں کرتا تھا۔

اس نے باپ سے کہا کہ وہ ڈاکٹر تو نہ بن سکا لیکن وہ میڈیکل کی فیلڈ سے متعلقہ کام ہی کرنا چاہتا ہے اور میڈیکل سٹور کھولنا چاہتا ہے جہاں وہ باپ کی طرح تھوک و پرچون ادویات کی خرید و فروخت کر سکے۔ چوہدری محمد دین کو عدنان کا مشورہ پسند آیا لیکن اس کاروبار کے لیے ایک بڑی رقم درکار تھی اور وہ اپنے چلتے کاروبار سے یکمشت اتنی بڑی رقم نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

محمد دین یوں تو چٹا اَن پڑھ تھا لیکن کاروباری رموز اور داؤ پیچ کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے اچھے وقتوں میں گورنمنٹ کی رہائشی سکیم میں دو پلاٹ خرید رکھے تھے۔ نظریہ ضرورت کے تحت اس نے یہ دونوں پلاٹ فروخت کر دیئے اور اسے ایک کروڑ پچیس لاکھ کی رقم مل گئی۔ اس نے 25 لاکھ کی رقم اپنی بیٹی کو دے دی اور پچاس پچاس لاکھ دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم کر دی کہ وہ اپنی صوابدید پر اس کا استعمال کریں۔ بڑے بیٹے نے اپنی رقم بنک میں جمع کرا دی جبکہ عدنان اپنے پروگرام کے مطابق کاروبار کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

پچاس لاکھ کی خطیر رقم دیکھ کر اس کو لگا کہ قارون کا خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔ اب اس کی سوچ و فکر میں تبدیلی آنے لگی۔ اس نے سب سے پہلے پانچ لاکھ کی ایک نئی کار خریدی اور اس پر اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ جب اس کے دوستوں نے اس کی نئی گاڑی دیکھی اور یہ پتا چلا کہ عدنان کے پاس اچھی خاصی رقم بھی ہے تو وہ اس کے چمچے بن گئے اور اس سے عیش موج کرنے لگے۔ عدنان ابھی نوجوانی کی عمر میں تھا جہاں عقل سے زیادہ جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ عیش و عشرت میں پڑ گیا۔

دوستوں کے ساتھ ہلہ گلہ کرنا۔ رات کو مہنگے مہنگے ہوٹلوں میں کھانا۔ پھر ایک دن اس کے دوست اسے اسٹیج ڈرامہ دیکھنے لے گئے۔ انہوں نے سب سے مہنگی ٹکٹ لی اور اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے جہاں پر عیاش کاروباری لوگ بیٹھے تھے۔ اس سٹیج ڈرامے میں ڈرامہ کم تھا اور فحاشی زیادہ تھی۔ ناچنے والیاں اپنے جسمانی خطوط کی نمائش بڑی بے حیائی سے اگلی سیٹوں والوں کے سامنے آ آ کر کر رہی تھیں۔ ان میں ایک بڑی ہی شوخ و چنچل اداکارہ پروین بھی تھی۔ اس کے دلکش جسمانی خطوط اور سانچے میں ڈھلا سنہری بدن عدنان جیسے نوجوان کو گھائل کر گیا اور وہ اس کا دیوانہ ہو گیا۔ اب وہ باقاعدگی سے ہر وہ سٹیج ڈرامہ دیکھنے جاتا جس میں پروین کام کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ سٹیج کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرامہ دیکھتا تھا۔

ادھر چوہدری محمد دین عدنان کی سرگرمیوں سے کچھ پریشان تھا۔ وہ جب بھی عدنان سے کاروبار کے متعلق پوچھتا تو وہ یہ کہہ کر باپ کو ٹال دیتا کہ ابھی اسے

مارکیٹ میں کوئی معقول دکان نہیں مل رہی اور یہ کہ وہ ابھی اس فیلڈ کا تجربہ حاصل کر رہا ہے اور جلد ہی وہ کاروبار شروع کر دے گا۔

کاروبار اس نے کیا کرنا، وہ پروین کے حسن کے جلوؤں میں کھو کر اپنا آپ بھی بھول چکا تھا۔ انہی دنوں میں یکدم چوہدری محمد دین کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ علاج سے وقتی طور پر اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ مگر ڈاکٹروں نے اسے چھٹی نہ دی تھی کیونکہ اس کی حالت تسلی بخش نہ تھی۔ پھر چند دنوں بعد اسے دل کا ایک اور دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا اور ہسپتال میں ہی دم توڑ دیا۔

وقتی طور پر تو سب بڑے پریشان ہوئے لیکن پھر وقت گزرنے کے ساتھ زندگی اپنی پرانی ڈگر پر واپس آنے لگی۔ اب عدنان کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ باپ کا ڈر تھا وہ بھی نہ رہا۔ اس نے وہی پرانے طور طریقے اپنا لیے تھے۔ بڑے بھائی نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر کام کرے مگر عدنان نے کہا کہ وہ دکان پر کام نہیں کر سکتا۔ اس کے بڑے بھائی نے دکان اپنے قبضے میں لے لی اور حساب کر کے اسے دکان میں سے حصہ نقد رقم کی صورت میں دے دیا۔ اب وراثت میں ایک مکان بچا تھا جس میں یہ خاندان رہ رہا تھا۔

اب عدنان کے پاس ایک معقول رقم تھی اور اس کی نگاہ کا محور و مرکز صرف اور صرف پروین کی ذات تھی۔ اسے سوتے جاگتے پروین کے خواب نظر آنے لگے تھے۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ پروین کے ساتھ شادی کرے گا۔ دوستوں نے مذاق میں اس کا نام مجنوں رکھ دیا تھا اور پروین کا لیلیٰ۔

پروین بڑی چالاک لڑکی تھی۔ اس کا کام ہی مالدار لوگوں کو پھانس کر ان سے قیمتی تحفے تحائف لینا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ عدنان باقاعدگی سے آتا ہے اور فٹ ہو جانے والی نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔

عدنان اکثر اس پر نوٹوں کی بارش بھی کرتا رہتا تھا۔ اب اکثر ایسا ہونے لگا کہ پروین رقص کے دوران عدنان کو دیکھ کر مسکراتی یا کوئی ایسا شوخ اشارہ کر دیتی کہ وہ گھائل ہو کر رہ جاتا۔ بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی اور اسے ایسا لگنے لگا کہ اگر اسے پروین نہ ملی تو وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ ایک دن جب پروین شو ختم ہونے کے بعد اپنی کار میں بیٹھنے لگی تو اسے اس کے چاہنے والوں نے گھیر لیا۔ عدنان بھی جرأت کر کے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے پاس جا پہنچا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کو دینے کی کوشش کی۔ پروین نے اسے آنکھوں کے اشارے سے کہا کہ یہ کارڈ وہ اس کے ڈرائیور کو دے دے۔

ڈرائیور پہلے سے تربیت یافتہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے مالدار لوگوں سے کیسے رویہ رکھنا ہے۔ اس نے لپک کر عدنان سے کارڈ پکڑ لیا اور اسے تسلی دی کہ اس کا کارڈ میڈم تک پہنچ جائے گا۔ عدنان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ڈرائیور اس کے دلال کا رول بھی ادا کرتا ہے۔

جب پروین کی کار وہاں سے روانہ ہوئی تو عدنان کچھ آگے کھڑا اسے بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پروین نے اسے نظریں جھکا کر سلام کیا تو عدنان کی دھڑکنیں بے قابو ہو گئیں۔ اس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ اس ہاتھ میں عدنان کا کارڈ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ پوری رات عدنان سو نہ سکا اور ہر لمحہ پروین کے فون کا انتظار کرتا رہا مگر پروین ایک منجھی ہوئی شکاری تھی اور اپنے عاشقوں کو تڑپانا جانتی تھی۔

اگلے دن دوپہر کے وقت عدنان کے موبائل پر رنگ ٹون ابھری تو اس نے لپک کر فون اٹینڈ کیا۔ پروین کی آواز سن کر وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ رسمی ہیلو ہائے کے بعد پروین نے ایک ماہر مکڑی کی طرح اپنے

شکار کے گرد جال پھیلانا شروع کر دیا۔
"مجھے آپ کا کارڈ مل گیا مسٹر عدنان!" اس نے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔ "کہیے، کیا بات ہے؟"
"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" عدنان نے دھڑکتے دل سے کہا۔
"کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" پروین نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"
"آپ کو اندازہ نہیں؟" عدنان نے جواباً سوال کر دیا۔
"نہیں، اگر ہوتا تو یہ سوال کیوں کرتی؟" پروین نے تجاہلِ عارفانہ سے کہا۔
"حیرت ہے۔" عدنان نے کہا۔ "میں تو ایک عرصے سے آپ کی محبت میں پاگل ہوں اور میرا خیال تھا کہ آپ بھی مجھے چاہتی ہیں مگر آج مجھے لگ رہا ہے کہ میری محبت یکطرفہ ہے۔ کاش! آپ میری محبت کی گہرائی کا اندازہ لگا سکتیں۔"
"مگر میں محبت پر یقین نہیں رکھتی۔" پروین نے چال اور آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جس فیلڈ میں میں ہوں یہاں محبت کا لفظ صرف دھوکا ہے۔ یہاں صرف بھنورے آتے ہیں جو پھولوں اور کلیوں سے رس چوس کے غائب ہو جاتے ہیں۔ محبت کا نام یونہی بدنام کیا ہوا ہے۔"
"سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے میڈم پروین!" عدنان نے پروین کی توقع کے مطابق کہا۔ "میں تو آپ سے سچی محبت کرتا ہوں...... تم بہت خوبصورت ہو لیکن میں تمہارے جسم کی بجائے روح سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے آزما کر دیکھ لو۔"
"سب کچھ جسم ہے مسٹر عدنان!" پروین نے کہا۔ "اگر میرا جسم خوبصورت نہ ہوتا تو میں دیکھتی کون مجھے پیار کرتا ہے۔ روح کو کس نے دیکھا ہے؟ یہ سب محض لفظی باتیں ہیں۔ میں نے بڑے دھوکے کھائے ہیں۔ میں ایک خاندانی لڑکی ہوں اور بڑی مجبوری کی حالت میں شوبز میں آئی ہوں۔ یہاں سوائے دھوکے اور فریب کے کچھ نہیں دیکھا...... میرا یہاں سے دل بھر گیا ہے۔ تم میرا خیال چھوڑ دو اور کسی ایسی لڑکی کو تلاش کرو جو وقتی طور پر تمہارا دل بہلا سکے۔"
"ایسا مت کہو پروین!" عدنان نے حسبِ توقع جذباتی ہو کر کہا۔ "میں ہر آزمائش پر پورا اتروں گا۔ میں نے تمہارے علاوہ کسی کو نہیں چاہا۔ تم میری پہلی اور آخری پسند ہو۔ میں دل بہلانے کے لیے نہیں بلکہ زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔"
"یہ ممکن نہیں عدنان!" پروین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ "کل کو تمہارے گھر والے اور عزیز واقارب مجھے یہ کہہ کر عزت نہیں دیں گے کہ میں ایک اداکارہ ہوں۔ پھر تمہارا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا تو ان کے کہنے پر مجھے طلاق دے دو گے...... تب میں کہاں جاؤں گی۔"
"میں خود مختار ہوں پروین!" عدنان نے کہا۔ "اور مجھے پوچھنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔"
"میرا دل نہیں مانتا۔" پروین نے عدنان کی آتشِ شوق بھڑکانے کے لیے کہا۔
"ایک بات یاد رکھو پروین!" عدنان نے کہا۔ "اگر تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔"
"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" پروین نے غصے سے کہا۔ "میں اتنی کمزور نہیں ہوں...... کیا کر لو گے تم؟"
"میں تمہیں دھمکی نہیں دے رہا۔" عدنان نے فوراً وضاحت کی۔ "میں اپنے انجام کی بات کر رہا ہوں۔"
"کیسا انجام؟"
"میں ...... میں خودکشی کر لوں گا۔" عدنان نے جذباتی انداز میں کہا۔ "تمہاری گاڑی کے سامنے اپنے آپ کو آگ لگا لوں گا اور اس کا الزام تم پر آئے گا۔"

"خودکشی کرنا کوئی بہادری نہیں۔" پروین نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ بزدلی ہے، تم مردوں والا کام کرو۔"

"میں نے مردوں کی طرح تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔" عدنان نے کہا۔ "تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"تم پر یقین کر لینے کو دل چاہتا ہے۔" پروین نے کہا۔ "مگر مجھے سوچنے کے لیے وقت تو دو۔"

"ٹھیک ہے، تم کل تک سوچ لو۔" عدنان نے کہا۔ "ویسے تمہاری رہائش کہاں ہے؟"

"میں اقبال ٹاؤن میں رہتی ہوں۔"

"کوٹھی اور بلاک؟" عدنان نے پوچھا۔

"وقت آنے پر بتاؤں گی۔" پروین نے ایک خاص ادا سے کہا اور عدنان جی جان سے اس ادا پر قربان ہو گیا۔

پروین کی اصل جڑیں تو ہیرامنڈی میں تھیں لیکن جب سے بہ ظاہر "عزت دار" لوگوں نے وہاں کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا جب سے طوائفوں اور ان کے دلالوں نے پوش علاقوں میں کرائے پر کوٹھیاں لے کر جسم فروشی کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح وہ لوگوں کو شریف اور صاف ستھری لڑکیوں کا فریب دے کر دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگے تھے۔ اس طرح ہیرامنڈی کا گند ایک محدود جگہ سے نکل کر پورے شہر کے گلی محلوں میں پھیل گیا تھا۔ پہلے جس نے گند کھانا ہوتا تھا وہی اس مخصوص علاقے میں جاتا تھا، اب یہ گند وہاں سے نکل کر ہر کسی کے منہ لگنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگلے دن پروین نے عدنان کو فون کر کے مال روڈ پر "سیلویں" میں بلا لیا۔ سہ پہر 4 بجے کا وقت تھا جب عدنان قیمتی سوٹ پہن کر، امپورٹڈ پرفیوم میں مہکتا حسن کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنی محبوبہ کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایک قیمتی گھڑی اور سونے کا نیکلس گفٹ پیک کرا لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی پروین نیلی ساڑھی میں قیامت ڈھاتی اندر داخل ہوئی۔ اس کے سیاہ گھنے بال لہرا رہے تھے اور اس کا چہرہ ایسے چمک رہا تھا جیسے گھٹاؤں سے چاند نکل رہا ہو۔ ساڑھی میں اس کا گورا بدن یوں نظر آ رہا تھا جیسے چاندی پگھل کر بدن کے سانچے میں ڈھل گئی ہو۔ عدنان تو پہلے ہی مجنوں تھا، حسن کا یہ جلوہ دیکھ کر اس کا دل حسن کی دیوی کے قدموں میں سجدہ ریز ہو گیا۔

پروین کو اپنے حسن کی جادو کاریوں کا اندازہ تھا کہ اس نے عدنان کو چاروں شانے چت کر دیا ہے۔ عدنان نے کھڑا ہو کر اس کا استقبال کیا۔ ہیلو ہائے کے بعد دونوں نے آئس کریم کا آرڈر دیا اور باتیں کرنے لگے۔

"اب کہو، کیوں بلایا ہے مجھے؟" پروین نے مستی بھری آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر پوچھا۔

"بلایا تو تم نے ہے مجھے فون کر کے۔" عدنان نے شرارت سے کہا۔

"ٹھیک کہا۔" پروین نے کہا۔ "مگر یہ تمہاری خواہش تھی جو میں نے پوری کی ہے۔"

"میری خواہش کا اتنا خیال ہے؟" عدنان نے اس کے الفاظ کی گرفت کرتے ہوئے کہا۔ "تو میری اصل خواہش پوری کر دیں۔"

"تم باتیں بڑی اچھی کرتے ہو۔" پروین نے مسکرا کر کہا۔ "پڑھے لکھے لگتے ہو۔"

"تمہارا کیا خیال تھا کہ میں جاہل اور اجڈ ہوں؟"

"نہیں، تم بہت اچھے انسان ہو۔" پروین نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو میری طرف سے معمولی سا تحفہ قبول کرو۔" عدنان نے اسے نیکلس اور گھڑی دیتے ہوئے کہا۔ پروین نے فوراً دو تحفے قبول کر لیے جیسے اسی انتظار میں ہو۔ پھر اس نے نیکلس نکال کر اپنی لیبڑی

گردن میں پہن لیا۔

"کیسی لگتی ہوں؟" اس نے اک ادا سے پوچھا۔

"نور جہاں!" عدنان نے بے اختیار کہا۔ "تمہارا نام پروین نہیں، نور جہاں ہونا چاہیے تھا۔ جب تم میری بیوی بن جاؤ گی تو میں تمہارا نام نور جہاں رکھ دوں گا۔"

"لگتا ہے تم نے مجھ سے شادی کا تہیہ کر رکھا ہے۔" پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم تیار ہو نور جہاں بننے کے لیے؟" عدنان نے اپنے مطلب کی بات کی۔

"نہیں میں ابھی شادی نکاح کرنے کا اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی...... میری کچھ اپنی مجبوریاں بھی ہیں۔" پروین نے کہا۔

"کون سی، مجبوریاں اس فیصلے میں حائل ہیں۔ کچھ تو ہمیں بھی پتہ چلے...... ہو سکتا ہے دونوں مل بیٹھ کر اس مسئلے کا حل نکال سکیں۔" عدنان نے کہا۔

"میری شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ میرے والدین ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ میری شادی ان کی مرضی اور رضا سے ہو گی۔ لیکن میں اپنے فیصلے کو زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں نے گزارنی ہے میرے والدین نے نہیں دوسرا ہمارا مذہب بھی تو یہ کہتا ہے کہ لڑکی کی رضا شادی میں بہت ضروری ہے اب اگر میں اپنی مرضی سے شادی کرتی ہوں تو گھر والے مجھے جائیداد سے بے دخل کر دیں گے...... اس صورت میں مجھے سر چھپانے کے لیے جگہ بھی نہیں ملے گی۔" پروین نے عدنان کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ جو سراسر جھوٹ کا پلندا تھا۔

"اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے...... تم چاہو تو میرے ساتھ نکاح کروا لو۔ چھوڑو والدین کو رہنے کے لیے تمہیں کوٹھی بھی بنوا دوں گا۔ محبت میں تو بادشاہوں نے تاج تخت چھوڑ دیے ہیں...... ایک تم ہو جو والدین کی جائیداد کا رونا رو رہی ہو۔" عدنان نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... پھر بھی میں اتنا بڑا فیصلہ ابھی نہیں کر سکتی۔ مجھے شادی نکاح کے نام سے خوف آتا ہے۔ لہٰذا مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو...... ویسے مجھے آپ پسند بھی ہو۔ میں اتنی نادان بھی نہیں جتنی آپ سمجھتے ہو۔"

ایک طویل نشست کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان بھی کیے دونوں کی میل ملاقاتیں چلتی رہیں۔ اور عدنان اس دوران جی بھر کے پروین کو عیش و عشرت کرواتا رہا اور تحفے تحائف دیتا رہا۔ وہ کاروبار کو بالکل بھول گیا اور پروین کے پیار میں فنا ہو گیا۔

دوسری طرف پروین اسی ڈگر پر چلتی رہی اور عدنان کو لوٹتی رہی اور اس کی جیب خالی کرتی رہی۔ اس دوران کسی نہ کسی طرح عدنان کو پتہ چل گیا تھا کہ پروین کوئی شریف زادی اور خاندانی لڑکی نہیں بلکہ دو نمبری ہے اس کے باوجود عدنان کے دل و دماغ پر پروین بری طرح سوار تھی وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ پروین اس کو دل و جان سے پیار کرتی ہے وہ ہر حالت میں پروین سے نکاح کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھا۔ اس سلسلے میں وہ گھر والوں کی رضا کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ دوسری طرف پروین کو بھی ایک طرح کی غلط فہمی تھی کہ عدنان کے ساتھ نکاح کرنے کی صورت میں اس کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ آ جائے گا۔ جبکہ عدنان کوئی لینڈ لارڈ نہ تھا بلکہ اوسط درجے کا ایک اناڑی سا مڈل کلاس لڑکا تھا۔ بہر کیف دونوں نے ایک دوسرے کو اندھیرے میں رکھا ہوا تھا اور بیوقوف بن رہے تھے۔

کچھ عرصہ بعد پروین کے گھر والوں کی رضامندی سے اس کا نکاح عدنان سے طے پا گیا جس میں عدنان کے یار دوست شامل تھے دوسری طرف پروین کے عزیز و اقارب...... نکاح بڑا ہی مختصر اور رازداری سے ہوا تاکہ

اس چیز کا علم زیادہ لوگوں کو نہ ہو۔ یہاں بھی پروین کے گھر والوں کی نیت میں فتور اور خرابی تھی انہوں نے نکاح خواں سے مل ملا کر یا اسے کچھ دے دلا کر نکاح کے کاغذات میں حق مہر کی رقم صرف ہندسوں میں مبلغ پانچ لاکھ لکھ دی اور لفظوں میں نہ لکھی کہ اس کا ابھی تنازعہ ہے اندراج بعد میں کیا جائے گا۔ جلدی میں ہر ایک نے دستخط کر ثبت کر دیئے جب ہر ایک نے دستخط کر دیئے تو پھر پروین کے گھر والوں نے نکاح خواں سے ہندسوں اور لفظوں میں پانچ کی جگہ پچیس لاکھ لکھوا لیا اور نکاح نامہ متعلقہ دفتر میں رجسٹرڈ بھی کروالیا۔ اس چیز کا علم پروین کے گھر والوں کو تھا لیکن عدنان اس وقت محبت میں اندھا بنا بیٹھا تھا اسے اس فراڈ کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کے علاوہ بھی پروین کے نکاح میں لکھوایا کہ عدنان ہر ماہ اسے پانچ ہزار روپیہ جیب خرچ بھی دے گا اور نکاح کے بعد وہ کوئی اسٹیج شو نہیں کرے گی نکاح میں زیورات پروین کی ملکیت تھے۔ اسٹیج شو والی شرط عدنان نے لکھوائی تھی جس کو پروین کے گھر والوں نے منظور کیا۔

نکاح کے بعد عدنان پروین کو لے کر ایک علیحدہ کرائے کی کوٹھی میں رہائش پذیر ہو گیا اور ہنی مون کے لیے ایک مہینے کے لیے چترال، سوات، بذریعہ کار روانہ ہو گئے۔ اب صبح وشام اچھے اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھایا جاتا...... راتوں کو سینما، تھیٹرز دیکھنا اس کا معمول تھا۔ ایک سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اب عدنان کی مالی حالت کمزور ہوتی چلی گئی۔ کچھ عرصہ وہ ادھر ادھر سے ادھار پیسے لے دے کر گزارہ کرتا رہا اس بات کا علم پروین کو بھی ہو گیا اور گھر میں لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا......!

سب سے پہلا مسئلہ پروین نے یہ اٹھایا کہ نکاح سے پہلے عدنان نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کے بعد وہ اسے کوٹھی خرید دے گا جبکہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ محض کوٹھی کرائے پہ لے دی ہے اور جس کا کرایہ بھی گزشتہ چھ ماہ کا اس کے مالک کو ادا نہیں کیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ مالک نے عدنان کو کوٹھی خالی کرنے کا کہہ دیا ہے بصورت دیگر وہ کورٹ سے بے دخلی کے احکامات لے کر اس کا سامان کوٹھی سے باہر پھینک دے گا...... اگر ایسا ہوا تو وہ کہاں جائے گی۔ اس کی گلی محلے، خاندان میں رسوائی ہو گی۔ عدنان کو بھی اس ساری بات کا بخوبی علم تھا نہ معلوم وہ کسی غیبی مدد کا منتظر تھا۔ تاہم روز بروز عدنان کی پریشانیاں بڑھتی ہی چلی گئیں یہاں تک کہ تنگ آ کر ایک دن اس نے پروین پر تشدد بھی کیا۔ جب اس بات کا علم پروین کے والدین کو ہوا کہ ان کا داماد کنگلا ہو چکا ہے تو انہوں نے اس کو اپنے گھر بلا کر پروین کی رضامندی سے طلاق کا کہا۔ پہلے تو عدنان نے انکار کیا لیکن جب انہوں نے چند بدمعاش بلا کر اسے طلاق دینے پر مجبور کیا اور اسے اپنی اصلیت دکھائی تو مجبوری کی حالت میں اس نے طلاق نامہ پر دستخط کر دیئے۔

پروین پروگرام کے مطابق واپس اپنی اصلی جگہ پر آ گئی۔ عدت گزر جانے کے بعد پروین کے والدین نے عدنان پر حق مہر کا عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ جو مبلغ پچیس لاکھ کا تھا...... اس کے علاوہ اس دوران کا جیب خرچ وہ بھی تقریباً پچاس ہزار تھا۔ جب عدالت کی طرف سے سمن عدنان کو موصول ہوئے تو زمین اس کے پاؤں سے نکلنے لگی۔ عدنان نے فوراً اپنے وکیل سے رابطہ کیا۔ نکاح نامے کے پرنٹ وغیرہ دیکھے، پڑھے جن پر بڑے عمدہ طریقے سے پچیس لاکھ کی رقم تحریر تھی۔ اسی دوران شہادت کے طور پر متعلقہ نکاح خواں سے رابطہ کیا۔ وہ بھی کرائے کا ٹٹو نکلا اور کہا کہ حق مہر کی رقم جو نکاح نامے پر تحریر ہے درست ہے۔

عدنان کو ڈگری کی رقم مبلغ ساڑھے پچیس لاکھ ادا کرنا ہی تھی بصورت دیگر عدنان کو جیل کی ہوا کھانا تھی جس کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ

اپنے بھائی کے پاس پہنچا اور اس کے پاؤں پڑ گیا کہ اس نے زندگی میں فاش غلطی کی جو ایک ناچنے والی کے دام فریب میں آ کر خود کو تباہ کر بیٹھا، اسے معاف کر دیا جائے وہ اس وقت سخت مشکل میں ہے بھائی ہی بھائی کے کام آتے ہیں اور مدد کرتے ہیں۔ بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی عدنان کی باتوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور کہا جو تم نے بویا تھا اب خود ہی کاٹو ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

پھر آہستہ آہستہ دونوں بھائیوں کی گفتگو میں تھوڑی تلخی سی آنے لگی۔ جب بات نتیجہ خیز نہ ہوئی تو عدنان نے اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ اسے ایک مقدمے میں پیسوں کی اشد ضرورت ہے مکان میں اس کا حصہ جو وراثت میں آتا ہے وہ فروخت کر کے اسے رقم چاہیے۔

"یہ مکان ہمارے باپ کی نشانی ہے۔" بڑے بھائی نے کہا۔ "ماں کے ہوتے ہوئے مکان فروخت نہیں ہو سکتا۔ اگر چاہو تو عدالت کے ذریعے اپنا حصہ لے سکتے ہو۔ جس کے لیے تین چار سال کا عرصہ درکار ہے۔"

"میں اتنا لمبا عرصہ انتظار نہیں کر سکتا۔" عدنان نے کہا۔ "اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں یہاں اسی مکان میں سب کے سامنے خود پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا کر اپنی زندگی تمام کر دوں گا اور الزام تم پر لگے گا۔ کہ بھائی نے بھائی کا حق مارا ہے اور انجام خودکشی پر ختم ہوا۔"

دونوں بیٹوں کی گفتگو ماں بھی سن رہی تھی۔ ماں کی ممتا بہت ہی بری چیز ہوتی ہے گو عدنان نافرمان تھا۔ اس نے گھر والوں کو بہت دکھ دیے تھے پھر بھی ماں کی ممتا نے جوش مارا آخر عدنان اس کا خون تھا۔ کن سے آہستہ آہستہ اٹھی اور کمرے میں پہنچی جہاں دونوں بھائیوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اپنے سامنے ماں کو اچانک دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ ماں نے دونوں بھائیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا؟

"رمضان بیٹا، تم میرے بڑے بیٹے ہو۔ تمہارے چھوٹے بھائی عدنان نے ہم سب کو بہت دکھ دیے ہیں آج یہ مشکل میں ہے اگر ہم اس کی مدد نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ میں اس کا دکھ نہیں دیکھ سکتی۔ یہ تمہارے باپ کا خون ہے میرے کہنے پر اسے معاف کر دو اور اس کا حصہ اس کو دے دو یا اسے رقم ادا کر کے خود خرید لو۔ مجھے ڈر ہے یہ خودکشی نہ کر لے۔ اگر اس نے ایسا اقدام کیا تو میں اس سے پہلے مر جاؤں گی۔"

"ماں جی کچھ بھی ہو نہ تو میں اس کو حصہ دوں گا اور نہ ہی رقم، یہ پھر رقم اپنی عیاشی کی نذر کر دے گا۔" رمضان نے کہا۔ "بس! آپ ماں جی یہاں سے چلی جائیں۔"

"نہیں نہیں بیٹا رمضان اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔" ماں نے کہا۔ "اور تم عدنان اس وقت چلے جاؤ ہمیں سوچ سمجھ لینے دو۔ ان شاء اللہ تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔" ماں نے عدنان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

اور وہ وہاں سے چلا آیا۔ عدنان کو اب تھوڑی تھوڑی امید تھی کہ شاید ماں کی تسلی رنگ لائے؟ اسی صلاح مشورہ میں ایک ہفتہ گزر گیا یہ گھر کی بات ان کے پیر مرشد تک بھی جا پہنچی۔ رمضان ان کا بہت احترام کرتا تھا پیر صاحب کو خبر ملی کہ رمضان نے اپنی ماں کی بات نہیں مانی۔ بلکہ الٹا ماں کی شان میں گستاخی کی ہے اور چھوٹے بھائی کا حق بھی چھینے ہوئے ہے۔ رمضان کے متعلق پیر صاحب کو سن کر سخت دکھ ہوا۔

پیر صاحب اللہ والے تھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو بھی بخوبی سمجھتے تھے۔۔۔۔ اور ان کے خاندان میں پیر صاحب کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پیر صاحب خود رمضان کے گھر آئے۔ اس کی والدہ اور چھوٹے بھائی عدنان کو بلایا۔ سارے حالات کا ان کو علم تھا۔ وہ ہر حالت میں گھر کی اکائی کو قائم رکھنا چاہتے

تھے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ماں کی دل آزاری ہو دوسرے یہ بھائی جو آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں ان کے مرحوم باپ محمد دین مرحوم کی روح بے چین ہوگی۔

رمضان...... اپنے پیر صاحب کے سامنے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے پیر صاحب سے کہا۔ "آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہے۔"

پیر صاحب نے کہا۔ "اس کا حصہ مکان کا اس کو ادا کرو۔ یہ برباد کرے یا کاروبار کرے۔ اس کا یہ خود ذمہ دار ہے۔"

رمضان نے کہا۔ "ٹھیک ہے وہ تیس لاکھ کی رقم اس کو ایک ہفتے میں ادا کردے گا۔"

عدنان نے کہا۔ "ٹھیک ہے وہ اپنا حصہ عدالت میں جاکر رمضان کے نام کردے گا۔"

پیر صاحب نے رمضان کو مزید کہا کہ اپنی ماں سے معافی مانگو کیونکہ تم نے ماں کی حکم عدولی کی ہے۔

رمضان نے اپنی ماں سے معافی مانگی۔ ماں نے اسے بخوشی معاف کردیا پیر صاحب نے عدنان سے کہا کہ دیکھو میں نے اللہ پاک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تمہاری مشکل کو آسان بنادیا ہے۔ اب سوچ سمجھ کر زندگی بسر کرنا اور اپنے بڑے بھائی کی ہر بات کو ماننا۔

عدنان نے کہا۔ "حضور جیسے آپ کا حکم۔"

رمضان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "حضور اسے تاکید کریں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے خلاف ڈگری دعوئی عدالت کی طرف سے ہو چکا ہے۔ وہاں رقم ادا کرکے اپنی جان چھڑائے اور میرے ساتھ مل کر دکان پر پابندی سے کام کرے میں اسے جیب خرچ کے لیے ہر ماہ پانچ ہزار کی رقم ادا کرتا رہوں گا۔ اگر اس کا چلن ٹھیک رہا تو اگلے سال اس کی شادی بھی کسی اچھے گھرانے میں کروں گا۔"

پیر صاحب بھی اپنے مرید کی بات سن کر خوش

ہوئے اور عدنان کو تاکید کی کہ وہ بڑے بھائی کی بات مانے۔ عدنان نے اقرار کیا کہ وہ اب ان شاء اللہ اپنے بھائی رمضان کو باپ کا درجہ دے گا۔ اور دکان پر پابندی سے کام کرے گا اور پیر صاحب کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ کیونکہ اس نے اس چھوٹی سی عمر میں بہت کچھ دیکھ بھی لیا ہے اور اس سے سبق بھی حاصل کیا ہے۔ اپنا اپنا ہوتا ہے۔

عدنان نے اپنے آپ کو بالکل ہی بدل لیا۔ وہ پانچ وقت کی نماز ادا کرتا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا۔ رات سونے سے پہلے ماں کی ٹانگیں دباتا اور اس سے دعائیں لیتا۔ دن کو بڑی باقاعدگی سے بڑے بھائی کے ساتھ دکان پر جاتا اور پوری ایمانداری سے کام کرتا۔ اب وہ بڑے بھائی کی عزت باپ کی طرح کرتا تھا۔ بڑا بھائی اور ماں دونوں اس سے بے حد خوش تھے۔

ادھر عدالت میں عدنان نے ڈگری کے خلاف اپیل دائر کر رکھی تھی لیکن طوائفوں کے خاندان نے جال اتنا مضبوط بنایا تھا کہ نکلنے کا کوئی راستہ نہ چھوڑا تھا۔ اپیل مسترد ہو گئی اور اسے پچیس لاکھ ادا کرنے ہی پڑے۔ ماہوار خرچہ جو نان و نفقے کی شکل میں تھا وہ عدالت نے معاف کر دیا۔

عدنان جیل جانے سے بچ گیا۔ اس نے اللہ کا لاکھ شکر ادا کیا۔ باقی کے پانچ لاکھ سے اس نے اپنے چھوٹے موٹے قرضے چکائے۔ اب اس کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا تھا اور وہ اللہ سے اپنی نادانی کی معافی مانگتا رہتا تھا۔ اسے نعت سننا بہت پسند تھا اور جہاں کہیں محفلِ نعت ہوتی وہ ساری ساری رات بیٹھا رہتا۔ ایک بار ایسی ہی محفلِ نعت میں شریک تھا۔ انتظامیہ نے 5 خوش نصیبوں کو عمرے کا ٹکٹ دینے کا اعلان کیا تھا۔ عدنان کی قسمت نے یاوری کی اور اس کا نام قرعہ اندازی میں آ گیا۔

عدنان خوشی خوشی عمرہ ادا کرنے گیا۔ اس کا بھائی رمضان اور ماں بے حد خوش تھے۔ جب عدنان عمرہ ادا کر کے واپس آیا تو حسبِ وعدہ رمضان نے اس کی شادی اپنی بیوی کی ایک کزن سے طے کر دی اور دھوم دھام سے اس کی شادی کی۔ سارے اخراجات اس نے خود برداشت کیے۔

بیوی کی آمد اس کے لیے خوشی کا پیام لائی۔ اس کے سسرال والے صاحبِ حیثیت لوگ تھے انہوں نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دس مرلے کا ایک مکان دیا۔ عدنان اپنی بیوی کو لے کر نئے مکان میں شفٹ ہو گیا۔ میاں بیوی خوش خوش زندگی گزارنے لگے۔ عدنان ضد کر کے ماں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا کہ اب اس کا حق ہے کہ وہ ماں کی خدمت کرے اور دعائیں لے۔

پروین کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ پھر شوبز میں لوٹ گئی تھی اور کسی نئے شکار کی تلاش میں تھی۔ کسی ذاتی محفل میں ایک ملنے والے نے افسوس کا اظہار کیا کہ عدنان نے اسے طلاق دے دی۔

”کوئی نئی بات کریں جناب!“ اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”وہ کوئی پہلا آدمی نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی دو کو بھگتا چکی ہوں۔ اب کسی نئے اُلو کے پٹھے کی تلاش میں ہوں۔ یہ لوگ میرے پاس کاروں پر سوار ہو کر آتے ہیں اور ان کی واپسی پیدل ہوتی ہے..... ہیں نا اُلو کے پٹھے!“

کچھ عرصے بعد اخباروں میں ایک خبر چھپی کہ سٹیج کی معروف رقاصہ پروین کو نامعلوم افراد نے اس وقت گولیوں سے چھلنی کر دیا جب وہ رات کو سٹیج شو ختم کر کے اپنے گھر اقبال ٹاؤن جا رہی تھی۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ قاتل کوئی اُلو کا پٹھا ہی ہوگا۔ اتنی حسین لڑکی کو کوئی اُلو کا پٹھا ہی اتنی بے دردی سے مار سکتا ہے۔

***

دریِ زنداں

موم سے پتھر بن جانے والے ایک شریف النفس قبائلی نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت

رزاق شاہد کوہلر

قسط: 3

برق
برق کا کوندا بن کر میرے ذہن میں لہرانے والا یہ سوال بلاشبہ اہم بلکہ بڑی حد تک حیرت انگیز تھا۔ ایسا اکثر فلموں اور ڈراموں میں تو ہوتا رہتا ہے مگر عملی زندگی میں ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ نامعلوم دوشیزہ میں جسے خوابوں میں دیکھا کرتا تھا، اُسے آخر یہ بات کس طرح معلوم ہوگئی تھی کہ میں نے مرد ہوکر چوڑیاں پہننے کی ذلت جھیلی ہے؟ شاید وہ بھی میری طرح مجھے اپنے خوابوں میں دیکھتی رہتی تھی۔ میں جوں جوں اس معاملے کے متعلق سوچتا گیا میری اُلجھن بڑھتی گئی۔ وہ ایک عرصے سے میرے خوابوں میں آرہی تھی مگر میں نے اُس کے چہرے پر اپنے لیے حقارت کے تاثرات کبھی نہیں دیکھے تھے۔ معاملہ واقعی پُراسرار شکل اختیار کر چکا تھا۔ مجھے اس معاملے میں کسی صاحب بصیرت انسان کی رہنمائی درکار تھی، جو خوابوں کی تعبیر و اسرار کے علم پر دسترس رکھتا ہو اور وہ بھی شرعی لحاظ سے۔ بکر مسئلہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا تھا اور اُس سے بھی بڑا مسئلہ اُس راز کا افشا تھا جس کے متعلق میرے علاوہ صرف راشد جانتا تھا یا پھر سمیار خان اور اُس کے گارڈز۔ ہر شخص کی طرح مجھے بھی اپنی عزتِ نفس عزیز تھی۔ رات کا بقیہ حصہ میں نے انھیں سوچوں سے لڑتے ہوئے گزار دیا۔

صبح سویرے میں نے ناشتا کیا اور پھر ایسے ہی گھومنے پھرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دراصل میرا ارادہ راشد سے بات کرنے کا تھا۔ وہی اس سلسلے میں مجھے کوئی مناسب مشورہ دے سکتا تھا۔ ہمارا گاؤں چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ پہاڑ غیر آباد اور سنگلاخ تھے۔ ان پر سبزے کا نام ونشان بھی نہیں تھا تاہم گاؤں کے اردگرد ایک وسیع وعریض میدانی علاقہ بھی تھا، جہاں کھیتی باڑی کی جاتی تھی۔ یہ وسیع و عریض کھیت ہماری ملکیت تھے۔ بابا جان چونکہ گاؤں کے سردار تھے اس لیے اُن کے پاس عام لوگوں کی نسبت زیادہ اراضی تھی۔ یہ اراضی بابا جان اور مہردل خان مل کر کاشت کرتے تھے۔ سال بھر میں اتنی فصل ہو جاتی تھی جو ہماری ضروریات کے لیے کافی تھی۔ اس لیے بابا جان مجھے کہیں بھی ملازمت کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ جب کہ مجھے ملازمت کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے ایم اے تک تعلیم اسی شوق کی خاطر حاصل کی تھی۔

گاؤں کی گلیوں میں سے ہوتا ہوا میں کھیتوں میں پہنچ گیا جہاں چاروں طرف سرسوں کے زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ کھیتوں سے آگے غربی پہاڑ پر سورج کی ابتدائی کرنیں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ پہاڑ کی چوٹیاں دھوپ میں نہائی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس پہاڑ کے دوسری جانب حق و باطل کا معرکہ اب آخری مراحل میں تھا۔ باطل اپنی ساری قوت میدان جنگ میں جھونکنے کے باوجود اپنے حواریوں کے ساتھ اب راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ افغانستان کے بوریا نشینوں نے ایک بار پھر قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کردی تھی۔ بقول شاعر مشرق......

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

چند منٹ تو میں قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر جیب سے موبائل فون نکال کر راشد کو کال کرنے لگا۔ چوتھی بیل کے بعد مجھے راشد کی نیند میں ڈوبی ہوئی "ہیلو" سنائی دی۔

"شرم کرو شرم۔" میں نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "صبح کے دس بجنے والے ہیں اور تم ابھی تک بستر پہ اینٹھ رہے ہو؟"

"ابے بد بخت پٹھان! میں رات کو دیر سے سویا تھا۔" اُس نے خمار آلود لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں دیر سے سوئے تھے...... کیا پیٹ میں درد

تھا؟"

"انجلینا جولی کی نئی فلم دیکھی تھی اور......"

"اور اب انجلینا جولی کے خواب دیکھ رہے ہو ...... ہے ناں؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے طنزاً پوچھا۔

"میں پٹھان نہیں ہوں بیٹے۔" اُس نے جوابی چوٹ کی۔ "جو رسائی سے باہر ہو اُس کے خواب دیکھنے والے اکثر احمق ہوتے ہیں۔"

"مطلب تم ان ڈائریکٹ پٹھانوں کو احمق ثابت کر رہے ہو؟"

"ہاہاہا...... ثابت ......" اُس نے قہقہہ لگایا۔ "ارے! ثابت تو اُسے کیا جاتا ہے جس میں کوئی شک ہو جب کہ تم لوگوں کی حماقت تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ذرا بابا جان کے سامنے تو یہ بات کہہ کر دیکھو۔"

"مجھے کنوارا مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" اُس نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور پھر ایک دم سنجیدگی سے پوچھا۔ "میری نیند خراب کرنے کی وجہ؟"

"یار! میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ہے۔ تم سنو گے تو یقین نہیں کرو گے۔"

"پھر کیا دیکھ لیا تم نے؟" اُس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

میں نے نہایت ہی تفصیل کے ساتھ اُسے گزشتہ شب دیکھے ہوئے خواب کے متعلق بتادیا۔

"سچ کہہ رہے ہو؟" پوری تفصیل سننے کے بعد اُس نے بے یقینی کے عالم میں سوال کیا۔

"مجھے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے جو کچھ بھی دیکھا تمہیں بتادیا کہ شاید تم اس سلسلے میں میری کوئی ہیلپ کر سکو۔"

"کیسی ہیلپ؟" اُس نے قدرے تعجب ہو کر پوچھا۔

"میں کسی ایسے شخص سے ملنا چاہتا ہوں جو خوابوں کی تعبیر کے بارے میں کچھ دسترس رکھتا ہو۔"

"میرے خیال میں تو تمہیں کسی ماہر نفسیات سے ملنے کی ضرورت ہے۔"

"میں سنجیدہ ہوں یار۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا۔" اُس نے جواب دیا۔

"میں اُس لڑکی کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔"

"تو ڈھونڈو...... منع کس نے کیا ہے؟"

"مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔" میں نے ریکوئسٹ کی۔

"میں آوارہ گردی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تم کوئی اور ساتھی تلاش کرلو۔" اُس نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

"راشد! پلیز یار...... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، میں بہت پریشان ہوں۔ اس خواب نے میری بھوک اور پیاس اُڑا دی ہے۔"

"ابے او...... چھ فٹ کے احمق پٹھان! کچھ عقل سے کام لو، تلاش اُسے کیا جاتا ہے جس کا کوئی اتا پتا معلوم ہو اور وہ تو ویسے بھی ایک لڑکی ہے۔ ہم کس سے اُس کے متعلق پوچھیں گے؟ اور جس سے پوچھیں گے کیا وہ ہمیں پاگل ڈکلیئر نہیں کرے گا؟"

"کچھ سوچو یار! ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔" میں نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

وہ چپ ہوگیا شاید کچھ سوچ رہا تھا یا پھر میرے لیے کوئی نئی گالی ایجاد کر رہا تھا۔ سیل فون میرے کان سے لگا ہوا تھا اور میں اُس کے جواب کا منتظر تھا۔

"تم ایسا کرو کہ پشاور آجاؤ مجھے ایک ترکیب سوجھ

گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ترکیب اُس لڑکی کی تلاش میں کارگر ثابت ہو۔" قدرے توقف کے بعد مجھے اُس کی پرجوش آواز سنائی دی۔

"اوکے میں آج ہی پشاور پہنچ جاتا ہوں۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا۔

"اوکے گڈ بائے۔" کہہ کر اُس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

"تم کہیں سچ مچ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟" بابا جان نے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"بابا جان! وہ کیا ہے کہ راشد کا ایک ضروری کام تھا اس لیے مجھے اُس نے پشاور بلایا ہے۔" میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"کیسا ضروری کام...... جو تمہارے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا؟" بابا جان نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے اُس نے نہیں بتایا۔"

"کیوں نہیں بتایا...... میری اُس سے بات کراؤ موبائل فون پر۔" بابا جان نے حکم دیا۔

میں نے کہا۔ "بہت مشکل ہے بابا جان! آپ کی اور راشد کی بات نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی کیا میں گونگا ہوں یا پھر راشد کی زبان پر چھالے پڑ چکے ہیں؟"

"وہ...... دراصل بات یہ ہے بابا جان کہ راشد پشتو زبان نہیں بول سکتا جب کہ آپ کی اُردو راشد کے پلے نہیں پڑے گی...... تو...... تو ایسی صورت حال میں بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"تیری اُردو کی ایسی کی تیسی۔" وہ ایک دم بگڑ گئے۔ "تم اُس کا نمبر ملاؤ میں بات کروں گا۔"

اب بابا جان کی بات کرانا ضروری تھا ورنہ وہ مجھے کبھی بھی پشاور جانے کی اجازت نہ دیتے۔ سو میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور بذریعہ ایس ایم ایس راشد کو مطلع کر دیا کہ بابا جان سے کیا کہنا ہے۔ اس کے بعد میں نے راشد کا نمبر ملایا اور فون بابا جان کو تھما دیا۔

"کیا حال اے بچے؟" رابطہ قائم ہوتے ہی بابا جان نے اُونچی آواز میں پوچھا۔

دوسری جانب سے راشد نے پتا نہیں کیا کہا کہ بابا جان ہنستے ہوئے بولے۔ "ٹھیک اے بچے! اَم اس کو ابی بھیجتا ہوں تم بےفکر رہو۔"

راشد نے پھر کچھ کہا تو بابا جان بولے۔ "اَم کو تم پہ اعتبار اے بچے! اگر تم اَم سے جھوٹ نہیں بولے گا۔"

اس کے بعد بابا جان چند لمحے راشد سے اُس کے اہلِ خانہ کے متعلق گلابی اُردو میں سوال و جواب کرتے رہے۔ پھر فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آج شام تک پہنچ جاؤں گا۔"

"ایک بار پہنچ تو جا بیٹے پھر تجھے بتاتا ہوں...... ہر بار قربانی کا بکرا بنانے کے لیے کیا تجھے میں ہی ملا ہوں؟" اُس نے غصے کا اظہار کیا۔

"سوری یار! اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔"

"بکواس بند کر۔"

"اوکے بائے۔" میں نے جلدی سے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد میں اپنی جیپ میں سوار پشاور کی طرف روانہ تھا۔ جس وقت میں پشاور شہر میں داخل ہوا اُس وقت عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ کہیں رکنے کی بجائے میں سیدھا راشد کے گھر پہنچ گیا۔ راشد اُس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب بھی غیر حاضر تھے۔ آنٹی خدیجہ اور حنا گھر میں موجود تھیں۔ چونکہ اُنھیں

میری آمد کے بارے میں معلوم تھا اس لیے حیرت کا اظہار کرنے کی بجائے وہ مجھ سے بابا جان، مسور جان اور درخونہ کی خیریت دریافت کرنے لگیں۔ میں نے اُنھیں سب کی خیریت کے متعلق بتایا تو آنٹی بولی۔ ”تم بیٹھو میں ذرا کچن میں مصروف ہوں ابھی کام نمٹا کر آتی ہوں۔“

”اوکے آنٹی...... راشد کا کوئی پتا؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ ذرا مارکیٹ تک گیا ہے بس آتا ہی ہوگا۔ جب تک حنا تمھیں کمپنی دے گی۔“ یہ کہہ کر آنٹی کمرے سے باہر نکل گئی جب کہ میں حنا کی طرف متوجہ ہوگیا جو مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”اور سناؤ شیر دل صاحب! گاؤں میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟“ حنا نے یوں مسکرا کر پوچھا جیسے برسوں سے میری شناسا ہو۔

”ہاں۔“ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

”راشد بھائی بتا رہا تھا کہ آپ کو عجیب و غریب خواب آتے رہتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“ حنا کا یہ سوال میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ وہ میرے دوست کی بہن تھی اور میرے لیے بہن جیسی ہی تھی۔ میں اس کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ سو چپ رہا مگر شاید اس نے چپ رہنا نہیں سیکھا تھا۔ جھٹ سے بولی۔ ”آپ تو لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہیں۔ کیا میں نے کچھ غلط پوچھ لیا ہے؟“

”حنا!“ میں نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ موضوع نامناسب ہے ہم کوئی اور بات کرتے ہیں...... چلو تم مجھے اپنے کالج کے بارے میں بتاؤ، تمھاری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟ کبھی کوئی پوزیشن لی ہے کہ نہیں اور تمھارا فیورٹ سبجیکٹ کون سا ہے، کلر اور جیولری کون سی پسند کرتی ہو؟“

”تم شکل سے اتنے کم عمر تو نہیں لگتے۔“ وہ ایک دم ”آپ“ سے ”تم“ پر آ گئی۔ ”جتنا بننے کی کوشش کر رہے ہو۔“

میرے کانوں میں یک دم خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کے ارادے کچھ ٹھیک نظر نہیں آتے تھے۔ ویسے بھی وہ جن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی میں ان سے ناواقف نہیں تھا۔ وہ نوجوان تھی، بے حد خوب صورت اور دل کش تھی۔ اگر میں پہلے سے کسی کی زلف کا اسیر نہ ہوتا تو شاید اس کی بے تکلفی کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو حنا! میں تمھارے بھائی کا دوست ہوں اور اس ناتے میں تمھیں ایک بھائی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ پلیز تم............“

”مگر میں تمھیں بھائی نہیں سمجھتی...... اب کیا کہو گے؟“ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

”تمھارے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوگا جب کہ میں تمھیں دل سے بہن سمجھتا ہوں“ پہلی بار میں نے قدرے سخت انداز میں جواب دیا۔

”کیا وہ خوابوں والی مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟“ اس نے تڑ امانے بغیر جواب دیا۔

”بات خوب صورتی اور بدصورتی کی نہیں ہے حنا! میں اُسے چاہتا ہوں اس لیے اس کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔“

”منزل سے کنی کترا کر نکل جانے والے عمر بھر بھٹکتے ہی رہتے ہیں اور پھر کیا پتا جسے تم ڈھونڈتے پھر رہے ہو وہ حقیقت میں کہیں ہے بھی کہ نہیں؟“

”اس نے اپنے ہونے کا ثبوت مجھے دے دیا ہے۔“

"خواب میں ناں؟" اُس کے انداز میں طنز تھا۔
"ہاں خواب میں اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ اسی دنیا میں کہیں موجود ہے۔ بس اُسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔" میں نے اُس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔
"خوابوں کے پیچھے بھاگنے کی بجائے حقیقت کو قبول کیوں نہیں کرتے...... مجھ میں کیا کمی ہے؟"
"تم کوئی کمی نہیں ہے بلکہ سچ پوچھو تو تم اُس خوابوں والی سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو لیکن میں مجبور ہوں مجھے اُس کے علاوہ کچھ بھائی نہیں دیتا ورنہ خدا کی قسم تمہاری رفاقت کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔"
"شیر دل! تم سرابوں کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ یاد رکھنا ایک دن تم پچھتاؤ گے۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

میں حیران و پریشان بیٹھا تھا کہ آنٹی چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے کمرے میں داخل ہوئی۔
"حنا کدھر ہے بھئی!" وہ سنٹرل ٹیبل پر رکھے سجاتے ہوئے مستفسر ہوئی۔
"پتا نہیں آنٹی بغیر بتائے ہی اُٹھ کر چلی گئی۔"
آنٹی بولی۔ "تم نے یقیناً اُس کی کسی بات کو جھٹلایا ہو گا ورنہ وہ ایسی نہیں ہے کہ مہمان کو اکیلا چھوڑ کر چل دے؟"
میرے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ آنٹی نے بے خیالی میں کیسا درست اندازہ لگایا تھا۔ میں نے اُس کی کسی بات کو نہیں بلکہ اُس کی شخصیت کو جھٹلایا تھا۔ عورت اپنی ذات کی نفی اور وہ بھی کسی مرد کے ہاتھوں کبھی بھی برداشت نہیں کرتی۔
"نہیں آنٹی!" میں قدرے توقف سے بولا۔ "ہمارے بیچ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی، یا پھر شاید انجانے میں میری زبان سے ایسی کوئی بات نکل گئی ہو جو اُس نے مائنڈ کر لی ہو؟"
"تم دونوں کے بیچ کس موضوع پر باتیں ہوئیں ہیں؟" آنٹی نے سوال کیا۔
"بس ایسے ہی عام سے موضوعات پر...... حالات حاضرہ اور حنا کی اسٹڈی وغیرہ کے متعلق۔" میں نے نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔
آنٹی مسکرائی۔ "تمہارا چہرہ تمہارے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا...... سچ بتاؤ تم نے اُس سے کیا کہا ہے؟"
"میں سچ کہہ رہا ہوں آنٹی! پلیز میری بات......"
"تم جھوٹ بول رہے ہو شیر دل۔" آنٹی نے میری بات کاٹی۔ "سچ میں جانتی ہوں مگر تمہاری زبان سے سننا چاہتی تھی۔ افسوس کہ تم نے مجھے مایوس کیا۔"
میں نے کہا۔ "آنٹی! بچہ اگر ضد کرے تو کیا اُسے کھیلنے کے لیے انگارے دے دینے چاہئیں؟"
"بچہ اگر ضد کر کے خوابوں کے پیچھے بھاگ سکتا ہے تو کھیلنے کو انگارے بھی مانگ سکتا ہے...... خیر اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے ابھی تم چائے وغیرہ پی لو۔" آنٹی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا اور پھر ایک کپ میں چائے ڈال کر مجھے پیش کر دی۔
سامنے ٹرے میں تین چار پلیٹیں بھی رکھی ہوئی تھیں جن میں بسکٹ، چپس اور نمک پارے وغیرہ سجا کر رکھے گئے تھے۔ میں چائے کے ساتھ ان لوازمات سے بھی انصاف کرنے لگا۔ جب کہ آنٹی تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔
چائے پی کر میں فارغ ہوا تو راشد بھی پہنچ گیا۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔ راشد مجھے بھینچتے ہوئے بولا۔ "سوری یار! تمہیں انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑی۔ دراصل مجھے مارکیٹ میں اسکول کے زمانے کا ایک دوست مل گیا

تھا۔ اُس کے ساتھ باتوں باتوں میں وقت کے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔"

"کوئی بات نہیں یار دیر سویر ہوتی ہی رہتی ہے۔" میں نے دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا دوست مجھو میرا ابھی دوست ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

"وہ بندہ بڑا قابل ہے تمہارے بہت کام آئے گا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے متحیر انداز میں سوال کیا۔

"کیا وہ خوابوں کی تعبیر بتاتا ہے؟"

"نہیں وہ کمپیوٹر کے ذریعے تصویریں اور گرافکس بنانے میں بہت مہارت رکھتا ہے۔ ہم اُس کے ذریعے خوابوں والی کی تصویر بنائیں گے اور پھر اپنے اپنے طور پر اُس کو تلاش کریں گے۔"

"ناممکن ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کس طرح تصویر بنائے گا؟"

"تم اُسے اس لڑکی کا حلیہ بتاؤ گے باقی کام اُس کا ہے۔ وہ اسکیچ بنائے گا اور پھر اُس میں رنگ بھرے گا۔"

"او کے اگر یہ بات ہے تو پھر اُس سے مل کر دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے رضامندی کا اظہار کیا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں اور راشد اُس یاسر نامی نوجوان کے ساتھ اُس کے گھر میں موجود تھے۔ یاسر نے گھر میں ایک کمپیوٹر روم بنا رکھا تھا۔ جہاں کمپیوٹر سے متعلق تمام اشیاء موجود تھیں۔ اُس کے پاس بہت ہی دیدہ زیب اور قیمتی پرنٹر تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد یاسر نے ہمارے لیے چائے بنوائی اور پھر مجھ سے خوابوں والی لڑکی کا حلیہ دریافت کرنے لگا۔ اُس کے زیادہ تر سوال آنکھوں، ناک، ہونٹوں، ٹھوڑی، پلکوں اور بھوؤں سے متعلق تھے۔ میں اُسے وضاحت کے ساتھ بتاتا رہا اور وہ کاغذ پر نوٹ کرتا گیا۔ چائے سے فراغت کے بعد وہ کمپیوٹر کے سامنے سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا اور میرے بتائے گئے حلیے کے مطابق اسکیچ بنانے لگا۔ لگ بھگ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد وہ اسکیچ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ اسکیچ بڑی حد تک اُس خوابوں والی لڑکی سے مماثل تھا۔ اسکیچ دیکھ کر ہی خواب کے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہونے لگے تھے۔

میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ "یاسر صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ یہ بالکل ویسی دکھتی ہے جیسے میرے خواب میں آنے والی لڑکی...... کیا بات ہے یار! آپ کی...... مجھے تو تعریف کے لیے لفظ ہی نہیں مل رہے ہیں۔"

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "ابھی کہاں کمال ہوا ہے۔ بس آپ دیکھتے جائیں میں کیا کرتا ہوں؟ جب میں اس کا پرنٹ نکالوں گا تو یہ آپ کو بولتی ہوئی محسوس ہوگی۔"

"واؤ......" راشد بولا۔ "تم تو واقعی فن کار ہو یار! آج مجھے یقین آ گیا ہے ورنہ اس سے قبل تو میں تجھے گھامڑ ہی سمجھتا تھا۔"

"دنیاداری کے معاملے میں، میں اب بھی گھامڑ ہی ہوں۔" یاسر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھر تو تمہاری شیردل کے ساتھ خوب جمے گی۔" راشد نے قہقہہ لگایا۔ "یہ بھی تمہاری طرح بس "لالہ" ہی ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے لالے دو۔"

"بکواس مت کرو یار!" میں نے آنکھیں نکالیں۔ "یاسر کو کام کرنے دو۔"

"او لالے! میں تم دونوں کی دوستی کرا رہا ہوں اور تم ہی ناراض ہو رہے ہو؟"

"اب اگر تم نے مجھے لالہ کہا تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔"

"میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم لالے ہو۔" وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ "کیا میرا دل تجھے لالہ نہیں کہتا؟"

میں نے کہا۔ "اُس لالے کا مطلب اور ہوتا ہے۔ اُسے ہمارے عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور......"

"اور اِس لالے کو ہمارے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔" اُس نے دانت نکالتے ہوئے قطع کلامی کی۔

"اوکے مذاق بہت ہو گیا۔ اب مجھے کام کرنے دو۔" یاسر نے مداخلت کی۔

"تم لگے رہو منا بھائی۔" راشد نے اُس کی پیٹھ تھپکی۔ "ہم ذرا بٹیر بازوں کی طرح چونچیں لڑا رہے ہیں ......وہ کیا ہے کہ اس طرح پیار بڑھتا ہے۔"

"مگر تم دونوں تو انسان ہو۔" یاسر نے جواب دیا۔

"تو کیا بٹیر باز انسان نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں لیکن چونچیں تو بٹیر لڑاتے ہیں ناں؟"

راشد نے کہا۔ "تم اپنا کام کرو......بٹیر باز جانیں اور ہم۔"

اسی نوک جھونک کے دوران یاسر نے اسکیچ میں رنگ بھر کر اُسے ایک خوب صورت تصویر کا روپ دے دیا۔ میری نگاہیں کمپیوٹر کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ میرے سامنے بیٹھی ہو۔ اُس کی خوب صورت سیاہ آنکھوں میں ویسی ہی اُداسی تھی جیسے میں نے یاسر کو بتائی تھی۔ بلا شک وشبہ یاسر نے کمال کر دیا تھا۔ واقعی وہ اس کام میں ماہر تھا۔ مجھے اُس کی تعریف کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ پھر بھی میں ممنون انداز میں بولا۔ "دوست! آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ میں آج بے حد خوش ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے منزل کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "دوست بھی کہتے ہو اور شکریہ بھی ادا کرتے ہو، کیا یہ بات مناسب ہے؟"

"اور تمہیں آپ، جناب جیسے القاب بھی تو دیے جا رہا ہے حالانکہ تم تو "تم" کہلانے کے لائق بھی نہیں ہو۔" راشد نے قہقہہ لگایا۔

یاسر بولا۔ "اچھا اب یہ مسخرہ پن چھوڑو، میں تصویر کا پرنٹ نکالنے لگا ہوں۔"

"تو نکالو ناں! کس نے کیا تمہارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔" راشد جواب دے کر اپنی تھوڑی کھجانے لگا۔

یاسر نے کمپیوٹر کے ساتھ رکھے ہوئے پرنٹر کو آن کیا اور پھر تصویر کا سائز ایڈجسٹ کرنے کے بعد ماؤس کے ذریعے اوکے پر کلک کر دیا۔ پرنٹر کی مخصوص آواز گونجی اور دوسرے ہی لمحے اُس گم نام حسینہ کی تصویر پرنٹر سے پھسلتی ہوئی باہر آ گئی۔ یاسر نے تصویر اُٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم اسے چیک کرو میں مختلف سائز میں چند پرنٹ مزید نکالتا ہوں۔" اس بار اس نے مجھے بے تکلفی کے ساتھ "تم" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

میں نے اُس کے ہاتھ سے تصویر لے کر بغور اس کا جائزہ لیا۔ تصویر واقعی بے حد خوب صورت تھی۔ میرا دل چاہا کہ اُس کے بوسے لینا شروع کر دوں مگر راشد جیسے شریر اور شیطان نما انسان کے سامنے مجھے ایسا قدم اُٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی۔

راشد میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "مجھے دکھاؤ......پپیاں جھپیاں بعد میں لینا۔"

"بہت خبیث ہو تم۔" میں نے تصویر اس کی طرف بڑھائی۔

"تم سے تھوڑا سا کم ہوں۔" وہ تصویر لیتے ہوئے بولا اور پھر دیدے پھاڑ کر تصویر کو یوں دیکھنے لگا جیسے ابھی

اُسے کہا جائے گا۔

"واہ لالے واہ...... کیا زبردست چیں ہے۔" وہ رال ٹپکانے والے انداز میں بولا۔ "مگر بچاری ہے بہت بدقسمت...... اسے ایک احمق پٹھان کے خوابوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کون ہے بدنصیب؟"

میں نے کہا۔ "نصیب تو اُس بچاری کے پھوٹیں گے جسے تیرے جیسے جوکر کے پلے باندھا جائے گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم یار۔" یاسر نے بھی میری تائید کی۔ "اس مسخرے کے پلے بندھنے والی بھوکی مر جائے گی۔"

"اوئے گھوچو!" راشد نے آنکھیں نکالیں۔ "تم کس کے ساتھ ہو، اس کے یا میرے؟"

"میں ہمیشہ جیتنے والے کا ساتھ دیتا ہوں۔" یاسر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مطلب تم وطن عزیز کے سیاست دانوں کے نقش قدم پر چلنا پسند کرتے ہو؟"

"بالکل...... اس میں کیا بُرائی ہے۔" یاسر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آدمی کو ہمیشہ اپنا فائدہ سوچنا چاہیے۔"

"لعنت ہے تیری سوچ پر منافق اعظم۔"

یاسر مسکرایا۔ "تمہارے پاس گنتی کی ہی نیکیاں ہیں انھیں کیوں ضائع کرتے ہو یار؟"

"بکواس بند کرو...... بڑے آئے مولانا منحوس کان پوری کہیں کے۔"

"یہ کون ذات شریف ہے؟" یاسر نے چڑانے والے انداز میں پوچھا۔

"میرے سامنے بیٹھا ہے وہ گدھا۔"

"یار شرم کرو مہمان ہے تمہارا۔" یاسر نے میری طرف اشارہ کیا۔ "یہ کیا سوچے گا ہم لوگ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک......"

"سٹوپڈ! میرا اشارہ تمہاری طرف تھا۔" راشد نے قطع کلامی کی۔ "شیر دل تو جگر ہے اپنا۔"

اسی ہنسی مذاق کے دوران یاسر نے چند اور تصویریں نکال کر میرے حوالے کردیں۔ میں نے تصویروں کو چیک کیا اور پھر انھیں ایک لفافے میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا۔ تھوڑا وقت ہم نے مزید یاسر کے پاس گزارا اور پھر اجازت لے کر واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

"اب کیا ارادہ ہے؟" راستے میں جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے راشد نے سوال کیا۔

"تلاش کرنا ہے اسے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیسے تلاش کریں گے...... ہمارے پاس سوائے ان تصویروں کے اور کیا ہے؟"

"انہی تصویروں کی مدد سے ہم ان شاء اللہ اُسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" میں نے پُرعزم انداز میں جواب دیا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری اتنی بڑی دنیا میں محض ایک تصویر کے سہارے ہم اُسے قیامت تک نہیں ڈھونڈ سکتے۔"

"تم پھر سوچو ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟"

وہ لمحہ بھر کے لیے سوچوں میں مستغرق ہو گیا۔ جب کہ میں جواب طلب انداز میں اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہمارے پاس دو راستے ہیں۔" وہ قدرے توقف سے بولا۔ "مگر ان دونوں راستوں میں رسک ہے۔"

"کیسے راستے اور کیسا رسک...... کچھ پتا تو چلے؟"

"پہلا راستا تو یہ ہے کہ ہم یہ تصویریں انٹرنیٹ پر ڈال دیں، اس طرح ہمیں اُس کا کوئی نہ کوئی کلیو مل جائے گا اور دوسرا یہ کہ ہم اخبار میں اُس کی گم شدگی کا اشتہار دے دیں مگر ان دونوں باتوں میں رسک ہے۔ انٹرنیٹ پہ اُس کے بدنام ہونے کے سو فی صد چانسز موجود ہیں جب کہ اخبار میں اشتہار دینے کے لیے ہمیں اُس کے نام کی ضرورت پڑے گی۔ بغیر نام کے ہم صرف ایک صورت میں اشتہار دے سکتے ہیں۔ ہمیں اشتہار میں اُسے پاگل قرار دینا ہوگا۔ اس صورت میں ہم اُسے ایک فرضی نام دیں گے اور اشتہار میں یہ لکھوائیں گے کہ وہ پاگل ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اپنا نام غلط بتاتی ہے۔" راشد نے تفصیلی جواب دیا۔

"پاگل والا آئیڈیا ٹھیک رہے گا۔" میں نے رائے دی۔

"اس میں بھی کئی رسک ہیں۔ اگر وہ کسی بڑے گھر کی نکل آئی تو بلاشبہ ہماری شان دار دھلائی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اس کا بھی ایک حل موجود ہے۔ ہم اشتہار میں ایڈریس کی بجائے صرف موبائل فون نمبر دیں گے اور وہ بھی اَن رجسٹرڈ نمبر، کوئی ہمیں ٹریس نہیں کر سکے گا۔ میرے پاس ایک اَن رجسٹرڈ سم موجود ہے۔ اُس پہ کال ریسیو ہوتی ہے مگر کال کی نہیں جا سکتی۔"

بات میں چونکہ وزن تھا۔ اس لیے وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "گڈ پہلی بار میں ایک عقل مند پٹھان دیکھ رہا ہوں۔ ہم بالکل ایسا کر سکتے ہیں۔"

"تو چلو پھر آج ہی یہ کام کرتے ہیں۔" میں پُرجوش ہو گیا۔ "بیک وقت تین چار اخباروں میں اشتہار دے دیتے ہیں۔"

وہ بولا "فرض کرو اگر وہ غیر ملکی ہوئی تو اخبار میں اشتہارات لگانے کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"نقصان بھی نہیں ہوگا۔"

"او کے جیسے تمہاری مرضی...... تم نے کہاں کسی کی سنی ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یار میں تو کہتا ہوں دفع کرو اس خوابوں والی کو اور کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو...... ویسے بھی یہ کام بہت رسکی ہے تم کسی بہت بڑی مصیبت میں بھی پڑ سکتے ہو۔" اُس نے ناصحانہ انداز میں جواب دیا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا، تم کسی قسم کی ٹینشن مت لو۔"

"ایک بار پھر سوچ لو میں انکل ولاور کے سامنے کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا۔ "بے فکر رہو میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ میرا ذاتی فعل ہے اور اس کی ساری ذمہ داری میں خود قبول کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہم ابھی یہ کام نمٹا لیتے ہیں۔"

ہم نے باری باری ملک کے تین مشہور اخبارات میں اشتہارات نوٹ کروا دیے جو کل کی اشاعت کے لیے بک ہو گئے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد جب ہم واپسی کے لیے روانہ ہونے لگے تو راشد بولا۔ "کیا خیال ہے لنچ کسی ریسٹورنٹ میں کر لیں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر آنٹی ضرور ناراض ہوں گی۔"

"کوئی بات نہیں اُسے میں منا لوں گا۔"

"تو پھر چلو کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کا رخ کرو۔ میں بھوک سے بے حال ہوا جا رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک شان دار ریسٹورنٹ میں بیٹھے لنچ کر رہے تھے۔ کھانا بے حد لذیذ تھا سو میں نے ڈٹ کر کھایا۔ کسر راشد نے بھی نہیں چھوڑی تھی۔ کھانے کے بعد ہم نے ایک ایک کپ گرین ٹی کا نوش

کیا اور پھر بل ادا کرتے ہوئے ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ جب ہم جیپ میں سوار ہونے لگے تو راشد کا فون بجنے لگا۔ اُس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ "ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں امی۔" ایک لمحے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ "سوری امی! آپ لوگ لنچ کر لیں ہمارا انتظار نہ کریں۔"

اس کے بعد وہ چند لمحے آنٹی کی بات سنتا رہا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "دراصل امی! وہ باس بہت اصرار کر رہا تھا تو لنچ ہم نے اُس کے ہاں کر لیا۔"

پھر آنٹی نے کچھ کہا تو وہ بولا۔ "ٹھیک ہے امی میں لیتا آؤں گا..... اوکے بائے۔" اُس نے کال ڈس کنکٹ کرتے ہوئے سیل فون جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

دوسرے دن جب راشد کہیں گیا ہوا تھا تو حنا میرے کمرے میں سنجیدہ چہرہ لیے داخل ہوئی۔ اُس نے ہاتھ میں ایک مشہور و معروف اخبار پکڑ رکھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے کہ وہ شاید مجھ سے اشتہار کے متعلق کچھ پوچھے گی مگر جب اُس نے ایسی کوئی بات نہ کی تو تب مجھے یاد آیا کہ میں نے تو اشتہار میں سوائے سیل فون نمبر کے کوئی ایڈریس وغیرہ نہیں دیا تھا۔ سو اُسے کیسے خبر ہو سکتی تھی؟ چنانچہ میں مطمئن ہو گیا۔

"آؤ حنا! کیسی ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں یہ اخبار دینے آئی ہوں، لو۔" اُس نے اخبار آگے بڑھایا۔ اُس کے چہرے پر بے رخی کے تاثرات ثبت تھے۔

"شکریہ۔" میں نے اخبار لیتے ہوئے کہا۔ "کیا کوئی نئی تازی ہے اس میں؟"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اخبارات میں۔" اُس نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے استفسار کیا۔

"بکواس اور جھوٹ کے علاوہ کیا ہوتا ہے اخبار میں؟"

"شوبز، سائنس، کھانے پکانے کی ترکیبیں اور مزے مزے کے دل چسپ آرٹیکلز ہوتے ہیں۔ اخبارات کے مطالعہ سے انسان کے نالج میں اضافہ ہوتا ہے۔ نالج میں اضافہ انسان کی شخصیت کو سحر انگیز بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔"

"جسے مسحور کرنا تھا اُس پر تو کسی اور کا جادو چل چکا ہے۔ اب نالج میں اضافہ کرنے کا کیا فائدہ؟" اُس نے ہونٹوں پر ایک دُکھی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے پوچھا۔

اُسے یوں مایوسی کے عالم میں دیکھ کر نجانے کیوں میرا دل دکھنے لگا۔ مگر میں مجبور تھا۔ پہلے ہی کسی زلف کا اسیر تھا۔ اُسے جھوٹے خواب دکھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ سو معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "حنا یقین کرو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو لیکن میں اس کم بخت دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں پہلے اُسے تلاش کروں گا جس نے میری راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ اگر وہ......"

"نہ ملی تو پھر تیری طرف لوٹ آؤں گا۔" وہ میری بات قطع کرتے ہوئے بولی۔ "یہی کہنا چاہتے تھے ناں تم؟"

"نہیں تم غلط سوچ رہی ہو، میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔"

"کیا کہنا چاہتے تھے؟" اُس کے انداز میں تحیر تھا۔

"رہنے دو، میں کسی خود غرض سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں نے بے رُخی سے جواب دیا۔

"سوری شیر دل!" اس نے ندامت کا اظہار کیا۔ "محبت ہوتی ہی خود غرض ہے۔ یہ صرف اپنا نفع دیکھتی ہے۔ دوسروں کا خسارہ اسے کبھی نظر نہیں آتا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔ دراصل جہاں چوٹ لگتی ہے درد وہیں ہوتا ہے۔"

"او کے ابھی جاؤ...... مجھے اخبار پڑھنا ہے۔"

"تو......" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گے میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

"ہم میں ایسا کون سا رشتہ ہے کہ بات معافی تلافی تک پہنچ جائے؟" میں نے ناگواری سے سوال کیا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ دوسرے ہی پل اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ عورت کے آنسو اور ساون کی بارش وقت کی قید سے دونوں آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے برسنے اور رکنے کا کوئی وقت اور موقع طے نہیں ہوتا۔ عورت تو ذات ہی ایسی ہے کہ غم اور خوشی دونوں کا استقبال آنسو بہا کر کرتی ہے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے الفاظ پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ بے شک میں اس سے پیار نہیں کرتا تھا مگر کسی کا دل توڑنا بھی میں معیوب سمجھتا تھا۔ کافی دیر تک میں پشیمانی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ہاتھ میں پکڑے اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنا دیا ہوا اشتہار چیک کیا۔ اشتہار پورے اہتمام کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ تصویر بھی ایک کونے میں لگی ہوئی تھی جو بلاشک و شبہ نہایت ہی صاف و شفاف تھی۔ اشتہار چیک کرنے کے بعد میں دیگر ملکی خبریں پڑھنے لگا۔ حسب معمول خودکش حملوں، ٹارگٹ کلنگ، بم بلاسٹ، اغوا برائے تاوان اور ڈکیتی سے متعلق خبریں تھیں۔ یہ وہ خبریں تھیں جن کے عوام اب عادی ہو چکے تھے۔ اب ایسی خبروں کے بغیر اخبارات بکتے ہی نہیں تھے۔ پرنٹ میڈیا کو خود بھی ایسی ہی خبروں کا چسکا پڑ چکا تھا۔ بصورت دیگر ان کا دھندا مندا پڑنے لگتا تھا۔

میں اخبار میں کھویا ہوا تھا کہ ایسے وقت میرا اصل فون بج اٹھا۔ میں نے فون نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی تو ایک اجنبی نمبر جھلملا رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے "ہیلو۔" کہا تو دوسری طرف سے بابا جان کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ "شیر دل! جہاں بھی ہو، جیسے بھی ہو فوراً گھر پہنچ جاؤ۔"

میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ "خیر تو ہے بابا جان! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟"

"ہاں خیر ہے بھی اور نہیں بھی۔" انہوں نے عجیب سے انداز میں جواب دیا۔

"م...... میں...... سمجھا نہیں بابا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"الو کے پٹھے!" وہ چلائے۔ "میں نے کہا ہے کہ فوراً گھر پہنچ جاؤ، چاہے جس حالت میں بھی ہو۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے وہ فون پر نہیں بتایا جا سکتا۔"

"پھر بھی بابا جان! مجھے کچھ اندازہ تو ہو تاکہ......"

"گدھے! تم کون سی زبان سمجھتے ہو؟" انہوں نے میری بات کاٹی۔ "جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔ میں کسی پڑوسی کے فون سے بات کر رہا ہوں۔ وقت مت ضائع کرو۔"

"جی...... جی...... بابا جان! م...... میں بس ابھی نکلتا ہوں۔" میں نے اٹکتے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں نے فوراً راشد کو کال کی اور اُسے بابا جان کے فون کے متعلق بتا دیا۔

وہ بولا۔ ''او کے...... میں بس ابھی گھر پہنچتا ہوں ......ویسے انکل نے کچھ بتایا تو ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں بتایا یار......حالانکہ میں بار بار پوچھتا رہا۔ خدا خیر کرے مجھے تو معاملہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ یقیناً کوئی اہم واقعہ ہو چکا ہے ورنہ بابا جان مجھے کبھی اس قدر پریشان دکھائی نہیں دیے۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔

''اللہ تعالیٰ سے بہتری کی اُمید رکھو یار۔'' وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''انکل ولاور کو تو ویسے بھی بات بتنگڑ بنانے کی عادت ہے۔ ہوگا کوئی چھوٹا موٹا عام نوعیت کا مسئلہ تمہیں پریشانی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں یار بابا جان عام باتوں کے خاطر میں نہیں لاتے۔ مجھے تو لگتا ہے مہردل نے پھر کوئی اُلٹا سیدھا کام کر دیا ہے۔ وہ بہت جذباتی نوجوان ہے غصہ تو سمجھو ہر وقت اُس کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کسی کی بھی نہیں سنتا بس اپنی مرضی کرتا ہے۔''

''کہیں تمہاری اُس وڈیو والا معاملہ نہ ہو؟'' اُس نے خیال ظاہر کیا۔ ''صمریار جیسے کمینے آدمی سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔''

اُس کے منہ سے وڈیو کا سن کر میری پریشانی مزید بڑھ گئی۔ کیونکہ ایسا ممکن تھا۔ صمریار خان اُنھیں وہ شرمناک وڈیو بھیج سکتا تھا۔ تاہم میں اُس سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں یار! یہ اُس وڈیو والا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ بات کچھ اور ہے۔ اگر وڈیو والا معاملہ ہوتا تو بابا جان مجھے بلانے کی بجائے خود یہاں پہنچ جاتے۔''

''او کے اللہ بہتر کرے گا۔ میں ابھی پہنچتا ہوں۔''

''میں منتظر ہوں......او کے اللہ حافظ۔'' اتنا کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

راشد میری توقع سے بھی پہلے پہنچ گیا۔ اُس کے پہنچتے ہی میں نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ جب آنٹی اور حنا کو میری واپسی کی خبر ہوئی تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ آنٹی بولی۔ ''ابھی تجھے یہاں آئے ہوئے دو تین دن ہی تو گزرے ہیں اور اتنی جلدی واپس بھی جا رہے ہو، آخر بات کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آنٹی! مجھے خود بھی اتنی جلدی واپس جانے کا افسوس ہے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔ میں بابا کا حکم نہیں ٹال سکتا۔''

''شاید اس کا دل نہیں لگتا یہاں......اسی لیے واپس جا رہا ہے۔'' حنا نے ذومعنی انداز میں مداخلت کی۔

میں نے کہا۔ ''حنا صاحبہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل گھر میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے ورنہ میں اتنی جلدی کبھی بھی واپس نہ جاتا۔''

''کیسا مسئلہ......خیر تو ہے؟'' آنٹی نے عجب انداز میں پوچھا۔

''تھوڑی دیر قبل بابا کا فون آیا تھا۔ اُنھوں نے مجھے فوراً واپس پہنچنے کا حکم دیا ہے۔''

''کیوں...... کس لیے؟''

''یہ تو اُنھوں نے نہیں بتایا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

آنٹی راشد کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''مجھے فون دو میں خود بھائی صاحب سے بات کرتی ہوں۔''

''آنٹی! ہمارے گھر میں میرے بعد صرف مہردل کے پاس سیل فون ہے۔ آپ بابا جان سے بات نہیں کر سکتیں تاہم مہردل سے بات کرنا چاہیں تو میں کرا دیتا

ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" آنٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔" تم مہردل سے رابطہ کرو میں اُس سے بات کرتی ہوں۔ پتا تو چلے کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟"

میں نے جیب سے سیل فون نکال کر مہردل کا نمبر ملایا مگر رابطہ نہ ہو سکا مہردل نے سیل فون آف کر رکھا تھا۔

"سوری آنٹی! مہردل کا فون آف ہے۔" میں نے آنٹی کو بتایا۔

"تو پھر کیا تم چلے جاؤ گے؟" آنٹی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔" آنٹی! جانا تو پڑے گا ورنہ بابا جان خود مجھے لینے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" راشد نے مداخلت کی۔

"نہیں یار! تم رہنے دو...... میں چلا جاؤں گا۔"

آنٹی بولی۔" راشد ٹھیک کہتا ہے۔ تم اسے ساتھ لے جاؤ، کیا پتا تمہیں وہاں اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

"امی! میں بھی چلوں گی۔" حنا نے خواہش ظاہر کی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" راشد نے اُسے گھورا۔" ہم کوئی پکنک منانے جا رہے ہیں؟"

"مجھے گاؤں دیکھنے اور زرغونہ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔" وہ مچلی۔" پلیز...... مجھے بھی ساتھ لے جاؤ...... امی! آپ کہیں ناں بھائی سے۔"

"نہیں۔" آنٹی نے انکار میں سر ہلایا۔" اس وقت تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔ جب میں اور تمہارے پاپا جائیں تو پھر تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

"پلیز...... پلیز...... پلیز امی! ابھی جانے دیں ناں؟" حنا نے التجا کی۔

آنٹی نے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ "کتنی بار سمجھایا ہے کہ بچوں کی طرح ضد مت کیا کرو ورنہ بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔"

"ہر کوئی مجھ پر رعب جھاڑتا ہے۔" حنا پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔ جب کہ آنٹی راشد کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تم فوراً تیاری کرو بیٹے! نجانے بھائی صاحب کو کیا مسئلہ پیش آ گیا ہے۔"

اس کے بعد چند لمحوں کے اندر راشد نے تیاری کی اور ہم آنٹی کو خدا حافظ کہتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ حنا خفا ہونے کی وجہ سے ہمیں رخصت کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ واقعی بے حد ضدی لڑکی تھی۔ بس اپنی منوانا جانتی تھی دوسروں کے احساسات و جذبات کی اُسے ذرا بھر بھی پرواہ نہیں تھی۔

☆☆☆

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا جب ہماری جیپ حویلی میں داخل ہوئی۔ گیٹ میرے ایک رشتہ دار نے کھولا تھا۔ اُس نے مجھ سے اور راشد سے مصافحہ کیا اور پھر پشتو میں بولا۔ "آپ لوگ اِدھر حجرے میں آ جائیں۔ سردار صاحب بھی وہیں موجود ہیں۔"

"ہیش گل! معاملہ کیا ہے؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"چھوٹے سردار کی لڑائی ہوئی ہے صمد یار کے آدمیوں کے ساتھ۔" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"مہردل کی؟"

"ہاں مہردل کی۔" اُس نے دوبارہ اختصار سے کام لیا۔

"کب اور کہاں ہوئی ہے..... مہردل ٹھیک تو ہے ناں؟" میں نے بے صبری سے سوال کیا۔

"وہ شیر ہے اور شیر کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" ہیش گل نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"تھینکس گاڈ..... اس کا مطلب ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا؟" میں نے مطمئن انداز میں پوچھا۔

"چھوٹے سردار کو کچھ بھی نہیں ہوا البتہ صمد یار خان کے دو بندے موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ وہ چھ تھے جب کہ چھوٹا سردار اکیلا تھا۔ اگر آپ بھی اُس کا ساتھ دیتے تو آج صمد یار خان کا ایک بندہ بھی بچ کر نہ جاتا۔"

ہیش گل کی بات سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور سر گھومنے لگا۔ جس دشمنی کو ختم کرنے کے لیے میں نے اپنی مردانگی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور عورتوں کی طرح اپنی کلائی میں چوڑیاں پہن لی تھیں۔ وہ دشمنی ختم ہونے کی بجائے چنگاری سے شعلہ بن چکی تھی۔ اب میری اُس شرمناک وڈیو کو منظرِ عام پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ صمد یار خان اپنے دو بندوں کی ہلاکت کسی طرح بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ ایک زہریلا ناگ تھا اور مہردل انجانے میں اُس کی دُم پر پاؤں رکھ چکا تھا۔ اب مہردل کا بچنا محال تھا۔ اُسے آج یا کل صمد یار خان کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جانا تھا۔

"مہردل اس وقت کہاں ہے؟" اچانک کسی خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔

"وہ بھی حجرے میں ہے۔" ہیش گل نے جواب دیا۔

"احمق ہو تم سب لوگ۔" میں چلایا اور پھر راشد سے اُردو میں مخاطب ہو کر کہا۔ "تم جیپ اسٹارٹ رکھو، میں ابھی مہردل کو لے کر آتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر میں حجرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے ہر حال میں اپنے بھائی کو بچانا تھا۔

(اس سنسنی خیز داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ملاحظہ کیجیے)

آج کل زبان کے علاوہ قلم بھی اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ ہے بلکہ قلم میں تلوار سے بھی زیادہ طاقت ہے۔ تلوار سے آپ مخالف کو ڈرا دھمکا سکتے ہیں بلکہ اس کو قتل بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کا ذہن نہیں بدل سکتے لیکن قلم کا وار اتنا کارگر ہے کہ اذہان پر اثر انداز ہو کر خیالات کے دھارے کو بدل دیتا ہے۔

محمد افضل رحمانی

سیدھا سادہ راہی

میں تنقیدی مضمون بہت کم لکھتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں جائز تنقید ہر کسی کا حق ہے لیکن تنقید کی آڑ میں بہتان اور بدتمیزی اور غیر پارلیمانی لہجہ تو کسی صورت میں بھی مستحسن نہیں ہے۔ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے ڈکشنری میں ایسے الفاظ کی کمی نہیں جن سے سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی محفوظ رہتی ہے۔ ویسے بھی میٹھے بول میں جادو ہوتا ہے خصوصاً جب آپ کا مقصد کسی کی اصلاح کرنا ہو تو آپ کو پہلے اپنے لہجے اور الفاظ میں شہد بھرنے کی کوشش کرنی چاہیے! دیکھیں آپ اگر کانے کو براہ راست کانا کہہ دیں گے تو وہ انتہائی برا محسوس کرے گا اور اگر آپ اس سے ہمدردانہ لہجے میں پوچھیں گے کہ بھائی صاحب آپ کی آنکھ کس طرح ضائع ہوئی تھی تو وہ خود ہی کہے گا کہ جناب میں اس طرح کانا ہوا تھا۔ اور اگر آپ اس کو ضرور کانا کہنا ہی چاہتے ہیں تو اس کے لیے بھی ایک بہترین طریقہ ہے چنانچہ مشہور ہے کہ ایک ریاست کے راجہ صاحب یک چشم تھے ظاہر ہے اب انہیں کوئی کانا کہتا تو راجہ صاحب کا عتاب نازل ہوتا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حالتِ غضب میں راجہ صاحب اسے قتل کرا دیتے۔ ایک میراثی نے یہ دعویٰ کیا کہ میں ایک بار نہیں بلکہ دو بار راجہ صاحب کو کانا کہوں گا لوگوں نے کہا ٹھیک ہے اگر تم بچ گئے تو ہم تمہیں بہت سا انعام دیں گے! اب وہ میراثی راجہ کے دربار میں پہنچا اور میراثیوں کی طرح آداب بجالایا اور پھر راجہ صاحب کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی۔

اکو اکھ سلکھنی بہہ نیاں ڈھالے
نیوں نیوں کرن سلاماں دو اکھیاں والے

اب آپ غور کریں پہلے مصرے میں بھی راجہ کو کانا کہہ گیا اور دوسرے میں بھی! پہلے مصرے میں راجہ کو ایک آنکھ والا کہا! اور دوسرے میں عام لوگوں کو دو

آنکھوں والا کہہ کر رجبہ کو پھر ایک آنکھ والا کہہ گیا۔ اور اس طرح رجبہ صاحب سے بھی انعام اکرام لے لیا اور لوگوں سے بھی۔ کوئے کی کائیں کائیں اور کوئل کی کوکو میں فرق واضح ہے۔ زبان ہر ایک کے منہ میں ایک جیسی ہے لیکن بولنے کے انداز سے کوے اور کوئل میں فرق کا پتہ چلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا تھا کہ تم دو چیزوں کی ضمانت مجھ کو دے دو میں تمہیں جنت کی ضمانت دے دیتا ہوں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کون سی دو چیزوں کی ضمانت دے دوں؟ ارشاد فرمایا! زبان اور شرمگاہ کی! آج کل زبان کے علاوہ قلم بھی اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ ہے بلکہ قلم میں تلوار سے بھی زیادہ طاقت ہے۔ تلوار سے آپ مخالف کو ڈرا دھمکا سکتے ہیں بلکہ اس کو قتل بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کا ذہن نہیں بدل سکتے لیکن قلم کا وار اتنا کارگر ہے کہ اذہان پر اثر انداز ہو کر خیالات کے دھارے کو بدل دیتا ہے۔

تلوار استعمال نہ کریں!

ساقی چیمہ کا مضمون "تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی" بعض دوستوں کے توجہ دلانے پر پڑھا۔ موصوف نے اُس میں لکھا ہے! "ساقی چیمہ قلم سے نہیں تلوار کو سیاہی میں ڈبو کر لکھتا ہے۔" اور اپنی دوسری صفت یہ بیان کی۔ "میں نے زندگی بھر بوقت ضرورت ہاتھ پاؤں کا استعمال بھی کیا ہے جہاں بھی لاتوں کے بھوت سامنے آئے اور کبھی ڈرا نہیں۔"

زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لیے
عہد کم ظرف کی ہر بات گوارہ کر لیں

گویا ساقی صاحب تلوار سے لکھتے ہیں اور ہاتھ پاؤں کا استعمال بھی کر لیتے ہیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ ان جیسا زود نویس کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔" چنانچہ ہاتھ پاؤں چلانے کا عملی مظاہرہ انہوں نے اس طرح کیا!

ٹرین میں کوئی ہجوم ناں تھا صرف سیٹوں پر سبز رنگ کی پگڑیوں والے مولوی بیٹھے ہوئے تھے میں نے ایک بوگی میں سوار ہونا چاہا مگر اندر بیٹھے مولوی نے دروازہ ناں کھولنے دیا میں اس بوگی پہ گیا جس کا نمبر میرے پاس تھا وہاں بھی یہی مسئلہ تھا میں نے ایک مولوی کی پگڑی کھینچ کر باہر پھینک دی دوسرے کے ساتھ بھی یہی کیا؟"

اعتراف حقیقت

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ امت میں علماء سوء کا ایک گروہ موجود ہے اور جعلی اور کاروباری پیروں کا فراڈ بھی بام عروج پر ہے میرا قلم اور زبان حتیٰ الوسع ان لوگوں کی تردید میں حصہ بقدر جثہ حصہ ڈالتی رہتی ہے قارئین کرام میری تحریروں میں اس قسم کے لوگوں کے متعلق کافی پڑھ چکے ہوں گے۔ میری تصنیفات میں ان لوگوں کا رد ضرور ہوتا ہے لیکن یہ محض چند لوگ ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ارباب اختیار شو پیس کے طور پر چند ضمیر فروش مولویوں اور جعلی پیروں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں تاکہ سیدھے سادے مسلمان یہ سمجھیں کہ اسلام تو ان کے پاس بھی ہے۔ ایسے مولوی اور پیر ہر تھالی کے بینگن اور ہر چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں ادھر اقتدار بدلتا ہے ادھر یہ شیروانی پہن کر قراقلی سجا کر، چشمے لگا کر۔ چہرے پر مکاری کی سیاہی مل کر مقفع و مسجع قصیدے تیار کر کے ان بادشاہوں کے دربار میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ علم فروش ان لوگوں کے سامنے صف بنا کر دست بستہ ہو کر ایسے خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں گویا رب کے دربار میں کھڑے ہیں۔ صاحب اقتدار اگر رات کو دن کہے تو یہ فوراً ہاں

میں ہاں ملاتے ہیں اور اگر دن کو رات کہے تو یہ فوراً تارے گننا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر گالی بک دے تو یہ مکرر مکرر کی آواز سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور اگر گپ لگا دے تو یہ فوراً ڈائری میں نوٹ کر لیتے ہیں تاکہ یہ نایاب تحفہ کہیں ضائع نہ ہو جائے اور اگر کوئی گھسا پٹا فضول سا لطیفہ سنا دے تو یہ ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار بن جاتے ہیں۔ یہی حال بعض قصہ گو واعظوں کا ہے یہ آدھے قوال اور گویے ہوتے ہیں۔ انہیں فنکاری پر پورا پورا عبور حاصل ہوتا ہے یہ حسب موقع رونی سی صورت بھی بنا لیتے ہیں اور قہقہے بھی لگا لیتے ہیں ان کا مبلغ علم عام طور پر مینہ المصلی، یکی روٹی، داستان یوسف اور چند قصوں کی کتابوں تک محدود ہوتا ہے۔

ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے جلیانوالہ باغ میں وقت کے چنگیز خان جنرل ایڈوائر جس نے پندرہ سو انسانوں کا خون بہا دیا تھا جس پر ہندوستان کے درو دیوار چیخ اٹھے تھے حضور سپاسنامہ پیش کیا تھا ادھر چیمہ صاحب کے ممدوح مقامات مقدسہ کی حرمت کو تاراج کر رہے تھے خلافتِ اسلامیہ کو تباہ کیا جا رہا تھا جزیرۃ العرب پر بالواسطہ قبضہ کر لیا گیا تھا ادھر یہ لوگ ملکہ برطانیہ کی تاجپوشی پر چراغاں کر رہے تھے!

تصویر کا دوسرا رخ

علماء حق اس وقت بھی میدان میں تھے اور ظالم و جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا حق ادا کر رہے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایسے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے باغ لنگے خاں میں مسلسل تین دن خطاب فرمایا:

اے پیرانِ طریقت! یہ سپاسنامہ فرنگی کے حضور پیش کر کے آپ نے اپنے آباؤ اجداد کی تعلیم، ان کے اصول، ان کی روحانی زندگی پر وہ کالک مل دی ہے کہ قیامت تک یہ داغ دھویا نہیں جا سکے گا اور نہ یہ سیاہی مٹ سکے گی۔ اگر میں ابن سعود کی حمایت کروں تو کافر اور تم ترکوں کے قتل پر دستخط کرو تو مومن؟ تم فتح بغداد پر چراغاں کرو تو مسلمان اور میں فرنگی سے آزادی پر لڑوں تو مجرم؟ تمہارے تعویذ تمہاری دعائیں کافر کی فتح کی آرزومند رہیں اور میں سلطنت برطانیہ کی بنیاد اکھاڑنے کے درپے رہا۔

(حیات امیر شریعت)

حضرت شاہ جی انگریز کے کس قدر خلاف تھے اُن کی تقاریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے صرف چند جملے حاضر خدمت ہیں۔

میں اُن سوروں کا ریوڑ چرانے کے لیے بھی تیار ہوں جو برٹش امپیریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا ہوں ایک فقیر ہوں اور اپنے نانا ﷺ کی سنت پر کٹ مرنا چاہتا ہوں اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو اس ملک سے انگریز کا انخلا! دو ہی خواہشیں ہیں میری زندگی میں یہ ملک آزاد ہو جائے یا پھر تختہ دار پر لٹکا دیا جاؤں میں ان علماء حق کا پرچم لیے پھرتا ہوں جو 1857ء میں فرنگیوں کی تیغ بے نیام کا شکار ہوئے۔ رب کائنات کی قسم! مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ لوگوں نے پہلے ہی کب کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے۔ میں علمائے امت کے لشکر کا ایک خدمت گزار ہوں جنہیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ میرا ایک ہی نصب العین ہے برطانوی سامراج کو کفنانا یا دفنانا!

یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ اس راہ میں علماء حق کی ایک کثیر تعداد نے جان کی پرواہ کیے بغیر بے سروسامانی کے عالم میں ایک ایسی ظالم و جابر حکومت سے ٹکر لی جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا

تھا! مجھے افسوس ہے ساقی صاحب نے تصویر کا یہ دوسرا رخ نہیں دکھایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ساقی صاحب خود بھٹکے ہوئے راہی ہیں اور طبقہ علماء سے الرجک ہیں!

چیمہ صاحب کی شخصیت میرے لیے ایک معمہ بن گئی ہے۔ ہر رائٹر کے لکھنے کا کوئی نہ کوئی مقصد اور انداز ہوتا ہے میں نہ تو ان کا مقصد سمجھ سکا ہوں اور انداز بیان بھونڈا، بے ربط، اور بداخلاقی، بدحواسی اور ذہنی انتشار کا ملغوبہ ہے۔ آخر قلم کے بھی کچھ حقوق ہیں اس کی تو کوئی تک نہیں بنتی کہ آپ آنکھیں بند کر کے اپنے اندر کا بغض بغیر سوچے سمجھے اور بغیر دلیل کے بیان کرتے چلے جائیں۔ ہمیں بھائی چارے، پیار و محبت، اتفاق و اتحاد کی جتنی ضرورت آج ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھی اگر ہم چیمہ صاحب کی طرح کیچڑ اچھالنا شروع کر دیں گے تو معاشرہ تو پہلے ہی انتشار کا شکار ہے یہ کوئی اچھی مثال نہیں ہو گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کسی کی غلطی کی اصلاح کرنا چھوڑ دیں بس انداز بیان میں تبدیلی کرنا ہو گی ورنہ گالیوں کا کیا ہے وہ تو ہر کسی کو آتی ہیں صفحوں کے صفحے سیاہ کیے جا سکتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ چیمہ صاحب کی تحریر پڑھ کر میں ان کی شخصیت سے بدظن ہو گیا ہوں۔

ایڈیٹر حکایت کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں!

آپ داستان ایمان فروشوں کی شائع کرتے رہے ہیں اب آپ داستان دین فروشوں کی شروع کریں جو میں لکھوں گا بڑی بڑی داڑھیوں، موٹے پیٹوں، لمبی گاڑیوں، اونچے گیٹ کے پس پردہ رہنے والے انسانیت کے ان دشمنوں کے حقیقی کردار کی تفصیلات!

مجھے داستان دین فروشوں کی لکھنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن داڑھی، پیٹ، اور گیٹ وغیرہ سے پرہیز کریں اس طرح آپ کی داستان کو لوگ آپ کی ان لوگوں سے طبعی نفرت سمجھ کر کوئی سبق حاصل نہیں کر سکیں گے بلکہ وہ سمجھیں گے کہ ایک متعصب آدمی اپنے دل کا اُبال نکال رہا ہے۔

نواز شریف کے بارے میں لکھتے ہیں!

اور وہ شخص جو کونسلر بننے کا اہل نہ تھا دوسری دفعہ بھاری مینڈیٹ سے حکمران بن گیا اور اس کی محدود عقل میں یہ بات پھر بھی نہ آئی کہ وہ محض شطرنج کی بساط کا مہرہ ہے۔

نواز شریف صاحب سے سیاسی اختلاف اپنی جگہ ہو سکتا ہے مجھے چیمہ صاحب سے بھی زیادہ اختلاف ہو لیکن بات پھر وہی ہے کہ اختلاف کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ضرور غیر مہذب انداز ہی اختیار کریں بلکہ اس سے بھی سخت بات نرم اور سلجھے الفاظ میں بھی کہی جا سکتی ہے!

علماء کے متعلق لکھتے ہیں:

ہر ہفتہ دو دو گھنٹے یہ مائیک پہ چنگھاڑتے ہیں لوگوں کے کان بہرے کرتے ہیں ان کو نفسیاتی مسائل میں مبتلا کرتے ہیں لیکن کبھی ان لوگوں نے عوام کے حقیقی مسائل پر بات کی ہے؟

ہفتہ کو تو میں نے کبھی کسی ملا کو چنگھاڑتے نہیں سنا اور

ماشاء اللہ! جمعہ لکھتے تو ٹھیک تھا ویسے عام طور پہ یہ لفظ ہاتھی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے شاید چیمہ صاحب کی ڈکشنری میں نئے محاورات کا اضافہ ہو گیا ہو گا۔

یوں تو آپ کی پوری تحریر اسی طرح کے دل آزار فقروں سے بھری پڑی ہے صرف نمونہ دکھانا مقصود تھا۔ میرے خیال میں چیمہ صاحب کو ایسے انداز تحریر پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اپنے مؤقف کو نرم اور سلجھے انداز سے پیش کرنا چاہیے!

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ علماء کی جماعت میں کالی بھیڑیں بھی موجود ہیں۔ مشائخ حق کے ساتھ ساتھ مشائخ سوء کا ٹولہ بھی موجود ہے لیکن میں یہ بات ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوں کہ تمام کے تمام مشائخ اور علماء چیمہ صاحب کے ذہن کے مطابق بدترین مخلوق ہیں ارسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ میری امت کبھی بھی برائی پر اکٹھی نہیں ہو گی۔ یعنی کچھ لوگ ہمیشہ حق پر قائم رہیں گے۔ اور یہ بات تو ہم کسی بھی گروہ کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ وہ تمام کے تمام ہی معاذ اللہ راہ راست سے ہٹ گئے ہیں!

سیاستدان، بیورو کریٹ، جرنیل، سپاہی، اساتذہ، ڈاکٹر، رائٹر، سرمایہ دار، دکاندار، تاجر، دانشور، شاعر، ادیب، ملازم، آفیسر، پولیس مین، آجر، اجیر، وڈیرے وغیرہ سب کے سب برے ہیں؟ نہیں بلکہ ان میں اچھے بھی ہیں فرض شناس اور ہمدرد بھی! افسوس تو چیمہ صاحب پر ہے جنہوں نے خوف خدا کو پس پشت ڈال کر علماء کرام کے بارے میں کوئی استثناء نہیں کیا اور سب کو ہی یک جنبش قلم اپنے قلبی بغض کی بھینٹ چڑھایا!

قیام پاکستان اور علماء کا کردار

چیمہ صاحب صرف مولانا عثمانی کی بات کرتے ہیں حالانکہ ان کے ساتھ جید علمائے کرام کا پورا گروہ تھا مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے تمام متوسلین، مریدین نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ صوبہ سرحد (خیبر پختون خواہ) کے غیور پٹھانوں نے انہی علمائے کرام کے طوفانی دوروں اور تقاریر سے متاثر ہو کر ریفرنڈم کو کامیاب بنایا اور پاکستان میں شامل ہوئے۔ جبکہ خان عبدالغفار خان آزاد پختونستان کا شوشہ چھوڑ چکا تھا اور بھارت اور افغانستان نے خان صاحب کی ہر ممکن مدد بھی کی تھی۔ ساقی صاحب کو خان صاحب کا کردار کیوں نظر نہیں آیا۔ اور یہ اعزاز بھی ایک عالم دین کو ہی حاصل ہوا کہ پاکستان کا جھنڈا پہلی بار مولانا شبیر احمد عثمانی نے ہی لہرایا!

باقی جن علماء کرام نے قیام پاکستان کی مخالفت کی یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی نہ کہ مسلم دشمنی۔

چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی نے جمعیت علماء ہند کے اجلاس جونپور میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔ یہ اجلاس جون 1940ء میں منعقد ہوا دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی اس زمانہ میں جرمن فوجوں کو ابھی برتری حاصل تھی۔ جرمن فوجوں کا سیلاب پوری سلطنتوں کو تنکوں کی طرح بہا رہا تھا۔ ہندوستان میں ڈیفنس آف انڈیا رولس کا دور دورہ تھا آپ نے فرمایا!

اس زمانہ میں پاکستان کی تحریک زبان زد عوام ہے اگر اس کا مطلب اسلامی حکومت علیٰ منہاج نبوت (جس میں تمام اسلامی حدود و قصاص وغیرہ جاری ہوں) مسلم اکثریت والے صوبوں میں قائم کرنا ہے تو ماشاء اللہ نہایت مبارک اسکیم ہے کوئی بھی مسلمان اس میں گفتگو نہیں کر سکتا۔ مگر بحالت موجودہ یہ چیز متصور الوقوع نہیں اگر اس کا مقصد انگریزی حکومت کے ماتحت کوئی ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس کو مسلم حکومت کا نام دیا جا سکے تو میرے نزدیک یہ اسکیم محض بزدلانہ ہے جو ایک طرف برطانیہ کے لیے "ڈیوائڈ اینڈ رول" کا موقع فراہم کر رہی ہے اور یہی عمل برطانیہ نے ہر جگہ جاری کر رکھا ہے۔ ترکی کو اسی طرح تقسیم کیا گیا۔ عربی ممالک کو اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹا گیا اور یہی عمل ہندوستان میں مختلف پیرایوں سے ظاہر ہو رہا ہے کچھ عجب نہیں کہ اس کی وحی لندن، آکسفورڈ، کیمبرج، شملہ اور نئی دہلی وغیرہ سے ہوئی ہو جیسا کہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا۔

(اسیران مالٹا صفحہ 246)

دیکھا آپ نے اس خطبہ میں قیام پاکستان کو نہایت مبارک اسکیم کہا ہے۔ لیکن آپ کو ہندو اور انگریز پر شک تھا کہیں یہ مسلمانوں کے ساتھ تقسیم کے بہانے کوئی دھوکہ نہ کر جائیں اور مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑے۔ انگریز نے ترکی اور عرب ملکوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ان کے ذہن میں تھا لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ ان کی یہ رائے یا سوچ غلط ٹھہری!

اب آپ رائے کی غلطی کو مسلم دشمنی کا نام کیسے دے سکتے ہیں؟ ہاں البتہ اجتہادی غلطی کا علم ہو جانے کے بعد اس پر اڑے رہنا کوئی اچھی بات نہیں! اپنی غلطی کو تسلیم کر لینا ہی مردانگی اور مستحسن طریقہ ہے۔ چنانچہ امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ صاحب بخاریؒ نے 1952ء میں دفاع پاکستان کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صدا دیتے پھریں کہ میں توشہ وفاداری لیے پھرتا ہوں۔ میری انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو اور جس مقتل میں چاہو ذبح کر دو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہرگز نہیں ہوگا میں خوش ہوں میری خوشی فقط اس ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا میں دنیا کے کسی حصہ میں بھی سامراج کو نہیں دیکھ سکتا میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں! تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو میری رائے ہار گئی اور اس کہانی کو یہیں ختم کر دو...... اب پاکستان نے جب بھی پکارا واللہ باللہ میں اس کے ذرے ذرے کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا عزیز ہے جتنا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں اس طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو پھوڑ دی جائے گی۔ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائے گا میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلہ میں نہ اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اب بھی تمہارا ہے۔

(واقعات و کرامات علماء دیوبند صفحہ 310)

اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ علماء حق ہی تھے جنہوں نے انگریز کو یہاں سے بھگانے میں اہم کردار ادا کیا اور آزادی کی راہ ہموار کی اور قائد اعظمؒ اور ان کے ساتھیوں کے لئے قدرے آسانی پیدا کر دی اور یہ سعادت حضرت قائد اعظمؒ کو علماء کی کوششوں کی بدولت ہی ملی تفصیل اس وقت میرے موضوع سے خارج ہے۔

ساقی صاحب لکھتے ہیں! ”جب برطانوی راج مستحکم ہو گیا تو پہلی جنگ عظیم کے موقعہ پر کسی نامور ملا نے برطانوی ہند کی فوج میں بھرتی کے خلاف فتویٰ تو کیا بات تک ناں کی چونکہ ان میں سے اکثر اب انگریزوں کے تنخواہ دار یا حمایت یافتہ تھے۔“

ساقی صاحب کو اطلاعاً عرض ہے کہ کیا آپ نے کبھی تاریخ کو ہاتھ بھی لگایا واللہ آپ کی جہالت اور لاعلمی سے میں صرف حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہوں۔ سنئے! پہلی جنگ عظیم (از 28 جون 1914ء تا 11 نومبر 1918ء)

جمعیت علماء ہند کے اجلاس دوم کی صدارت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے فرمائی جس کی تجویز نمبر 2 کی ضمنی دفعہ 5 یہ تھی!

”دشمنان دین کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور کسی قسم کی فوجی امداد نہ پہنچانا! اس اجلاس کے صرف ایک ہفتہ بعد شیخ الہند کی وفات ہو گئی اور ان کے جانشین مولانا حسین احمد مدنی ہوئے چنانچہ انہوں نے آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کراچی میں جو اجلاس زیر صدارت مولانا محمد علی جوہر جو آپ کے ممدوح سرسید کی یونیورسٹی سے فارغ تھے کانفرنس کی جس کی ایک تجویز میں پولیس اور فوج کی ملازمت حرام قرار دی گئی یہ اس اجلاس کی چھٹی قرارداد تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نے اسے پڑھ کر سنایا اور کہا کہ یہ جلسے کی کارروائی کا لب لباب

ہے۔ پیر غلام مجدد نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر کچلو، مولانا نثار احمد، مولانا شوکت علی نے اس کی تائید میں تقریریں فرمائیں۔ پھر جگت گرو شنکر چاریہ نے انگریزی میں تقریر کی! اس کو فتوے کی صورت بھی دے دی گئی جس پر پیر غلام مجدد، مولانا حسین احمد اور مولانا نثار احمد نے دستخط کیے۔ جس کے نتیجے میں ساتوں محرکین، مؤیدین اور مقررین کو زیر دفعہ 120 (ب) 131 اور زیر دفعہ 117,505 تعزیرات ہند گرفتار کر کے کراچی جیل کی حوالات میں پہنچا دیا گیا۔

(مقدمہ کراچی کی روئیداد "قید آزادی" بحوالہ اسیران مالٹا صفحہ 143,142)

اس مقدمہ میں جگت گرو کے علاوہ باقی سب کو دو دو سال قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔ مقدمے کی کارروائی کی تفصیل دلچسپ اور ایمان افروز بھی ہے۔

(تفصیل ملاحظہ فرمائیں "اسیران مالٹا صفحہ 145 تا 164)

دوسری جنگِ عظیم میں بھی جمعیۃ علماء ہند نے تقریباً اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہندوستان اپنی تمام عظمت اور وسعت کے باوجود برطانیہ کی جیب کا ایک سکہ تھا اس کو حق تھا کہ جہاں چاہے اور جس طرح چاہے اس کو خرچ کر لے۔ چنانچہ 3 ستمبر 1939ء کو شاہ برطانیہ نے برطانیہ اور اُس کی نوآبادیات کی طرف سے جرمنی اور اٹلی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ وائسرائے ہند نے اس اعلان کی تائید کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو جنگ میں شامل ہونے کا آرڈر دیا۔ چنانچہ انگریزوں کے تمام نمک خواروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا! اب علماء کا کردار ملاحظہ فرمائیں!

16 ستمبر 1939ء کو مجلس عاملہ جمعیت علماء ہند کا اجلاس میرٹھ میں ہوا اس نے اپنے طویل بیان میں شرکتِ جنگ کے متعلق برطانیہ کے تمام دلائل کی تردید کرتے ہوئے خود اس کے وہ مظالم شمار کرائے جو اپنے ماتحت ملکوں میں وہ کر رہا تھا پھر یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ جمعیت علماء ہند کا نصب العین مکمل آزادی ہے فیصلہ یہ کیا کہ مجلس عاملہ کسی بھی نقطہ نظر سے بحالتِ موجودہ اس جنگ میں برطانوی امپریلزم کی امداد کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں پاتی۔

اوپر کے دو حوالے پڑھیے اور بے خبر چیمہ صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت! "دوسری جنگ عظیم میں اہل ہند کے یہی ملا انگریز فوج میں بھرتی کے لیے تعاون کر رہے تھے۔"

چیمہ صاحب کی تحریر چونکہ مجموعہ تضادات ہے ایک بات ابھی پوری نہیں ہوتی کہ دوسری جبراً اس میں ٹھونس دیتے ہیں۔ عبارت کا مفہوم اس قدر غیر واضح ہوتا ہے کہ دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ تاریخی حقائق سے ناواقف محض ! نمونہ دیکھئے۔ "اس کے برعکس جنگ کے خاتمہ پر انگریزوں نے دو کے سوا کوئی بندہ مقدمہ چلائے بغیر نہ مارا اور عورتوں بچوں کا جنگ میں بھی خیال کیا۔"

کاش چیمہ صاحب! اُن دو کے نام بھی لکھ لیتے جو بغیر مقدمہ چلائے مار دیے گئے۔ باقی سب کو مقدمہ چلانے کے بعد مارا گیا۔ سوال یہ ہے کہ عدالتیں کس کی تھیں؟ جج کون تھے؟ مسلمانوں کو کس جرم میں عدالتوں میں گھسیٹا گیا اور پھر تختہ دار پر کھینچا گیا۔ سولی گھروں کی تعداد کم پڑنے پر درختوں سے لٹکا کر سولی دیا گیا۔ فاتح جرنیل نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو قتل کر کے ان کا خون پیا۔ بادشاہ کو ملک بدر کر دیا گیا۔ شہزادیاں در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئیں۔ ملک پر غاصبانہ قبضہ بھی کر لیا پھر الٹا مقدمات بنائے۔ میں چیمہ صاحب سے پوچھتا ہوں جلیانوالہ باغ میں 1500 لوگوں کو آناً فاناً قتل کر دیا گیا انہیں کون سی عدالت میں پیش کیا گیا تھا؟

چیمہ صاحب خدا کا خوف کریں حقائق کبھی مسخ نہیں ہوتے میں صرف معمولی اشارے کرتا جا رہا ہوں طویل مضمون کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں

چیمہ صاحب نے علماء کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ان کے اپنے ذہن کا گند ہے رسول اللہ ﷺ نے تو علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء جیسے ہیں اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ترجمہ: بے شک علماء ہی میرے بندوں میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں! اور حدیث پاک میں ہے کہ ایک عالم کی فضیلت عابد پر اتنی ہے جتنی میری فضیلت تمہارے کسی ادنیٰ پر ہے۔

خلاف حقیقت

صرف 90 برس کے قلیل عرصہ میں انگریزوں نے ہندوستان میں دنیا کا سب سے بڑا ریلوے نظام، تار اور فون کا نظام، دنیا کا سب سے بڑا آبپاشی نظام، سڑکوں اور تعلیمی اداروں کا جال اور لاکھوں کی تعداد میں روزگار کے مواقع پیدا کیے یہ سب اقتدار کے محض پہلے تیس سال میں ہوگیا تھا۔

عبارت ایک بار پھر پڑھیں پہلے نوے سال اور دوسری لائن میں محض تیس سال معلوم ہوتا ہے مرض نسیان میں بھی مبتلا ہیں!

چلیں مان لیتے ہیں ریلوے کا نظام بنایا! کیا ریلوے انجن بنانے کی ٹیکنالوجی بھی ہندوستان کو دی؟ ٹیکنالوجی اپنے پاس ہی رکھی تاکہ برطانیہ کے خزانے میں ہندوستان کا پیسہ کھنچتا چلا جائے۔ اگر نہری نظام بنایا تو مالیہ اور آبیانہ کس کے خزانے میں جاتا تھا؟ میں یہاں اس ظالمانہ نظام پر بحث نہیں کروں گا کہ غریب کسانوں پر کس طرح پٹواری نظام کے تحت ظلم و بربریت کا بازار گرم کیا۔ اگر تعلیمی ادارے بنائے تو مسلمانوں کو کون سی تعلیم دی یہ موضوع بھی ابھی نہیں چھیڑتا اس لیے کم از کم ایک ہزار صفحے لکھوں تو پھر بھی تشنہ رہ جائے گا! اب آیئے روزگار کی طرف! اور ہندوستانیوں کی عمومی حالت پہلے ان کے اپنے گھر کی گواہی مسٹر میکڈ انلڈ ریمزے "اویکننگ آف انڈیا" صفحہ 14 پر لکھتے ہیں۔

روز بروز کوئی اس ملک کا دورہ کرے تو سوائے دبلے ناتواں اجسام کے اور کچھ نہ دیکھے گا جن کی زندگی محنت، محنت، مشقت، مشقت، مشقت ہے۔ ہندوستان فلاکت زدوں کی بستی ہو کر رہ گئی ہے اور اُن غریبوں کی مصیبت اور بھی میرے دل میں گڑ گئی جب کہ میں نے غور کیا اور دیکھا کہ کس طرح ان کی فلاکت و افلاس کے نمایاں آثار ان کی پُرسکون اور پُرعظمت خاموشیوں میں مستور ہیں۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ہندوستانیوں کا افلاس ایک مسئلہ یا کلیہ نہیں ہے بلکہ ایک امر واقع ہے۔ (اویکننگ آف انڈیا صفحہ 159)

سر جان سائن اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں:

"عام آبادی انتہائی افلاس میں ہے۔"

ایچ۔ ایم۔ ہنڈرسن کہتے ہیں:

ہندوستان روز بروز کمزور و ناتواں ہوتا جا رہا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی زندگی کا خون آہستہ آہستہ مگر دن بدن تیز روی کے ساتھ نکلتا جا رہا ہے۔

بھوک سے مرنے والوں کی تعداد

قحط سے صرف بنگال میں مرنے والوں کے اعداد

ار کے متعلق اگرچہ وزیر ہند صرف اٹھارہ لاکھ تہتر ہزار سات سو انچاس (1873749) کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر بی سی رائے صدر میڈیکل ریلیف تیس لاکھ فرماتے ہیں۔ دوسرے اخباروں میں نوے لاکھ تک اعداد آئے ہیں، قارئین اندازہ فرمالیں کہ صرف بنگال میں نوے لاکھ مرے پورے ہندوستان میں مرنے والوں کی تعداد کتنی ہوگی۔ طوالت کے ڈر سے محض نمونہ دکھا رہا ہوں تفصیل رونگٹے کھڑے کردینے والی ہے چیمہ صاحب کس منہ سے انگریز کی ترجمانی کر رہے ہیں! چیمہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں تمام دوسری گوری اقوام میں انگریز ہی سب سے بہتر تھے اور ان میں انسانیت کی قدر تھی۔"

جھوٹ ہی جھوٹ

ساقی صاحب لکھتے ہیں:

"انگریزی زبان سیکھنا، بولنا، پڑھنا حرام اور کفر قرار دیا گیا۔"

یہ فتویٰ کن علماء نے دیا ساقی صاحب ذرا زحمت کر کے ان علماء کے نام بھی پیش کردیتے تاکہ ہم جان سکتے کہ وہ کون سے علماء تھے یا ساقی صاحب کی زبان میں ملا تھے۔ سنی سنائی باتیں لکھنے سے پتہ نہیں وہ کیا چاہتے ہیں۔ ایک ایک لائن میں موقف بدلتے اور قلابازیاں کھاتے چلے جاتے ہیں میری ان سے گزارش ہے کہ اگر لکھنے کا شوق ہے تو پہلے اپنے میں استعداد پیدا کریں سنیں اور کان کھول کر سنیں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی جیسی عبقری شخصیت جو انگریز کے لیے سیف بے نیام تھے ان کی اس وقت کی تقریر سے ایک اقتباس جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نے یونیورسٹی کا بائیکاٹ کیا اور ایک دوسری یونیورسٹی "مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنا چاہی تو صدارت کے لیے آپ کو ہی منتخب کیا گیا یہ اجلاس 16 صفر 1339ھ بمطابق 29 اکتوبر 1920ء میں علی گڑھ میں ہوا۔ سخت بیمار ہونے کی وجہ سے آپ کا صدارتی خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا، چونکہ یہ اجلاس علی گڑھ یونیورسٹی کے خلاف منعقد ہوا تھا اور سرسید ہی انگریزی زبان کے زیادہ حامی بھی تھے تو کم از کم اس اجلاس میں تو جمعیۃ علماء ہند کو انگریزی پڑھنے پڑھانے کے خلاف ضرور فتویٰ دینا چاہیے تھا لیکن آپ حیران ہو جائیں گے کہ اس خاص موقع پر بھی شیخ الہند نے کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا۔ صرف ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں! آپ نے فرمایا:

آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہی ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے!

(اسیران مالٹا صفحہ 81)

آپ کے خطبے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محقق اور باخبر لوگ جانتے تھے چیمہ صاحب جیسے بے خبر نہیں جانتے اسی لیے چیمہ صاحب نے اپنی بے خبری اور عدم تحقیق کی بنا پر ایسا لکھ دیا۔

باقی رہی یہ بات کہ شیخ الہند کا یہ خیال کہ انگریزی تعلیم سے ملحدانہ خیالات اور مذہب سے دوری یا انگریزی حکومت کی پرستش وغیرہ تو یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ انگریزی خواں طبقہ عموماً ان کمزوریوں میں مبتلا ہو جاتا

ہے۔

اور تو اور خود سر سید احمد خاں صاحب کا اپنا اعتراف موجود ہے پڑھئے اور سر دھنیے! آپ کہتے ہیں:

"تعجب ہے کہ جو تعلیم پاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔"

میرے خیال میں سر سید کے مندرجہ بالا خیالات بلکہ اعتراف ان کی حقیقت پسندی کی واضح دلیل ہے۔ شیخ الہند نے تو اتنے سخت الفاظ استعمال نہیں کئے۔ اکبر الہ آبادی کے ایک شعر پر چیمہ سیخ پا ہیں وہ بتائیں کہ اس اعتراف حقیقت کے بعد سر سید کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے! اور آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔

شبلی نعمانی جو اسی کالج کے پروفیسر تھے انہوں نے 1882ء میں یوں لکھا:

"معلوم ہوا کہ انگریزی خواں نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت بھی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا نام نہیں آتا بس خالی کوٹ پتلونوں کی نمائش گاہ ہے۔"

ایس۔ ایم اکرام نے تحریک علی گڑھ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا۔

"سرکاری ملازمت کو علی گڑھ کا اہم ترین عملی مقصد بنانے کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک پست درجے کی مادیت اور شیت پسندی پیدا ہو گئی۔" جن لوگوں نے مسجد کی چٹائیوں پر تعلیم پائی تھی ان پر تو سر سید، محسن الملک، اور وقار الملک جیسے مدبر پیدا ہوئے لیکن جن روشن خیالوں نے کالج کیا عالی شان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور جن کی رسائی مغرب بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم و ادب تک تھی وہ مطمع نظر کی پستی اور کریکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں۔

اسی پر ساقی صاحب کے دوسرے فتوؤں کو قیاس کر لیں۔

باقی چیمہ صاحب کے ملا کی طرف منسوب دوسرے فتوے!

ریل گاڑی پر سفر کرنا حرام!

لاؤڈ اسپیکر پر بات کرنا ریڈیو رکھنا یا سننا حرام!

فون پر بات کرنا حرام اور اس سے نکاح فسخ ہو جائے گا وغیرہ اصل تو یہ کسی جید عالم کے حوالے سے نہیں لکھے گئے۔ اگر چیمہ صاحب کے پاس یہ فتوے ہیں تو براہ کرم انہیں با حوالہ درج کریں!

اور اگر بالفرض وبحال کسی نے ایسے فتوے دیئے تھے تو وہ اس کی لاعلمی پر دلالت کرتے ہیں۔ علماء کرام تو ریل گاڑی میں سفر بھی کرتے ہیں۔ فون پہ بات بھی کرتے ہیں! ریڈیو سے خبریں اور دوسرے اچھے پروگرام سنتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ فتوے دیئے گئے بھی تھے تو اب جب سب نے رجوع کر لیا تو چیمہ صاحب کو اچانک یہ الہام کیوں ہو گیا۔

اگر آپ کو ملا سے اتنی چڑھ یا اتنا سوء ظن ہے تو براہ کرم تنقید برائے تنقید نہ کریں بلکہ دلیل سے اپنے مؤقف کو پیش کریں آپ کی کوئی بات بھی دیانت و صداقت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ ملا کے بغیر ہم ایک قدم نہیں چل سکتے اگر ملا نہ ہوتے تو آج تک قوم کو بعض بزر جمہروں نے غیروں کے پاس گروی رکھ دیا ہوتا یہ ملا ہی ہے جو چور چور کا شور مچا کر تمہیں خبردار کرتا ہے اس کے باوجود قوم کی اکثریت اس ضدی بچے کی طرح ہو گئی ہے جسے ماں گود میں اٹھاتی ہے تو وہ پھسل کر نیچے گرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ملا کبھی امام مسجد کے روپ میں پیش امام کے فرائض ادا کرتا ہے۔ کبھی خطیب کے روپ میں قرآن و حدیث کے موتی بکھیرتا ہے۔ کبھی معلم کے روپ میں قرآن کے

حافظ پیدا کر رہا ہے۔ کبھی مسند درس پر قرآن و حدیث کے موتی لٹاتا ہے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو لحن داؤدی میں قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو زمین و آسمان، کوہسار و ریگستان، چمن و سبزہ زار پر وجد طاری ہوتا ہے جب جبہ و دستار پہنے نورانی چہرہ لیے منبر رسول پر رونق افزا ہوتے ہیں تو ان کی جلالت و عظمت کے سامنے تخت و تاج پر مسند نشین بادشاہ ہیچ نظر آتے ہیں۔ آپ کے وطن پاکستان کا ایک فقیر منش عالم شاہ فیصل مرحوم سے ملاقات کر کے واپس آنے لگتا ہے تو کسی کے قدموں کی چاپ سن کر ٹھہر جاتا ہے تو فیصل مرحوم فرماتے ہیں مولانا چلتے رہیے میں آپ کو الوداع کہنے کے لیے آ رہا ہوں۔ اسی ملا کی محنت سے کویت میں ایک بچے نے صرف چھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ وہی ملا ہے جس سے انگریز آج بھی ڈرتا ہے اور اُس وقت بھی ڈرتا تھا جب یہاں سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ یہی ملا ہے جو طنطنے سے بولے تو صور اسرافیل کا گمان ہوا جو ترنم سے بولے تو محمد رفیع اور عالم لوہار اس کی گرد راہ کو بھی نہ پہنچ سکیں جب فلسفہ و منطق کی زبان میں بات کرے تو دانشور گونگے ہو جائیں اور جب قرآن کی زبان میں بولے تو دلوں کے زنگ اترتے چلے جائیں اور جب وجد اور کیف و مستی میں آجائے تو کـــ الــلــــا تــــر اه کا نظارہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اور جب قلم ہاتھ میں لے تو آپ کے پی ایچ ڈی اس کی لکھی ہوئی تحریر پڑھنے سے عاجز نظر آئیں۔

انسان کی زندگی میں تین اہم مواقع پر اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ پیدائش، نکاح اور موت پیدائش کے وقت کان میں اذان پڑھے۔ شادی کے موقعہ پر نکاح خطبہ پڑھے۔ مرنے کے بعد نماز جنازہ ادا کرے اور پھر قبر پر کھڑا ہو کر بخشش کی دعا کرے۔ مجھے بتاؤ اتنا ہمدرد کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟

قرارداد مقاصد

چیمہ صاحب کی چونکہ ہر بات نرالی، خلاف واقعہ اور تعصب پر مبنی ہوتی ہے وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ موجودہ حالات ان جیسی تحریروں کے متحمل نہیں ہیں۔ متنازعہ مسائل کے لیے حالات کی موافقت از حد ضروری ہوتی ہے آج جب کہ ملک ایک نہایت مشکل صورت سے گزر رہا ہے ہمیں جوڑنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ توڑنے کی پتہ نہیں چیمہ صاحب جلتی پر تیل ڈالنے پر کیوں مصر ہیں۔

قرارداد مقاصد کے بارے میں لکھتے ہیں!

"ملک ابھی نیا بنا تھا بمشکل سانس لے رہا تھا ان لوگوں نے تنازعات کی جڑ فسادات کا منبع قرارداد مقاصد منظور کرلی۔"

قرارداد مقاصد کی اہمیت و ضرورت

آئین کسی بھی ملک کی آزادی کا نشان مانا جاتا ہے پاکستان معرض وجود میں آیا تو نوزائیدہ خداداد مملکت مختلف مسائل میں گھری ہوئی تھی اس لیے ایک ایسے آئین کی ضرورت تھی جس سے ملک کا نظام چلایا جاسکے وقتی طور پر 1935ء کے ایکٹ کو ضروری ترامیم کے بعد اختیار کیا گیا بعد میں شہید ملت لیاقت علی خاں نے اس طرف توجہ دی اور 12 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس کو اسمبلی نے بحث مباحثے کے بعد منظور کر لیا۔ اسی قرارداد کو قرارداد مقاصد کا نام دیا گیا۔ اب یہ قرارداد تنازعات کی جڑ اور فسادات کا منبع کیسے بن گئی افسوس چیمہ صاحب نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ قرارداد مقاصد میں خدا کی حاکمیت کو تسلیم کر کے یہ واضح کر دیا گیا اسلام میں دین اور سیاست جدا جدا نہیں اور یہی نظریہ مصور پاکستان کا بھی تھا۔

جدا ہو گر دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
اور یہی بانی پاکستان حضرت قائد اعظم چاہتے تھے!

آپ نے فرمایا۔

ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک ٹکڑا زمین حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔

بلکہ آپ نے تو یہاں تک فرمادیا۔

"آپ نے غور کیا کہ پاکستان کے مطالبے کا محرک اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت کی وجہ کیا تھی۔ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی وجہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔"

میرے خیال میں قرارداد پاکستان کو فسادات کا منبع اور تنازعات کی جڑ شاید چیمہ صاحب اس لیے کہتے ہوں کہ اس وقت کچھ لوگوں میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ میاں افتخار الدین جیسے لوگوں کا مختصر گروہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتا تھا دوسری طرف ارکان کی اکثریت مسلسل ایک اسلامی دستور کے لیے دباؤ ڈال رہی تھی اور مولانا شبیر احمد عثمانی اس گروپ کے روح رواں تھے لیکن سیکولر ذہن کامیاب نہ ہوسکا۔

چیمہ صاحب دلائل سے ثابت کریں کہ قرارداد مقاصد واقعی فسادات کا منبع اور تنازعات کی جڑ ہے۔ کم از کم وہ کوئی واضح دلیل تو پیش کریں۔ دعویٰ تو ہر شخص کرسکتا ہے لیکن لوگ دلیل مانگتے ہیں ویسے بھی کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

میں مانتا ہوں کہ مذہب کے نام پر بھی قتل و غارتگری ہوئی لیکن بدمذہبوں نے جس طرح انسانیت کی تذلیل کی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ حال ہی میں امریکہ نے عراق اور افغانستان میں جو خون کی ہولی کھیلی اس سے کون ناواقف ہے۔ کیا یہ مذہبی جنگ تھی گو صدر بش نے اسے صلیبی جنگ قرار دیا تھا لیکن یہ صلیبی جنگ کیسے ہوگی مسلمان کو مسلمان کے ہاتھوں سے مروانا کیا صلیبی جنگ کہلواتا ہے؟

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

میرا موضوع یہ نہیں ہے ورنہ مزید تاریخی حوالہ جات عرض کرتا مجھے احساس ہے کہ قارئین ضرور تشنگی محسوس کریں گے اصل میں میں عدم تشدد اور علماء کا کردار پر صرف دو تین دلائل عرض کروں گا پہلے چیمہ صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

"ان لوگوں نے معاشرے میں تشدد اور قتل و غارت کو اس قدر فروغ دیا ہے کہ اکثر مسالک کے ملا بھاری اسلحہ سے لیس محافظوں کے ہمراہ آتے جاتے ہیں۔ مذہبی جماعتوں کے سرغنہ اور ڈیرہ داروں کی تو بات ہی الگ ہے۔ قارئین یہ لوگ عوام کو اس دین کا کیا سبق دیں گے جو سلامتی اور امن کا داعی ہے لوگوں میں نفرت اور تشدد کا سبق پھیلانے کے علاوہ ان کا کردار کیا ہے؟

یہ عبارت بھی چیمہ صاحب کے اندرونی بغض کا واضح اظہار ہے جس کا اقرار وہ خود اپنے قلم سے کرچکے ہیں۔ انہیں چند علماء کی سیکورٹی سے پریشانی ہے اگر یہ کوئی جرم ہے تو جب سیاسی زعماء اپنی سیکورٹی پر کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ملاؤں بچاروں کے پاس تو اتنے وسائل ہی نہیں ہیں اگر جماعتیں انہیں سیکورٹی کے لیے چند جوان مہیا کرتی ہیں تو اس پر حسد کرنے کی کون سی تک ہے جبکہ علماء کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جارہا ہے اور یہ سب ایک منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔ شیعہ اور سنی علماء کو قتل کرا کے شیعہ سنی فساد برپا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میرا چیمہ صاحب اور اس قسم کے ذہن رکھنے والوں کو چیلنج ہے کہ وہ پاکستان میں کسی سنی عالم کا فتویٰ دکھادیں کہ شیعہ کو قتل کرنا جائز ہے لشکر جھنگوی اور

سپاہ محمدؐ کے چند جذباتی نوجوان اگر بالفرض محال قتل و غارت گری میں ملوث ہیں تو کسی ایک شیعہ یا سنی عالم کا ایک لفظ بھی دکھا دیں کہ کسی نے اس قتل پر ان کی حوصلہ افزائی کی ہو۔ شیعہ عالم کے قتل پر سنی زعماء مذمتی بیان دیتے ہیں اور سنی عالم کے قتل پر شیعہ علماء مذمت کرتے ہیں میں طرفین کے بیانات دکھا سکتا ہوں۔ ان حالات میں اگر اکابر علماء کرام اپنی حفاظت کے لیے انتظام کرتے ہیں تو یہ کون سا جرم ہے؟

میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ ملک عزیز میں شیعہ سنی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سانحہ راولپنڈی کے روح فرسا واقعے کے بعد بھی ملک میں شیعہ سنی کا جھگڑا پیدا نہیں ہوا۔ اس سانحے کے بعد بھی یہ علماء کرام ہی تھے جنہوں نے پرامن رہنے کی تلقین کی اگر علمائے کرام تشدد کو ہوا دینے والے ہوتے تو اس سانحہ عظیم کے بعد پورا ملک فرقہ وارانہ آگ کی لپیٹ میں آ چکا ہوتا۔ علماء کرام کے کردار سے ناواقف لوگ انہیں تشدد پھیلانے کا خواہ مخواہ الزام دیتے ہیں خدارا علماء کرام کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں اور انہیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ جید علمائے کرام کے حالات زندگی اور سیرت و کردار پر ضخیم کتابیں مارکیٹ سے مل جاتی ہیں کبھی آپ نے زحمت کی کہ ان وارثان رسول کی سیرت اور کردار کا بھی مطالعہ کر لیا جائے! اس میں کوئی شک نہیں کہ چند نوجوان پر تشدد واقعات میں ملوث ہیں یہ نوجوان علماء کرام اور اپنی قیادت سے باغی ہیں۔ اس وقت مدارس دینیہ میں اندازاً 20 لاکھ طلباء زیر تعلیم ہیں۔ اگر 20 لاکھ میں سے چند سو پر تشدد کارروائیاں کرتے ہیں تو تمام ملا نفرت اور تشدد پھیلانے والے کیسے ہو گئے! آخر انصاف بھی کوئی چیز ہے۔ اتنے بڑے بہتان اور جھوٹ کی کسی نارمل انسان سے توقع نہیں کی جا سکتی جبکہ اس بات کے شواہد بھی مل چکے ہیں کہ بعض لوگ مخصوص حالات پیدا کرنے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں!

تشدد سے عدم تشدد

میں یہ مانتا ہوں کہ انگریز کے خلاف دیوبند نے سیف و سناں کا استعمال کیا تھا۔ چنانچہ شیخ الہندؒ کا فرمان تھا۔

''جہاں تک میں جانتا ہوں 1857ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ (دارالعلوم دیوبند) قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ 1857ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔ (سوانح قاسمی صفحہ 226 بحوالہ اسیران مالٹا صفحہ 19)

لیکن بعد میں آپ کے نظریے میں تبدیلی آ گئی تھی اور یہ زمانہ غالباً 1920ء کا ہے اس سے پہلے دوسرے بزرگوں نے انگریز کے خلاف مسلح جدوجہد کی تھی شیخ الہندؒ نے عدم تشدد کا ہی راستہ اختیار کیا چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند اس مدت مدید کی اسارت کی مشقتیں برداشت کر کے ہندوستان آئے تو ان کے جذبہ حریت اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی بلکہ ہندوستان میں مارشل لاء رولٹ ایکٹ کے نفاذ اور جلیانوالہ باغ وغیرہ کے واقعات، بیرون ہند ترکی مملکت کی تقسیم اور معاہدہ سیورے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ بمبئی میں اترتے ہی مولانا شوکت علی اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے ملاقات ہوئی مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی لکھنو سے اور مہاتما گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہندؒ کے استقبال کے لیے تشریف لائے۔ ان سے اور ان کے علاوہ دوسرے لیڈروں سے خلوت اور جلوت میں باتیں ہوئیں تو آپ نے بھی عدم تشدد (نان وائلنس) کا پروگرام ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ضروری قرار دیا

اور پھر اسی طریقہ پر تمام خلافت کمیٹی اور کانگرس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی!

(نقش حیات جلد اول صفحہ 247 بحوالہ اسیران مالٹا صفحہ 74)

چنانچہ علی برادران کی زیرِ قیادت آل انڈیا خلافت کمیٹی جسے تحریک خلافت بھی کہا جاتا ہے۔ تحریک عدم تعاون، تحریک ہجرت، سول نافرمانی اور اس قسم کی دوسری تحریکیں یہ سب عدم تشدد پرمبنی تھیں ان کی کامیابی یا ناکامی اس وقت خارج از موضوع ہے۔ میں صرف یہ دکھا رہا ہوں کہ علماء کرام تو انگریز کے خلاف بھی عدم تشدد کے قائل تھے وہ اپنے لوگوں اور اپنی حکومتوں میں تشدد پر کیوں اکسائیں گے؟

شیخ الہند نے 20 اکتوبر 1920ء کو جمعیت علمائے ہند کے دوسرے اجلاس میں علماء ملت کو اصولی نظریات کی ہدایت فرمائی جن میں سے صرف ایک پیش خدمت کرتا ہوں۔

"اگر موجودہ زمانے میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعداء کے لیے جائز ہو سکتا ہے تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں!(اسیران مالٹا صفحہ 83)

یعنی پرامن مظاہرے، قومی اتحاد، اور متفقہ مطالبے یہی ہتھیار ہونے چاہئیں بتائیں عدم تشدد کا اس سے زیادہ اور کون پرچارک ہے۔

شیخ الہند نے ایک فتوے کے جواب میں فرمایا!

"مجھے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ تحریک ترک موالات کا موجودہ حالت میں کامیاب بنانا صرف اس پر منحصر ہے کہ کوئی حرکت ہماری جانب سے ایسی نہ ہونی چاہیے جو نقص امن یا سفک دماء (قتل و خون) کی موجب ہو!(29 اکتوبر 1920ء اسیران مالٹا صفحہ 107)

بتائیں صاحب یہ تشدد پر اکسایا جا رہا ہے یا عدم تشدد کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ چیمہ صاحب کے نزدیک تشدد پھیلانے کے علاوہ ان لوگوں کا اور کوئی کردار نہیں (لاحول ولاقوۃ)

اور یہ وہ علماء ہیں جن کی جلالت علمی، جرأت و بہادری، ایثار قربانی کی ایک دنیا معترف ہے پھر قیام پاکستان کے بعد بھی 1951ء میں مختلف مکاتب فکر کے علماء نے بالاتفاق 22 نکات پیش کیے۔ جس پر مختلف فرقوں کے 33 علماء کرام کے دستخط موجود ہیں یہ بھی اس امر کا واضح اعلان تھا کہ علماء بندوق کے زور پر نہیں بلکہ آئینی طریقے سے چاہتے ہیں کہ ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو جائے۔ 22 نکات پیش کر کے علماء نے یہ ثبوت بھی بہم پہنچا دیا کہ اسلامی نظام کے نفاذ پر بنیادی امور پر علماء میں کوئی اختلاف نہیں، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا مفتی محمود اور دیگر مسالک کے علماء نے اسلامی نظام کے نفاذ اور کفر کے نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے لیے جتنی جدوجہد کی اس کی بنیاد عدم تشدد پر ہی رہی ہے۔ حکمرانوں سے ہزار اختلاف کے باوجود نہ قانون کو ہاتھ میں لیا نہ قتل و غارتگری کی راہ اختیار کی۔ اسمبلی میں ان اکابرین کی تقاریر آن دی ریکارڈ ہیں۔ پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد ہمارے دینی فرائض میں سے ہے لیکن اس کے لیے ہمارے اکابر نے جو طریقہ کار طے کیا ہے تمام تر سست روی اور پے در پے رکاوٹوں کے باوجود ابھی تک وہی طریقہ صحیح ہے کیونکہ اس کا فیصلہ فرد واحد نے نہیں کیا بلکہ تمام مکاتب فکر کے اکتیس اکابر علماء کرام نے 22 متفقہ دستوری نکات کی صورت میں کیا تھا اور اسے تبدیل کرنے کے لیے اسی درجہ کے اکابر علماء کرام کا اسی طرح کا متفقہ فیصلہ ضروری ہے۔ اور یہ طریقہ تھا عدم تشدد!

ابھی ماضی قریب میں غازی برادران نے علماء کے اس طریقے سے انحراف کیا اور بعض پُر تشدد کارروائیاں شروع کیں لیکن علماء کرام نے ان کے اس طریقے کو نہ صرف غیر آئینی قرار دیا بلکہ انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کی۔ بات کو طوالت سے بچانے کے لیے میں صرف وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کے اعلامیہ سے ایک دو اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

''وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ ملک میں اسلامی احکام و قوانین کی عمل داری، اسلامی اقدار و روایات کے فروغ اور منکرات و فواحش کے سدباب کے لیے پُرامن اور دستوری جدوجہد پر یقین رکھتی ہے اور جدوجہد کے کسی ایسے طریقے کو درست تصور نہیں کرتی جس میں حکومت کے ساتھ براہ راست تصادم، عوام پر زبردستی، یا قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوئی شکل پائی جاتی ہو۔ یہ اجلاس قانون کو ہاتھ میں لینے اور اسلامی اقدار و روایات کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی تمام صورتوں سے لاتعلقی اور برأت کا اظہار کرتے ہیں!

گو غازی برادران کے تمام مطالبے جائز تھے لیکن ان مطالبوں کو منوانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا اس سے علماء کرام متفق نہیں تھے اس لیے اعلامیہ میں یہ ذکر بھی کر دیا گیا۔

''اس سلسلے میں جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات اور لال مسجد کے منتظمین نے جو طریق کار اختیار کیا ہے اسے یہ اجلاس درست نہیں سمجھتا اور اس لیے وفاق المدارس العربیہ کی اعلیٰ قیادت خود اسلام آباد جا کر متعلقہ حضرات سے متعدد بار بات چیت کر چکی ہے۔''

انتہائی فیصلہ

بالآخر جب غازی برادران نے اپنے موقف سے ہٹنے پر انکار کر دیا تو وفاق المدارس العربیہ نے جامعہ

حصہ ماو وفاق سے الحاق ختم کر دیا!

اب اگر پھر بھی کوئی عقل کا اندھا علماء پر تشدد کا الزام لگائے تو پھر ہم صرف افسوس ہی کر سکتے ہیں چند جذباتی لوگوں کے فعل کو آپ تمام علماء کی اجتماعی سوچ قرار نہیں دے سکتے اور اگر پھر بھی کوئی "میں نہ مانوں" کی رٹ لگاتا پھرے تو اس کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔

قند مکرر

عقائد و عبادات کا تعلق چونکہ روحانی معاملات سے ہے اور ان کا تعلق براہ راست بندے اور خدا کے درمیان ہے۔ لہٰذا عقلی طور پر بھی یہ معاملہ تشدد کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ کسی کو گولی کے زور پر خدا سے ملا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! آپ جب تک اسے احسن طریقے سے خدا تعالیٰ کی صفات اور ذات کے بارے میں بریف نہیں کریں گے وہ مر تو جائے گا لیکن خدا تعالیٰ کی معرفت اسے نہیں آ سکتی۔ روحانی معاملات میں روحانی طریقے سے ہی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دین بھی چونکہ روحانی معاملات میں سے ہے لہٰذا دین کو سمجھانے کے لیے روحانی طاقت ہی استعمال کرنی چاہیے جس میں وعظ و نصیحت، اخلاق حسنہ! خوش خلقی، ایثار، ہمدردی، اور سب سے بڑی بات پہلے اپنی اصلاح ضروری ہے!

تحریک طالبان اور پُرتشدد کارروائیاں

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ چند لوگوں کے فعل کو کسی گروہ کی اجتماعی سوچ قرار دینا عقل، نقل، اور دیانت کے خلاف ہے۔ علماء کرام پر تشدد کا الزام لگانے والے براہ کرم کسی ایک عالم دین کا نام لیں جس نے طالبان سے منسوب بم دھماکوں، یا قتل و غارت گری کی حمایت کی ہو۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ علمائے بریلوی تو مسلک کے اختلاف کی وجہ سے ان کی مذمت کرتے اور ان کے خلاف فتوے جاری کرتے ہیں لیکن کیا اُن کے ہم مسلک علماء دیوبند میں سے کسی ایک شخص نے بھی ان کے اس فعل کو جائز قرار دیا؟ یا علماء اہلحدیث نے کوئی بیان جاری کیا ہو؟

نواز شریف کی سیاسی بصیرت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو تمام علماء نے طالبان کے طریقہ کار کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے تو دوسری طرف طالبان کسی کی پروا کیے بغیر پُرتشدد کارروائیاں کرتے چلے جا رہے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنا تک گوارہ نہیں کر رہا کہ بھائی آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ بلکہ صاحب اقتدار لوگوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور اس طرح کئی ہزار قیمتی جانیں تلف ہوئیں میں نواز شریف کی سیاسی بصیرت کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے بروقت طالبان سے مذاکرات کی راہ اختیار کر کے اسے گمبھیر مسئلے کو حل کرنے کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ طالبان کا اپنا ایک موقف ہوگا آخر قوم کو بھی تو پتہ چلے کہ وہ چاہتے کیا ہیں؟ انہیں کون سی مجبوری ہے کہ وہ اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتے اور خودکش بمباروں کی ایک ٹیم ان کے پاس موجود ہے بقول مولانا عبدالعزیز صاحب 500 خودکش بمبار خواتین کارروائی کے لیے تیار کھڑی ہیں! ان حالات میں نواز شریف کی سوچ ہی صحیح اور مومنانہ فراست کی عکاس ہے اور اس کے لیے یہ امر بھی ضروری ہے کہ طالبان بھی اپنے رویے میں لچک پیدا کریں۔ علماء کو انتہا پسند اور متشدد کہنے والے مولانا سمیع الحق کے اس بیان پر غور کریں جس میں انہوں نے خدا کا واسطہ دے کر طالبان کو کارروائیاں روکنے کی اپیل کی ہے۔

☆☆☆

نوجوانی کے سرکش جذبات میں بہہ کر ان کا خون سفید ہو گیا اور وہ جرم کی راہ پر چل پڑے۔

جرم اور جذبات

دستگیر شہزاد

ثانیہ آبائی طور سے جدحالہ کی رہنے والی تھی۔ اُس کے والد کا نام مدثر علی تھا۔ تقریباً بیس سال قبل ثانیہ کی شادی کھروڑی میں رہنے والے شہزمان سے ہوئی تھی۔ بعد میں شہزمان پھلور میں کنبے سمیت آباد ہو گیا تھا۔

وقت کا پہیہ گھوما اور ثانیہ تین بچوں کی ماں بن گئی۔ دو بیٹے ہوئے اس کے بعد بیٹی رانیہ نے آنکھ کھولی۔ رانیہ جب بہت چھوٹی تھی تبھی ایک دن شہزمان اچانک بیمار پڑ گیا۔ ثانیہ سے جتنا ممکن ہو سکا اس نے شوہر کا علاج کرایا۔ یہ الگ بات ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر ایک دن شہزمان اپنے کنبے کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ سوگ کے دن بیت گئے تو گھر والوں نے ثانیہ کو دوسری شادی کے لیے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر اس کی زبان پر ہمیشہ انکار رہا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔ دوسری شادی کرنے پر بیوی تو میں سگی رہوں گی مگر بچے سوتیلے ہو جائیں گے۔ ثانیہ ہی راضی نہیں تھی تو کوئی کیا کرتا۔ ثانیہ محنت مشقت کر کے اپنی گزر بسر کرنے لگی۔ بس اُس کا بھی ایک بھائی افسر ہی تھا۔ جو بہن اور اس کے بچوں کا حال پوچھنے پھلور آتا رہتا تھا۔ اور جتنا ممکن ہو پاتا۔ ثانیہ کی مالی مدد بھی کر دیتا تھا۔

دن جیسے تیسے بیت رہے تھے کہ ایک دن ثانیہ کا بڑا بیٹا اچانک لاپتہ ہو گیا۔ لاپتہ بھی ایسا کہ تمام کوششیں کر لینے کے باوجود اس کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ پتہ نہیں اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ثانیہ نے دل پر پتھر رکھ کر اپنا پورا دھیان باقی بچی دو اولادوں پر لگا دیا۔ دونوں بچے پڑھنے کے لیے اسکول جاتے تھے۔ وقت نے پھر پاؤں پسارے رانیہ دسویں میں پہنچ گئی۔ اور اس کا چھوٹا بھائی آٹھویں کلاس میں۔ ثانیہ اپنے غم بھول کر نئی امیدوں کے سہارے جی رہی تھی کہ تبھی اس پر پھر بدنصیبی کی برق گری۔ ثانیہ کا دوسرا بیٹا سڑک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ اور موقع پر ہی اُس کی موت ہو گئی۔ شوہر کے بعد دونوں بیٹے بھی چلے گئے تھے اب بچی تھی واحد اولاد رانیہ۔ اب ثانیہ اپنا سارا دھیان رانیہ پر لگاتی۔ لیکن دل میں ڈری ڈری سی رہتی کہ کہیں یہ بھی میرا ساتھ نہ چھوڑ جائے۔

روح پر پھیلی آنسوؤں کی نمی سے رستی ہوئی انجان اور بے نام آرزوؤں کی موجودگی رات کو گرتی ہوئی اوس کی مانند ہے جو نظر نہیں آتی لیکن آسمان کے نیچے ہر شے بھیگ جاتی ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ رانیہ نے انٹر پاس کر لیا اور عمر کے بھی اٹھارہ سال مکمل کر لیے۔ جوان بیٹی ماں کے سینے پر بھاری بوجھ کی مانند ہوتی ہے۔ اسی لیے دوسری ماؤں کی مانند ثانیہ بھی اس بوجھ کو جلدی ہی اتار دینا چاہتی تھی۔ اس کے بارے میں وہ کئی بار اپنے بھائی افسر سے بھی ذکر کر چکی تھی۔ افسر علی کی بھی دلی خواہش تھی کہ رانیہ کے ہاتھوں میں جلدی مہندی لگے اور وہ کسی اچھے خاندان کی بہو بن جائے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن موبائل فون کے ذریعے بہن کی خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ افسر علی کی ثانیہ سے آخری بار 24 اکتوبر کو بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ کام میں ایسا مصروف ہوا کہ بہن کو فون کر کے خیر خبر لینے کا اسے وقت ہی نہیں ملا۔ افسر علی کو امید تھی کہ بہن فون کرے گی۔ لیکن ثانیہ نے بھی اسے یاد نہیں کیا۔

تقریباً آٹھ دس دن بعد افسر علی نے بھانجی کی خیریت جاننے کے لیے فون کیا تو جواب میں فون بند ہونے کا ریکارڈ پیغام سننے کو ملا۔ افسر علی کو حیرت ہوئی ثانیہ کا فون سالوں سے کبھی بند نہیں ہوا تھا تو اب کیوں بند ہے؟ اسے تو فون بند کرنا بھی نہیں آتا۔ ثانیہ کہیں مصروف ہوتی تھی تو رانیہ کال اٹینڈ کرتی تھی۔ افسر علی

نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ ہو سکتا ہے ماں بیٹی کہیں گئی ہوں۔ اس کے بعد انصر علی پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تین چار دن بعد فرصت ملی تو پھر سے بہن کا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار بھی اسے وہی پیغام سننے کو ملا اس کے بعد انصر علی روزانہ ثانیہ کا نمبر ڈائل کرتا رہا مگر اس سے بات نہ ہو سکی۔ ہر بار فون بند ملا۔ اسی طرح جب تقریباً 20 دن بیت گئے اور ثانیہ سے رابطہ نہیں ہو پایا۔ تب انصر علی کا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ پھلور جا کر پتہ کرنا چاہیے کہ کیا بات ہے؟ اس لیے اسی دن انصر علی پھلور میں واقع بہن کے گھر پہنچا لیکن گھر میں ثانیہ نہیں تھی۔ رانیہ نظر آئی اور اس کے ہاتھوں میں مہندی دمکتی ہوئی دکھائی دی۔ رانیہ کو سہاگن دیکھ کر انصر علی حیران تھا تو رانیہ کے چہرے پر بھی بدحواسی کے سائے لہرا رہے تھے۔

"تیرے ہاتھوں میں مہندی کیسی؟" انصر علی نے سوال کیا۔

"ماما! میری شادی ہو گئی ہے۔" رانیہ نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ "اسی مہینے کی پانچ تاریخ کو۔"

"تمہاری شادی ہو گئی اور مجھے خبر تک نہیں کی گئی؟" انصر علی نے شکوہ کیا۔

"ماما! سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو بتانے یا بلانے کا بھی وقت نہیں ملا۔" رانیہ نے عذر پیش کیا۔

"اور تیری ماں کہاں ہے؟" انصر علی نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔

"وہ تبلیغ پر چلی گئی ہیں۔" رانیہ نے جواب دیا۔

"کیا......؟" کافی کوشش کرنے کے باوجود انصر علی رانیہ کے بیان پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ ذہن میں ایک ہی بات چبھ رہی تھی۔ بہن نے اسے بتائے بغیر رانیہ کی شادی کر دی اور خود تبلیغ پر چلی گئی ممکن نہیں لگتا۔ ضرور کہیں گڑبڑ ہے۔

"رانیہ تیری شادی کس سے اور کہاں ہوئی؟" اس نے بھانجی سے پوچھا۔

"خاور...... کھارو سے۔" رانیہ نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔

"وہی جو وزیر پور میں رہتا ہے۔" انصر نے تصدیق چاہی۔ "اور حبیب کا چھوٹا ہے؟" رانیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پلک جھپکتے ہی انصر علی کا دل ماضی میں دور تک چلا گیا۔ ثانیہ نے اسے بتایا تھا کہ رانیہ نے کھارو کو دل میں بسا لیا ہے۔ بدنامی کی فکر کیے بغیر وہ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ دیکھنے والوں نے بتایا ہے کہ وہ تنہائی میں بھی اس سے ملتی ہے۔ پوچھنے پر کہتی ہے۔ کھارو میرا پیار ہے اور میں اسی سے شادی کروں گی۔ انصر علی کو یاد آیا ثانیہ نے اس سے ایک نہیں متعدد بار کہا تھا۔ ایک تو خاور کھارو آوارہ اور نکھٹو ہے دوئم وہ ہماری برادری کا بھی نہیں ہے۔ اسے داماد بنانے کا سیدھا مطلب رانیہ کی زندگی برباد کرنا ہوگا۔ جب تک میں زندہ ہوں رانیہ کو یہ من مانی نہیں کرنے دوں گی۔ میری موت کے بعد چاہے وہ کچھ بھی کرنے۔

انصر علی جانتا تھا کہ ثانیہ ضدی عورت تھی اگر اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ رانیہ کی شادی کھارو سے نہیں کرے گی تو نہیں کرے گی۔ وہ ٹوٹ جانے والی عورت تھی۔ جھکنے والی نہیں۔ رانیہ کی شادی کرنے کے لیے وہ کسی اچھے گھر اور ور کی تلاش بھی کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں وہ رانیہ کی شادی آناً فاناً کھارو سے کیسے کر سکتی تھی۔ ثانیہ نے بیٹی کی شادی بھی کر دی اور تبلیغ پر بھی چلی گئی۔ یہ بات انصر علی ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ خیالات کے بھنور سے نکل کر انصر علی نے رانیہ سے سوال کیا۔

"شادی کے بعد تمہیں سسرال میں ہونا چاہیے۔ میکے میں کیا کر رہی ہو؟" رانیہ نے سوچا سمجھا جواب دیا۔ "اماں گھر کی رکھوالی کے لیے مجھے یہاں چھوڑ گئی

ہیں۔ جب تک وہ تبلیغ سے نہیں لوٹتیں میں یہیں رہوں گی۔ ان کے آنے کے بعد وزیر پور چلی جاؤں گی۔"

"اور تیرا گھر والا کہاں ہے؟" افسر نے پوچھا۔

"وہ کام پر چلے گئے ہیں۔" رانیہ نے بتایا۔ "شام کو لوٹیں گے...... ماما! تم بیٹھو میں ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔"

"رانیہ آج میرے پاس وقت نہیں ہے۔" افسر علی نے اُسے ٹالا۔ "میں تو تم لوگوں کی خیریت لینے کے لیے پانچ منٹ کے لیے آیا تھا۔ بہن آ جائے تو فون کر لینا۔ ملنے آؤں گا۔ تمہارے لیے تحفہ بھی تو لانا ہے۔" اتنی بات کہہ کر افسر علی گھر سے نکل گیا۔ اس کے دل میں شک کے بادل گھوم رہے تھے۔

وہ سیدھا پکھلور پہنچا۔ یہاں اس کے کچھ واقف کار تھے ان سے ملا اور رانیہ کے بارے میں بات چیت کی۔ تو ان سب نے بھی رانیہ کے بیان پر اپنے شک کا اظہار کیا۔ وہ سب بھی ثانیہ کے تبلیغ پر جانے کی بات پر یقین نہیں کر پا رہے تھے۔ اس لیے افسر علی کے قدم تھانہ پکھلور سٹی کی جانب گامزن ہو گئے۔ انسپکٹر حسن نثار اپنے کمرے میں موجود تھے۔ افسر علی نے انہیں رانیہ اور کھارو کی پریم کہانی سے آگاہ کر کے شک ظاہر کیا کہ میری بہن ان دونوں کی شادی کے حق میں نہیں تھی۔ اب بہن لاپتہ ہے اور رانیہ کھارو کی بیوی بنی ہوئی ہے۔ مجھے شک ہے کہ رانیہ اور کھارو نے ثانیہ کو کہیں قید کر رکھا ہے۔ اور دونوں اپنی من مانی کر رہے ہیں۔ پولیس پارٹی کے ساتھ افسر علی ثانیہ کے گھر گئے۔ تو رانیہ گھر میں ہی تھی اور اتفاق سے کھارو بھی وہاں موجود تھا۔ افسر علی کے کہنے پر پولیس نے رانیہ کو بھی حراست میں لے لیا۔ رانیہ اور کھارو کو ساتھ لے کر پولیس ٹیم تھانہ پکھلور لوٹ آئی۔

"تیری ماں کہاں ہے؟" حسن نثار نے رانیہ کو سامنے کھڑا کر کے پوچھا۔

رانیہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ پھر بھی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ تبلیغ کرنے کے لیے راولپنڈی گئی ہوئی ہیں۔"

"کب گئی تھی وہ؟" حسن نثار نے پوچھا۔

"جی ...... وہ 24 اکتوبر کو۔" رانیہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"ہوں......!" حسن نثار نے ہنکار بھری۔ "وہ 24 اکتوبر کو تبلیغ کے لیے چلی گئی اور 5 نومبر کو تمہاری شادی ہوئی۔ تمہاری ماں اب تک واپس نہیں آئی تو 5 نومبر کو اس نے تیری شادی کھارو سے کیسے کر دی؟"

اس کا رانیہ اور کھارو کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہیں تھا۔ کچھ دیر بغلیں جھانکنے کے بعد کھارو نے بگڑی بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"سر! ہم دونوں پیار کرتے تھے۔" اس نے کہا۔ "لیکن ثانیہ چاچی ہماری شادی کے خلاف تھیں اس لیے ہم نے ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر 5 نومبر کو شادی کر لی۔ ہمارا خیال تھا ثانیہ چاچی تبلیغ سے لوٹیں گی تو انہیں ہماری شادی قبول کرنا ہی ہو گی۔ افسوس! وہ اب تک نہیں لوٹیں۔"

"پولیس کو تُو بے وقوف سمجھتا ہے کیا۔ کہ جو تُو کہے گا ہم یقین کر لیں گے۔" حسن نثار نے دھاڑتے ہوئے ہوا میں تیر چلایا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ تم دونوں نے ثانیہ کو مار کر اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔"

اندھیرے میں چلایا گیا تیر ٹھیک نشانے پر لگا۔ رانیہ اور کھارو کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ حسن نثار نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایسے ایسے سوالوں کی بارش کی کہ وہ رونے لگے اور روتے روتے ہی اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔

تکرار بہر حال بری چیز ہے۔ سچائی کو بھی اتنی بار نہیں دہرانا چاہیے کہ اس کے خلاف ردعمل پیدا ہو جائے۔ جب ہم کسی کو اس کی غلطی کا احساس دلاتے ہیں

تو پہلی بار وہ واقعی شرمندہ ہوتا ہے دوسری بار گو باپ ادب سے کچھ نہ کہے لیکن اندر ہی اندر تملا کر رہ جاتا ہے اور تیسری بار تو وہ اپنے اس طرز عمل کا واضح طور پر دفاع کرنے لگتا ہے۔

23 سالہ کھارو وزیر پورا کے باشندے حبیب کا بیٹا تھا۔ اوسط پڑھائی کرنے کے بعد وہ آوارگی کرنے لگا۔ ماں باپ کی چھ اولادوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس لیے سب سے لاڈلا تھا کے دو بڑے بھائیوں علیم، وسیم اور دو بہنوں کے بیاہ ہو چکے تھے۔ شادی شدہ بھائیوں کے علاوہ کنوارہ بھائی نسیم بھی کام دھندے سے لگا ہوا تھا۔ جبکہ کی زندگی عیش سے گزر رہی تھی۔ باپ نے اسے موٹر سائیکل دلا رکھی تھی اس پر سوار ہو کر وہ من مرضی سے گھومتا رہتا تھا۔ کھارو کی رشتے داری پھلور میں تھی۔ جہاں وہ اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کے رشتے دار کا گھر ثانیہ کے مکان کے عین بغل میں تھا۔ وہاں آنے جانے کے دوران ایک سال پہلے کھارو نے رانیہ کو دیکھا اور اس کے حسن پر فدا ہو گیا۔ اس نے رانیہ پر ڈورے ڈالے تو وہ بھی اس پر ریجھ گئی۔ کچھ دنوں تک ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرتے رہے اس کے بعد ایک دن رانیہ کو اکیلا پا کر کھارو اس کے گھر میں گھس آیا۔ اور محبت کا اظہار صاف صاف کر دیا بس اس کے بعد ہی دونوں کی جنونی محبت شروع ہو گئی۔ عشق کا جنون آگے بڑھا تو دونوں کے دل ہی نہیں جسم بھی ایک ہو گئے۔

ثانیہ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ سکتے میں آ گئی۔ عزت کے علاوہ اس دکھیاری کے پاس کچھ نہیں تھا اور نادان بیٹی عزت کو نیلام کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے بیٹی سے جواب طلب کیا تو رانیہ نے صاف صاف بتا دیا کہ اماں میں کھارو کو چاہتی ہوں اور ہم دونوں جلد شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ثانیہ نے رانیہ کو سمجھایا کہ کھارو اس کے لائق نہیں ہے۔ نہ وہ زیادہ پڑھا لکھا ہے نہ کوئی کام کرتا ہے۔ پھلور سے وزیر پورا تک ساری آوارگیاں اس کے ہی نام درج ہیں۔ کھارو کے ساتھ وہ خوش نہیں رہ سکتی۔ لیکن رانیہ نے ماں کی باتوں پر کان نہیں دھرے، وہ پہلے کی طرح کھارو سے ملتی اور خوابوں میں رنگ بھرتی رہی۔

ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلتے ہوئے بھی آپس میں اتنا فاصلہ ممکن ہے کہ زمین و آسمان کا فاصلہ بھی اس سے کم ہو۔

ثانیہ نے جب دیکھا کہ پریم دیوانی بیٹی پر نصیحتوں کا اثر نہیں ہو رہا ہے تو اس نے بیٹی پر پابندی عائد کر دی۔ جب اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ثانیہ رانیہ پر ہاتھ اٹھانے لگی۔

"جان بوجھ کر میں تجھے جہنم میں نہیں دھکیل سکتی۔" ثانیہ نے ایک دن روتے ہوئے اس سے کہا۔ "مجھے زہر دے کر مار دے اس کے بعد من مرضی کرتی رہنا میں دیکھنے یا روکنے تو نہیں آؤں گی۔"

رانیہ نے یہ باتیں سن کر کھارو کو بتائیں۔ تو جیسے اسے شادی کی آسان راہ سوجھ گئی۔

"ثانیہ چاچی اپنی عمر جی چکیں۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی زندگی میں انہیں دکھ کے سوا ملا کیا ہے۔ اب مزید جی کر وہ کیا کریں گے۔ انہیں مر ہی جانا چاہیے۔ ویسے بھی جب تک وہ زندہ ہیں ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ ماں کا انتخاب کرتی ہو یا میرا۔"

رانیہ پر عاشقی کا ایسا رنگ چڑھا تھا کہ اس نے ماں کی بجائے کھارو کا انتخاب کر لیا۔ اس کے بعد ان دونوں نے مل کر ثانیہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ قتل جیسا سنگین جرم کر کے لاش ٹھکانے لگانا اکیلے کھارو کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے اس نے اپنے دوست واجد کو

سازش میں شریک کرلیا۔ واجد پھلور میں ہی رہتا تھا اور اس کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ قتل کرنا آسان تھا لاش ٹھکانے لگانا مشکل۔ اس لیے کھارو اور واجد نے لاش ٹھکانے لگانے کی تیاری پہلے کی۔

24 اکتوبر کی صبح ہی ان دونوں نے پھلور روڈ پر واقع ایک خشک ڈرین میں لاش دفنانے کے لیے قبر نما گڑھا کھود دیا۔ قبر تیار ہوگئی تو کھارو اور واجد ایک بوری نمک خرید لائے اس کے بعد نے رانیہ کو فون کیا۔ اپنی ماں کو حیراں والا لے آؤ۔ وہاں سے آگے کا کام ہم سنبھال لیں گے۔

منصوبے کے مطابق رانیہ نے چائے بنائی اور اس میں نیند کی گولیاں گھول دیں۔ رانیہ نے وہ نشیلی چائے ماں کو پلائی۔

"اماں! تم ٹھیک کہتی تھیں۔" اس نے اپنی ماں سے کہا۔ "میرے لائق نہیں ہے میں نے تعلقات توڑنے کے لیے اسے حیراں والا بلایا ہے۔ تم بھی ساتھ چلو تو بہتر ہوگا۔"

یہ ثانیہ کے دل کی بات تھی۔ وہ خوشی خوشی رانیہ کے ساتھ اس مقام پر چلی گئی۔ حیراں والا کے سنسان مقام پر کھارو اور واجد پہلے سے موجود تھے۔ وہ ثانیہ کو باتوں میں الجھا کر کھودی گئی قبر کے پاس لے گئے تب تک ثانیہ پر نیند کی گولیوں نے اثر کرنا شروع کردیا تھا۔ اس سے نہ تو ٹھیک سے کھڑا ہوا جارہا تھا نہ بات کرنے کی حالت میں تھی۔ ثانیہ کی اس حالت کا فائدہ اٹھا کر رانیہ نے اُسے دبوچ لیا واجد نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور کھارو نے ثانیہ کے دوپٹے سے اس کا گلا گھونٹنا شروع کردیا دوپٹہ سے سانس رُکنے سے ثانیہ بے ہوش ہوگئی لیکن مری نہیں۔ اس لیے واجد اور کھارو نے موٹر سائیکل کے کچھ وائر سے اس کا گلا گھونٹ دیا ثانیہ مرگئی تو قاتلوں نے اس کی لاش گڑھے میں ڈال کر اس پر نمک کی بوری الٹ دی۔ اور پھر گڑھے کو مٹی سے پاٹنے کے بعد وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس کے بعد پانچ نومبر کو فیملی کورٹ کی اجازت سے رانیہ اور کھارو نے شادی کرلی تھی۔

مصلحت کی بنیاد پر انسانیت کا چغہ اوڑھنا تو ایسا ہی ہے جیسے تھیٹر کا مسخرہ داڑھی لگا کر ہاتھ میں تسبیح پکڑ لے۔

ملزموں کے بیان کے بعد انہی کی نشاندہی پر پولیس کی پوری ٹیم نے گواہوں کی موجودگی میں کھارو سے گڑھا کھدوا کر ثانیہ کی لاش نکلوالی۔ جس کے باقیات ہی رہ گئے تھے۔ باقی سب کچھ سڑگل کر مٹی میں مل چکا تھا۔ اس کے علاوہ ملزموں کے پاس سے مقتولہ کا موبائل فون ٹوٹا ہوا سم کارڈ اور سونے کی ایک انگوٹھی بھی برآمد کر لی گئی۔ اور واجد کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

پولیس نے ثانیہ کے بھائی اظہر علی کی تحریر کی بنیاد پر مقدمہ قتل کے تحت ایف آئی آر درج کر کے رانیہ، کھارو کو عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دیا۔ تادم تحریر رانیہ اور کھارو جیل میں تھے۔ اور نابالغ واجد کو بچوں کی جیل لاہور بھیج دیا گیا تھا۔

جس بیٹی کو پالنے کے لیے ثانیہ نے زندگی بھر تکلیفیں اٹھائیں اور اس خیال سے دوسری شادی نہ کی کہ اس کے بچوں کو سوتیلے پن کا احساس نہ ہو۔ شوہر کے بعد دونوں بیٹوں کے چلے جانے سے جو ثانیہ صرف اس لیے جی رہی تھی کہ اس کی بیٹی کا مستقبل روشن ہو سکے۔ اسی نے اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے ماں کی قبر کھود ڈالی۔

عام آدمی اس لحاظ سے اچھا ہوتا ہے کہ اس کی موت پر بڑے آدمی کی موت کی طرح کوئی بہت بڑا خلا پیدا نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک چارپائی، ایک کمرے یا ایک جھونپڑی کی جگہ خالی ہوتی ہے۔ جسے آسانی سے پُر کیا جاسکتا ہے۔

***

میرا خیال تھا پری آسمان سے خدا کا بھیجا فرشتہ تھا جو زمین پر شیطانیت کے عروج کا جائزہ لینے آیا تھا۔

پری کا قتل

احمد عدنان طارق
انسپکٹر پولیس

دوسری شادی خصوصاً عورت کی ہمارے معاشرے میں اکثر اس وقت کی جاتی ہے جب کوئی عورت خاوند کے چھوڑ دینے کے بعد یا خاوند کے مرنے کے بعد تنہا رہ جائے اور خصوصاً اس تنہائی میں بھی اس کی گود میں ایک آدھ بچہ ہو یا ایک آدھ بچہ اس کی انگلی پکڑ کر چلنے والا ہو اور میکے والے بھی غریب ہوں۔ اکثر شادی کے لیے وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ بچوں کو باپ اور عورت کو سہارا مل جائے گا۔ عورت کو سہارا شاید مل ہی جاتا ہو مگر بچوں کے لیے نئی ماں یا نئے باپ کا سہارا اکثر پائیدار ثابت نہیں ہوتا۔ عورت جو عام طور پر اپنے بچے پر جان دیتی ہے اسے بھی نئے خاوند اور نئے گھر میں مصروف ہونا پڑتا ہے جس سے پہلی شادی سے ہونے والے بچے انتہائی عدم توجہ کا شکار ہوتے ہیں۔

نجمہ کی شادی ماموں کا مجن میں شفیق سے ہوئی تو شاید یہی فارمولا کارفرما تھا کیونکہ نجمہ بہت ہی غریب لڑکی تھی اس کا پہلا خاوند نشئی تھا ایک دن گھر سے گیا تو پھر واپس نہیں آیا اور جب کسی گلی کوچے کی گندگی کے ڈھیر سے اس کی لاش برآمد ہوئی تو کسی کو حیرت نہیں ہوئی بلکہ نجمہ کے اہل خانہ کی جان چھوٹی کہ اگر اس کی لاش نہ ملتی تو شاید نجمہ کو اس کے انتظار میں تنہا کتنے سال انتظار کرنا پڑتا مگر اب وہ دوبارہ نجمہ کا بوجھ سر سے اتارنے کا سوچنے لگے۔ پہلے یہ بوجھ صرف نجمہ کا تھا مگر اب اس کی گود میں دو سالہ پری بھی تھی پری بہت خوبصورت بچی تھی میرے خیال میں اگر نجمہ کے خاوند نے زندگی میں کوئی کام کیا تھا تو وہ پری کا باپ بننا تھا۔

اپنے گاؤں سے نجمہ دلہن بنی پری کو گود میں اٹھائے ماموں کا مجن شفیق کا گھر بسانے آ گئی۔ شفیق نے کبھی بھی پری کو اپنے بچوں کی نظر سے نہیں دیکھا شفیق بھیرا تھا اور قریبی بھٹہ خشت پر مزدوری کرتا تھا روٹی کا حصول نجمہ اور پری کے لیے پہلے بھی بڑا مشکل تھا اور

اب بھی شفیق بڑی مشکل سے اپنا اور ان کا پیٹ پالتا تھا۔ پری بالکل معصوم پری کی مانند تھی وہ گویا کیچڑ میں کھلا کنول تھا۔ اگلے دو تین سالوں میں وہ توتلی زبان میں بولتی سہیلیوں کے ساتھ گلی میں کھیلتی رہتی سہیلیاں اپنے گھر بھی چلی جائیں مگر پری کو گھر کسی نے نہیں بلایا اس کی ماں شفیق کے بچے کو بڑا کرنے میں مصروف تھی۔ شفیق کا سارا پیار اپنے بچے کے لیے وقف تھا اور اس کی مسلسل دھتکار کی حق دار صرف اور صرف پری تھی۔ محلے میں سب کو علم تھا کہ شفیق کا پری سے کیسا سلوک تھا۔ شفیق کا محلہ معمول کا محلہ نہیں تھا بلکہ سول ہسپتال ماموں کانجن جو شہر سے باہر بنا ہوا تھا۔ میں 1996ء کی بات کر رہا ہوں اب تو شہر اتنا پھیل گیا ہے کہ ہسپتال یوں لگتا ہے کہ بالکل شہر کے وسط میں ہو۔ جب سول ہسپتال کے ملازمین اور شہر کے باہر واقع اینٹوں کے بھٹوں کے مزدوروں نے مل کر چند گھر سول ہسپتال کے بالکل سامنے بنائے ہوئے تھے اور گویا وہاں ایک بستی سی بن گئی۔

میں کوئی چار پانچ ماہ سے تھانہ ماموں کانجن میں ایس ایچ او تعینات تھا اور خدا کا فضل تھا کہ ان پانچ ماہ میں کوئی ایسی زبردست واردات نہیں ہوئی تھی جو میرے لیے مشکل بنی ہو، معمول کا جرم ہو رہا تھا اور وہ تو ہوتا ہی رہتا ہے جب سے حضرت آدم زمین پر تشریف لے آئے تھے۔ پھر ایک دن شفیق اور اس کی بیوی نجمہ تھانہ کے باہر مجھے ملے میں سرکاری گاڑی سے اتر کر تھانہ کی بلڈنگ میں داخل ہونے لگا تو میری نظر نجمہ اور اس کے خاوند پر پڑی۔ نجمہ کی گود میں بچہ اور آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے میں سیدھا تھانے جانے کی بجائے ان کے پاس گیٹ کے قریب ہی رک گیا اور ان سے تھانے آنے کا مقصد پوچھا تو نجمہ نے مجھے بتایا کہ دو روز سے میری بیٹی پری گھر نہیں آئی۔ میں نے پری کی عمر کا پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ ابھی وہ صرف پانچ سال کی ہے۔

میں نے نجمہ اور اس کے خاوند کو اپنے دفتر میں بلوا لیا اور مختلف سوال کرتا رہا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا بلکہ سارے حالات جان کر مجھے ایسے لگا جیسے کوئی بردہ فروش راہ چلتے اس معصوم پھول کو اغوا کر کے لے گیا ہے یا اس بے چاری ننھی پری پر کوئی اور افتاد ٹوٹ پڑی ہے۔ نجمہ نے بتایا کہ دو روز قبل جب پری گم ہوئی ہے اس کا خالو ہمیں ملنے آیا تھا جس کا شفیق نے برا منایا تھا اور پری کے خالو کو برا بھلا کہہ کر نکال دیا تھا ہو سکتا ہے وہ جاتے وقت پری کو ساتھ نہ لے گیا ہو۔ ان دنوں موبائل فون نہیں تھے کہ فوراً پتہ کر لیا جاتا میں نے شفیق سے پوچھا کہ تم نے پری کا پتہ اس کے خالو سے کیوں نہیں کیا تو اس نے اپنی رام کہانی شروع کر دی کہ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں کہ وہ کرایہ لگا کر چیچہ وطنی جائے اور وہاں جا کر معلوم کرے کہ پری کو اس کا خالو لے کر آیا ہے یا نہیں۔ میں نے اسے خاصی لعن طعن کی اور جیب سے اسے کرایہ دے کر کہا کہ وہ جا کر چیچہ وطنی سے پتہ کرے بلکہ پری کے خالو کو ساتھ لے کر واپس آئے۔

دیہات کا تھانہ تھا ان دنوں الیکٹرونک میڈیا تو ویسے ہی ناپید تھا ہاں اخبار وغیرہ تھے آج کل تو اس طرح کی گمشدگی کے کیس ویسے ہی بریکنگ نیوز بن جاتے ہیں مگر جب بسیار کوشش کے بعد اخبار وغیرہ میں اشتہار دینے پڑتے تھے اور غریب آدمی ان اشتہارات کے اخراجات افورڈ نہیں کر سکتا تھا میں نے روزنامچہ میں شفیق کی طرف سے رپٹ لکھوائی ایک تھانیدار صاحب کی ڈیوٹی اس کیس پر لگائی۔ روزنامہ جنگ کے پریس رپورٹر شیخ زبیر میرے دوست تھے انہیں زحمت دی اور کہا کہ اخباروں میں اشتہار دے دیں تھانیدار صاحب کی ڈیوٹی میں نے پری کو علاقے میں ڈھونڈنے کے واسطے نہیں لگائی تھی بلکہ شفیق پر نظر رکھنے کے لیے لگائی تھی میرے ذہن میں یہ احساس کلبلا رہا تھا کہ آخر وہ پری کا

سوتیلا باپ ہے اور ماضی کی کہانیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ سوتیلی مائیں اور باپ کیا کر سکتے ہیں پری کی تصویر بھی کسی نے کھنچوائی ہی نہیں تھی لہٰذا فوراً میرے ذہن میں پانچ سال کی کوئی بھی بچی تھی شفیق گیا اور واپس آ گیا اس کے ساتھ پری کا خالو اور خالو بھی تھے انہوں نے قسمیں کھا کر ہمیں بتایا کہ وہ پری کو لے کر نہیں گئے محلّہ کے لوگوں کو میں نے تھانہ بلوایا مگر وہ زیادہ تر شفیق کی برائی ہی کرتے رہے کہ یہ ظالم اس بچی سے کام بھی کرواتا تھا اور اسے جھڑکتا بھی رہتا تھا۔

لیکن دو دن بعد واقعی پری کا اغواء بریکنگ نیوز ہی بن گیا جب اس معصوم پھول جیسی بچی کی پامال لاش ایک گٹر جو اس محلّہ میں تھا سے برآمد ہوئی۔ مجھے جیسے ہی اطلاع ہوئی میں موقعہ پر پہنچا تو ایک بھیڑ تھی جو پری کی لاش کے گرد جمع تھی گٹر کے قریب ہی ایک چارپائی پر بچی کی نعش لوگوں نے ڈال کر اوپر سے چادر ڈالی ہوئی تھی جتنا مجمع تھا سب کی آنکھیں اس اندوہناک واقعہ سے پرنم تھیں سب کا یہی خیال تھا کہ بچی گٹر میں ڈوب کر مری ہے اور دو دن تک ڈوبی رہی جب تک کسی جانور نے اسے کھانے کے لیے کھینچ کر پانی سے نکالا بچی کا نچلا دھڑ اُدھڑا ہوا تھا جس کے بارے میں بھی مجمع کی یہی رائے تھی کہ شاید کسی کتے نے اسے کھانے کی کوشش کی ہے۔

مجمع کی گود میں ابھی بھی شفیق کا بچہ تھا اور وہ بچی کے سرہانے بیٹھی بین کرنے میں مصروف تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر میں بیہوش ہو جاتی تھی شفیق بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا میرا دل ابھی بھی اس کے بارے میں صاف نہیں تھا بہرکیف میں نے بچی کی نعش پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھجوا دی شام کو جب مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی تو وہ میرے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھی۔ کسی درندہ صفت انسان نے پری جیسی معصوم گڑیا کے ساتھ وہ ظلم کیا تھا جو ضبطِ تحریر میں لانا بھی چاہوں تو نہیں لایا جا سکتا کسی حیوان نے پری کو اس طرح پامال کیا تھا کہ اس نازک فرشتے کی موت زیادتی کی وجہ سے ہوئی تھی اور یہ ظلم اتنا شدید تھا کہ اس بچی کی پسلیاں بھی اپنی جگہ چھوڑ چکی تھیں۔ ہمارا خیال تھا کہ بچی کا نچلا دھڑ کسی کتے نے اودھیڑا ہے کسی حد تک یہ خیال درست تھا وہ شخص بھی کسی کتے سے کم نہیں تھا جس نے پری کا نرم و نازک جسم بھنبھوڑ کھایا تھا۔

اب میں حیران تھا کہ شفیق جیسا شخص اتنے گھناؤنے انداز میں پری کو کیسے مار سکتا ہے، ہو سکتا ہے سوتیلے پن میں آ کر وہ اپنی بچی کو مار دے مگر اس انداز اور درندگی سے، یہ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ اس وقت الیکٹرانک میڈیا پاکستان میں نادارد تھا لہٰذا خبروں کی آگہی لوگوں کو اس وقت ہوتی تھی جب روپے مد ہم پڑ جاتے تھے پھر سے لہجہ معمول پر آ جاتے تھے بہت سے لوگوں نے اگرچہ غریب کی بچی کے پوسٹ مارٹم پر غور ہی نہیں کیا لیکن میرے اندر بھی دل تھا اور میں بھی انسان تھا میں نے دل میں تہیہ کیا اور دعا بھی مانگی کہ میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ کسی طرح میرے ہاتھ اس درندہ صفت انسان کی شاہ رگ تک پہنچ جائیں۔

میں نے اگلے دن ہی شفیق کو تھانہ بلا کر اس سے تفتیش شروع کر دی وہ اسی بات پر بضد تھا کہ ٹھیک ہے سوتیلی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ پری سے محبت نہیں کرتا تھا مگر اس طرح کا قتل تو وہ سوچ ہی نہیں سکتا بلکہ اس کی باتوں سے یہ بات واضح طور پر جھلک رہی تھی کہ اسے اس واقعہ کا دلی افسوس ہوا ہے مگر ظاہر ہے کہ ان طفل تسلیوں سے میں مطمئن نہیں ہو سکتا تھا میں نے اسے حوالات میں بند کر دیا تا کہ اس سے رات کی خاموشی میں تفتیش کی جا سکے۔

رات کے پچھلے پہر میں نے اس سے اپنے انداز

میں تفتیش کی اور یہ انداز اگلے دو روز تک جاری رہا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اتنا مضبوط انسان تھا جو پولیس کی تفتیش برداشت کر سکے۔ پولیس والوں کا ملزموں کے بارے میں لگایا گیا اندازہ بھی کبھار ہی غلط ثابت ہوتا ہے اس لیے دو دن تفتیش کے بعد حالات چاہے شفیق کی طرف اشارہ کر رہے ہوں مگر میرا دل کہتا تھا کہ یہ شخص اس قسم کا جرم نہیں کر سکتا دوسرا بچی کا روندا ہوا جسم اس درندے کی طاقت کا جو اندازہ دیتا تھا شفیق کی جسمانی حالت میں ایسی طاقت ناپید تھی۔ بہر کیف دو تین دن کی محنت کے بعد میں دوبارہ اسی چوراہے میں کھڑا تھا جہاں مجھے علم نہیں تھا کہ منزل کس سمت میں ہے۔ شفیق ابھی حوالات میں ہی تھا البتہ میں نے اس سے پوچھ گچھ چھوڑ دی تھی۔ نجمہ اپنے دل میں بچی کا غم لیے پھرتی تھی اس کے علاوہ وہ دو وقت اپنے خاوند کو روٹی دینے بھی تھانہ میں آتی تھی اس خاوند کو روٹی دینے کے لیے جس پر اس کی پانچ سالہ بچی کے المناک قتل کا الزام تھا۔ شفیق سے تفتیش کے بعد میں نے شفیق کے ساتھ بھٹہ پر کام کرنے والے مزدوروں کے متعلق چیک کرنا شروع کر دیا اور گرد کے بھٹہ مزدوروں کو بھی شامل تفتیش کیا محلہ میں رہنے والے اوباش لڑکوں کو چیک کیا قریبی ایسے لوگوں سے تفتیش کی جن کا کوئی سابقہ ریکارڈ تھا مگر اگلے دو تین دن مزید اسی اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارتے رہنے کے بعد میرے لیے اپنے خدا سے مدد مانگنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

ایک دن تنہا بیٹھا میں اس کیس پر ہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح وہ ظالم اس بچی کو اٹھا کر لے گیا اگر لے کر گیا تو کسی نے تو اسے دیکھا ہوگا اگر صرف بچی کو اٹھانا مقصد تھا تو اس کی آبروریزی کے بعد نعش کا وہیں سے برآمد ہونا اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ شخص وہیں کہیں قریب ہی رہتا تھا اور اس جنونی سے دوبارہ معاشرہ کہاں محفوظ تھا وہ کوئی پھول دوبارہ اپنے پاؤں تلے روند سکتا تھا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے تصور ہی تصور میں وہ روح فرسا منظر گھومنے لگا بچی کی دلخراش چیخیں میرے لاشعور میں گونجیں پھر اس کی موت کا منظر، پھر اس کی موت کے بعد بھی درندگی کا جاری رہنا کس طرح بچی کے زخموں سے خون کے فوارے ہوا میں بلند ہوئے ہوں گے میں خوف خدا سے کانپنے لگا تبھی اس سارے واقعے سے میرے ذہن میں ایک خیال آیا جس میں اگر میں کامیاب ہو جاتا تو شاید اس کیس کا عقدہ حل ہو جاتا۔

میں نے بڑی رازداری سے ہسپتال کے قریب جن دھوبیوں کی دکان تھی ان کو تھانہ بلانا شروع کر دیا وہ صرف دو یا تین تھے جو شہر سے باہر دکانیں بنائے ہوئے تھے اور ہسپتال کے نزدیک تھے۔ میں نے ان تینوں اشخاص کو ہر طرح سے ڈرایا دھمکایا پھر انہیں ان کی آخرت یاد دلائی بچی والے واقعہ سے ان کی چھپی انسانیت کو جگانے کی کوشش کی۔ میں ان سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کوئی بندہ بچی کے قتل کے بعد اپنے کپڑے دھونے کے لیے دھوبی کو دے کر گیا ہو جس کی قمیص کے اگلے دامن پر خون کے چھینٹے پڑے ہوں ظاہر ہے وہ درندہ درندگی میں جس فعل سے گزرا تھا یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کی قمیص اس بے بس مظلوم کے خون سے سندگی گئی ہو۔ اب یہ میری قسمت تھی کہ میرا مفروضہ کامیاب ہوتا ہے کہ نہیں کیا اس غلیظ شخص نے واردات کرتے ہوئے قمیص تو نہیں اتاری ہوئی تھی؟ کہیں اس نے اپنے خون آلود کپڑے جلا نہ دیے ہوں ہو سکتا ہے اگر وہ خون آلود کپڑے پہنے ہوئے تھا تو کسی نے اسے دیکھا کیوں نہیں؟ تینوں دھوبیوں کو میں علیحدہ علیحدہ ملاتہائی میں ہر طرح سے انہیں یاد دلایا کہ بتائیں کیا ان کے پاس لڑکی کے غائب ہونے کے بعد کوئی خون آلود کپڑے آئے ہوئے ہیں۔ تینوں نے لاعلمی کا اظہار کیا بڑی سوچ بچار

کے بعد بھی انہیں یاد نہیں آیا کہ اس قسم کے کپڑے ان کی نظر سے گزرے ہوں ایک کے بعد ایک تینوں مجھے مایوسی کے گہرے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے چھوڑ کر چلے گئے۔

میں بطور ایس ایچ او ظاہر ہے کہ اپنی دوسری ڈیوٹیاں بھی نبھا رہا تھا لیکن میری سوچ پری کے ساتھ ہونے والے ظلم پر ہی اڑ گئی تھی مجھے اللہ کے گھر سے پوری امید تھی کہ ایک معصوم بچی کا قتل ضرور رنگ لائے گا۔ کہتے ہیں خون بولتا ہے اور یہ خون تو ابھی رگوں میں دوڑنا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ دو دن اور گزر گئے ایک آئیڈیا جو خدا نے میرے ذہن میں ڈالا تھا اور جس سے میں ذہنی طور پر مطمئن تھا کہ اس آئیڈیے سے مجھے قاتل تک رسائی ہو جائے گی وہ امید آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی دو دن بعد میں سارا دن کام کر کے اور پھر رات کو گشت کر کے اپنے گھر میں واپس آیا میرا ڈرائیور اور میرے گن مین مجھے گھر چھوڑ کر چلے گئے تو گھر میں میرے ملازم نے کھانا میرے سامنے چن دیا اور ساتھ ہی مجھے بتایا کہ ایک دھوبی بڑی دیر سے اس کے پاس آیا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس نے ایس ایچ او صاحب سے کوئی بات کرنی ہے لہٰذا میں نے اسے بٹھایا ہوا ہے۔

ملازم کی یہ بات سن کر مجھے کھانے کی ہوش نہیں رہی میں نے فوراً دھوبی کو بلایا وہ مجھے پہلے بھی مل چکا تھا اس نے مجھے جو معلومات دیں وہ ایسی تھیں جیسے اس معصوم بچی کا خون بول رہا تھا مجھے دھوبی نے بتایا کہ قتل کے اگلے ہی دن ہسپتال کا ایک ملازم عمانوئیل مسیح اپنے کپڑے مجھے دھونے کے لیے دے گیا تھا جس کی قمیص پر خون کے واضح دھبے تھے اس کے کہنے کے مطابق عمانوئیل کی عمر کوئی پچیس چھبیس سال تھی میرے پوچھنے پر اس نے مجھے بتایا کہ میرا ذہن عمانوئیل کی طرف اس لیے نہیں گیا کیونکہ وہ پوسٹ مارٹم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا میں نے سمجھا کہ شاید وہ پوسٹ مارٹم کر کے لے آیا ہے اس لیے اس کے کپڑوں پر خون لگا ہوا ہے میں نے اسے بتایا کہ مرنے کے بعد اگر لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جائے تو خون فوارے کی صورت نہیں نکلتا بہرکیف اس دھوبی نے انسانیت کا فرض ادا کر دیا تھا میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ہر صورت میں اس کا نام صیغہ راز میں رکھوں گا وہ دھوبی اپنا کام مکمل کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے تھانہ میں ٹیلی فون کیا اور سرکاری گاڑی دوبارہ واپس منگوا لی میرے بعد قدرتی طور پر گشت اسی تھانیدار کی تھی جس کو مقدمہ درج کرنے کے بعد میں نے تفتیش مارک کی تھی میں نے اسے عمانوئیل مسیح کا کل وقوع بتایا اور اسے اٹھا لانے کی ہدایت کر کے کچھ گھنٹے آرام کی غرض سے بستر کے گوشہ عافیت میں چلا گیا۔

صبح تھانہ میں پہنچتے ہی عمانوئیل کو میرے سامنے پیش کر دیا گیا پچیس چھبیس سال کا غیر شادی شدہ مرد، اتنی عمر میں جتنا مضبوط جسم خدا کسی کو دے سکتا ہے وہ خدا نے عمانوئیل مسیح کو دے رکھا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر یہی وہ بھیڑیا ہے تو پری جیسی بچی کیا کر سکتی تھی۔ ابھی کیونکہ عمانوئیل کے اٹھائے جانے کی خبر عیسائی کمیونٹی میں نہیں پھیلی تھی اور اس کے لواحقین بھی کسی پادری کی سفارش ڈھونڈنے چلے گئے تھے میرے پاس جتنا تھوڑا بہت وقت تھا میں نے اسی میں اس سفاک ملزم کو بریک کرنا تھا تفتیش کرنے کے لمحات ظاہر ہے ضبط تحریر میں نہیں لائے جا سکتے تھے بہرکیف اس کام میں خاصی دیر لگ گئی عام طور پولیس ملزمان کو ملزمان کے طور پر ہی ٹریٹ کرتی ہے مگر نوکری میں کئی لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب آپ سمجھتے ہو کہ یہ آپ کا ذاتی کام ہے اور خود آپ کے جذبات بھی تفتیش میں شامل ہو جاتے ہیں وہاں خود ہی سنبھلنا ہوتا ہے اور ان جذبات کو قابو میں رکھنا ہوتا ہے کیونکہ جذبات کی رو میں بہہ کر غلطی کا احتمال بڑھ

جاتا ہے۔

عمانویل سے تفتیش جوں جوں لمبی ہورہی تھی مسیحی برادری کی طرف سے آہستہ آہستہ پریشر بڑھتا جارہا تھا اس وقت الیکٹرونک میڈیا نہ ہونے کی وجہ سے عمانویل سے ابھی بھی تفتیش جاری تھی آج کا دور ہوتا تو کیا ہوسکتا ہے گوجرہ میں ہونے والے واقعہ سے اس کا سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پری کی آبرو ریزی کا معاملہ آج ہوتا تو یورپ کا کوئی ملک عمانویل مسیح کو سیاسی پناہ دے چکا ہوتا بہر کیف میں آپ کو اپنی ایک تفتیش کی روئیداد سنا رہا ہوں اس میں مناسب نہیں کہ کوئی سیاسی بات کی جائے۔

آخر میں اور عمانویل مسیح تفتیش کے دوران ایک ایسے پریشر پوائنٹ پر پہنچ گئے جہاں ہم میں سے کسی ایک نے بریک ہونا تھا میں کیونکہ ٹیکنیک سے کام کر رہا تھا مجھے کامیابی نصیب ہوئی وہ ٹوٹ گیا اور پھر اس نے مجھے اس دلخراش واقعہ کی روئیداد سنائی۔ اس نے بتایا کہ پری دوپہر کو گلی میں اکیلی کھیل رہی تھی جون کا مہینہ تھا اور اتنی شدید گرمی تھی کہ کوئی اور شخص گلی میں موجود نہیں تھا عمانویل کے ذہن میں یہ شیطانی منصوبہ آیا پوسٹ مارٹم ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے کی وجہ سے سول ہسپتال کے ہر شعبہ تک عمانویل کی رسائی تھی عمانویل کے گھر میں کلوروفام موجود تھا اس نے ایک رومال پر اسے لگایا پری کو پیار سے پچکارتے ہوئے وہ رومال اس کے ناک سے لگایا اور پھر اسے اپنے بدن پر پہنی ہوئی قمیص کے نیچے لپٹا لیا۔ عمانویل کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور اوپر سے اس نے چولا نما قمیص پہن رکھی تھی بچی بیچاری بڑی آسانی سے عمانویل کے جسم میں چھپ گئی اوپر سے عمانویل نے اپنے ہاتھ باندھ لیے جب سے اس نے چھپائی ہوئی بچی کو آسانی سے سنبھال لیا وہ اسے لے کر ادھر ادھر دیکھتا محلہ سے نکل گیا محلہ کے عقب میں فصلیں تھیں وہ اسے کاشت کردہ کپاس کے کھیتوں میں لے گیا اور پھر اس کے ساتھ بہیمانہ ظلم کیا بچی بے ہوش تھی چیخ بھی نہ سکی اور بیہوشی کے عالم میں ہی خدا کے پاس چلی گئی جب اس درندہ نما انسان کو ہوش آیا تو وہ خون میں لت پت بچی کو وہیں چھوڑ کر وہاں سے رفوچکر ہوگیا بچی اسی حالت میں وہاں رات تک پڑی رہی رات کو عمانویل خاموشی سے واپس اس فصل میں گیا اور بچی کو اٹھا کر گٹر میں پھینک دیا اور اس کے اوپر ایک پتھر رکھ دیا کسی جانور نے جب بچی تک پہنچنا چاہا تو پتھر پیچھے ہٹ گیا اور بچی گٹر کے اوپر آگئی جس سے لوگوں کو پتہ چلا کہ کیا سانحہ رونما ہوچکا ہے۔

میں اسے لے کر موقعہ پر گیا وہاں ابھی بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے قیامت ابھی ٹوٹی ہے فصلوں میں پودوں کے ٹوٹنے کی ترتیب سے لگ رہا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے اور ابھی بھی وہاں خون کے چھینٹے عمانویل کی درندگی کی داستان سنا رہے تھے۔ میں نے سینئر افسران کو موقعہ دکھایا اور ایم پی اے سے لے کر مسیحی پریشر گروپوں کو بھی۔ جو چند ووٹوں کی خاطر ایمان بھی فراموش کردیتے ہیں موقعہ سے خون لے کر فرانزک سائنس لیبارٹری بھجوایا مجھے پتہ تھا کہ یہ پری کے خون سے میچ ہوجائے گا فرانزک سائنس والے لکھ دیں گے کہ یہ انسانی خون ہے آپ بھی اس بات پر متفق تو ہوں گے کہ پری انسان کا بچہ تھا۔ میں نے پوری محنت سے عمانویل کا چالان بنا کر عدالت میں بھجوایا اور عمانویل کو جیل، اب میری خواہش تھی کہ اس کیس میں صلح نہ ہوجائے عمانویل کے پیسے اس کی کمیونٹی نے دینے تھے مگر پری ویسے ہی بوجھ تھی شفیق کو اس سے نفرت تھی اور روپوں سے محبت، میرا خیال تھا پری آسمان سے خدا کا بھیجا فرشتہ تھا جو زمین پر شیطانیت کے عروج کا جائزہ لینے آیا تھا۔

☆☆☆

موساد کے خفیہ جاسوس

ستمبر 1929ء میں یروشلم میں بیٹھ کر جن یہودی رہنماؤں نے عربوں کے مزید حملوں سے بچنے کے لیے ان کی جاسوسی کرنے کا لائحہ عمل سوچا تھا 28 سال بعد دنیا کی ایک خوفناک ترین جاسوس ایجنسی "موساد" کی صورت میں سامنے آ گیا۔

میاں محمد ابراہیم طاہر
0300-4154083

قسط: 2

یروشلم میں ستمبر 1929ء کے جمعہ کا دن باقی عام دنوں سے قطعی مختلف تھا صبح صادق کے وقت سے ہی ملبوس بوڑھے، جوان، بچے، کسان، مزدور، تاجر، اساتذہ، شہری اور دیہاتی ہاتھوں میں کتاب مقدس لیے "دیوار گریہ" کی طرف رواں دواں تھے۔ یہ دیوار مقدس ہیرود اعظم کے تعمیر کردہ دوسرے سب سے بڑے معبد کی باقیات میں سے تھی اور یہودی اس کے سامنے عبادت کرنے کو اپنا مذہبی حق سمجھتے تھے۔

یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں اور مربیوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ فلسطین کے تمام یہودی بلا استثناء امیر و غریب، بچہ بوڑھا جوان اس جمعہ کے روز اپنی یک جہتی، اتحاد اور مذہبی یگانگت کا مظاہرہ کرنے اور اجتماعی عبادت کے لیے یروشلم میں جمع ہوں، چنانچہ فلسطین کے کونے کونے دور و نزدیک حتیٰ کہ جینہ، تل ابیب اور گلیلی کے ساحل تک سے یہودی چلے آ رہے تھے۔ یہ گویا فلسطین کی عرب اکثریت کو ایک قسم کی وارننگ اور چیلنج تھی کہ یہودیوں کو بزور طاقت ان کے دیوار گریہ کے سامنے حق عبادت سے روکا نہیں جا سکتا اور نہ انہیں دبایا جا سکتا تھا۔

کئی ماہ سے افواہیں گردش میں تھیں کہ فلسطین کی مسلم اکثریت میں یہودیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف غم و غصہ پایا جاتا ہے۔

دراصل مسلم فلسطینی عربوں کی بے چینی کا آغاز تو 1917ء سے ہی ہو گیا تھا جب "اعلان بالفور" کے ذریعے برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین کے اندر "صیہونی ریاست" کے قیام کا یقین دلایا تھا

مسلمان جو پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے وقت سے فلسطین میں آباد چلے آ رہے تھے اور کاشتکاری کرتے تھے۔ اپنی زمینوں کے چھن جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ انگریز، جنہوں نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر فلسطین پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو اپنا محکوم بنا لیا تھا، انہیں دبانے اور یہودیوں کو خوش کرنے کے لیے اُن سے "آزاد صیہونی ریاست" کا وعدہ کیا تھا۔ اس سے یہودیوں اور عربوں کے درمیان چپقلش بڑھ گئی۔ برطانیہ کی شہ پر یہودیوں نے مسلمانوں کا خون بہانا شروع کر دیا اور عربوں کے علاقوں میں زبردستی اپنے معبد اور مذہبی سکول تعمیر کرنے شروع کر دیے۔

اُس روز، دوپہر کے وقت تک جو کہ اُن کی "نماز شا" کا وقت تھا، پیلے رنگ کے پتھر کی "دیوار گریہ" کے سامنے ایک ہزار سے زائد یہودی اونچی آواز میں قدیم کتاب مقدس کی آیات کی تلاوت میں مصروف تھے۔ اُن کی اجتماعی آواز کا زیر و بم عجب سماں باندھے ہوئے تھا۔

عین اُس وقت اس مذہبی اجتماع پر ہر طرف سے اچانک انتہائی تیزی کے ساتھ پتھروں، ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور کنکریوں سے بھرا ہوئے ٹین کے ڈبوں کے میزائل برسنا شروع ہو گئے۔ یہ حملہ "دیوار گریہ" کے ارد گرد سے عربوں نے کیا تھا۔ پھر گولی چلنے کی آواز نے دہشت پھیلا دی اور بازار کے مسلم دکاندار پستول سے فائرنگ کرنے لگے۔ جو یہودی زخمی ہو کر گرتا تھا اُسے اس کے بھاگتے ہوئے ساتھی اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے جاتے تھے۔ معجزانہ طور پر کوئی ہلاک نہیں ہوا، زخمیوں کی تعداد بے شمار تھی۔

نوٹ مترجم: (مصنف نے جس چیز کا ذکر نہیں کیا یا جان بوجھ کر چھپایا ہے۔ وہ یہ تھی کہ دوپہر کے وقت یہودیوں نے عین اس فلک شگاف آواز میں اپنی "گریہ زاری" کا آغاز کیا تھا جب قریبی مسجد اقصیٰ میں مسلمان جمعہ ادا کر رہے تھے۔ گویا یہودیوں نے ایک منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں کو مشتعل کیا تھا)۔

اُسی رات فلسطین میں یہودیوں کی تنظیم "ہاشوا"

کے لیڈروں کا یروشلم میں اجلاس ہوا۔ انہیں فوراً ہی یہ احساس ہو گیا کہ انہوں نے نہایت احتیاط سے اپنی طاقت کے مظاہرے کی جو منصوبہ بندی کی تھی اس میں ایک بہت بڑی مساجد کے میناروں سے ملاؤں کی صدائیں بلند ہونے لگیں کہ "ان یہودیوں کو واپس سمندر میں پھینک دیا جائے" (کیونکہ وہ سمندری راستے سے ہی فلسطین میں داخل ہوتے تھے)۔

عربوں کی ہر محفل، ہر مجلس اور منتخب نمائندوں کے ہر اجلاس سے غم و غصہ اور اشتعال کی ایسی ہی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"ہمیں ہر صورت میں یہودیوں کو ہماری زمینوں پر قابض ہونے سے روکنا چاہیے ہمیں ہر حال میں انگریزوں کو ان میں اسلحہ تقسیم کرنے اور لڑائی کی تربیت کرنے سے باز رکھنا چاہیے۔"

دوسری طرف یہودیوں نے بھی احتجاج شروع کر رکھا تھا کہ "قابض انگریز حکومت عربوں سے قانونی طریقے سے خریدی گئی زمینوں پر انہیں دوبارہ قبضہ کرنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ جبکہ عربوں کو زمین کی پوری پوری قیمت ادا کی جا چکی ہے۔"

انگریز اپنی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی مسلمہ پالیسی کے مطابق دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف خفیہ خفیہ شہ دے رہے تھے لیکن ان کی اصل ہمدردی یہودیوں کے ساتھ ہی تھی۔

1936ء میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان اکا دکا ہونے والی جھڑپوں نے مکمل جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنی بے رحمانہ طاقت سے دونوں فریقوں کی مکمل بغاوت کو کچل دیا لیکن اس سے یہودیوں میں یہ احساس پختہ ہو گیا کہ یہ وقتی فائر بندی ہے۔ موقع ملتے ہی عرب اُن پر زیادہ طاقت اور منظم قوت کے ساتھ حملہ آور ہوں گے۔

چنانچہ پرجوش نوجوان یہودی جوق در جوق اپنی جنگجو ملیشیا "ہاگانا" میں شامل ہونے لگے اور اس ملیشیا نے جلد ہی نہایت منظم، مضبوط اور تربیت یافتہ خفیہ یہودی آرمی کا روپ دھار لیا۔ عربوں کی جاسوسی کے نظام کو از سر نو منظم کیا گیا، اور غلط اطلاعات اور افواہوں کے ذریعے عربوں میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کی مہم شروع کر دی، اس مقصد کے لیے "ہاگانا" نے اپنا ایک سیاسی شعبہ قائم کر لیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ بعد میں اسرائیل کی جاسوس ایجنسی کے سربراہ بنے انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے آغاز (1939ء) سے قبل اسی دور میں اپنی جاسوسی کی تعلیم و تربیت مکمل کی تھی۔

"ہاگانا" کے لفظ کا مطلب عبرانی زبان میں ہے "دفاع" چنانچہ "ہاگانا" سرزمین مقدس کی سب سے زیادہ منظم، مضبوط اور تربیت یافتہ خفیہ تنظیم بن گئی۔ جس کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔

یہودی رہنماؤں کی ایک میٹنگ 1942ء میں ساحلی شہر جافہ میں منعقد ہوئی، جس میں ڈیوڈ بن گوریان اور یزہاک رابن بھی شریک ہوئے (دونوں بعد میں اسرائیل کے صدر بنے) اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہالوکاسٹ سے بچ رہنے والے (جرمن) یہودیوں کو ان کی مقدس سرزمین "ارض اسرائیل" میں لا کر بسانا چاہیے کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ نئے آنے والے یہودی مہاجرین کی تعداد کتنی ہو گی؟ لیکن سب کو علم تھا کہ اس سے عربوں کے ساتھ نئی چپقلش کا آغاز ہو جائے گا اور انگریز عربوں کا ساتھ دیں گے اور کھلم کھلا یہودیوں کی مخالفت کریں گے۔

برطانیہ نے واضح کر دیا تھا کہ ہٹلر کی شکست کے بعد جرمنی میں زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو کسی صورت بھی فلسطین میں داخلے کی اجازت نہیں دے گا۔ کیونکہ اس سے عربوں اور یہودیوں کے درمیان توازن

آبادی بگڑ جائے گا۔

اس اجلاس میں بن گوریان نے اپنی جاسوسی کی تنظیم کو جدید خطوط پر منظم کرنے پر زور دیا تھا، جس کی اجلاس میں مکمل تائید کی گئی تھی۔ نئے مخبر اور جاسوس بھرتی کرنے، ایسے یہودیوں کی نشاندہی کرنے۔ جو درپردہ انگریزوں سے تعاون کرتے تھے، کونٹر انٹیلی جنس کے شعبے کا قیام اور اپنے اندر کے کیمونسٹوں جاسوسوں اور مخبروں کو بے نقاب کرنے کے لیے "ریگول بیکی" نامی یونٹ قائم کیا گیا جس کی قیادت ایک سابق فرانسیسی جاسوس، جو ڈبل کراسنگ ایجنٹ کے پردے میں کام کرتا رہا تھا کے سپرد کی گئی۔ جلد ہی اس نے یہودی عورتوں، دکانداروں اور طعام گاہوں کے مالکوں اور ملازموں کو جو انگریزوں کے ساتھ بزنس یا کاروبار کرتے تھے ان کی (انگریزوں) کی جاسوسی کے لیے متحرک کر دیا۔ اس طرح یہودیوں کے اندر انگریزوں یا عربوں کے مخبر پکڑے جاتے تھے ان کا "ہاگانا" عدالت میں آدھی رات کے وقت کورٹ مارشل ہوتا تھا۔ مجرم پائے جانے کی صورت میں انھیں سخت ترین جسمانی اذیتوں سے تڑپا تڑپا کر مار دیا جاتا تھا یا پہاڑیوں میں لے جا کر کھوپڑی کی پشت پر ایک ہی گولی سے ان کا خاتمہ کر دیا جاتا تھا۔ یہ ان وحشیانہ کارروائیوں کی ابتداء تھی جو "موساد" نے اپنے باقاعدہ قیام کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ جاری رکھیں۔

1945ء تک "ہاگانا" نے ایک ایسا شعبہ بھی قائم کر دیا تھا جس کا کام ہتھیاروں اور اسلحہ کا حصول تھا۔ افریقہ میں جرمن جنرل رومیل کی شکست کے بعد اٹلی اور جرمنی کا جو اسلحہ اتحادی افواج کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ ان یہودی فوجیوں نے جو اتحادی افواج میں شامل تھے، سمگل کر کے مصر کے صحرائے سینائی کے راستے فلسطین پہنچانا شروع کر دیا یہ اسلحہ بے شناخت ٹرکوں اور اونٹوں کے قافلوں کے ذریعے سمگل کیا جاتا تھا اور صحرائی ان غاروں میں چھپایا جاتا تھا جن میں شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ورغلانے کی کوشش کی تھی۔ اسلحہ جمع کرنے کا دوسرا خفیہ مقام بحیرہ مردار کے کنارے وہ جگہ تھی جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام صحیفے چھپا کر رکھے گئے تھے۔

اب بن گوریان نے "بارخا" مہم کا آغاز کیا۔ ہیبرو زبان میں جس کے معنی ہیں ایسی مہم جس کی پہلے سے کوئی مثال نہ ہو۔ اس مہم کے ذریعے یورپ سے بچے کچھے یہودیوں کو سرزمین فلسطین پر لانے کا آغاز کیا گیا۔ پہلے یہ مہاجرین سینکڑوں یا ہزاروں کی تعداد میں آیا کرتے تھے اب لاکھوں کی تعداد میں آنا شروع ہو گئے ان میں کئی لوگ اب تک جبری مشقت کے کیمپوں کے لباس میں ملبوس ہوتے تھے ان کے جسم پر ان کے یہودی ہونے کا علامتی نشان اور کھدا ہوتا تھا جس سے نازی ان کی شناخت کیا کرتے تھے۔

بن گوریان اب جارحانہ اور دلیرانہ اقدامات کرنا چاہتا تھا اس نے ترحم اور مصالحتی پالیسی کو خیرباد کہتے ہوئے یہودیوں کی زیرزمین کام کرنے والی خفیہ تنظیموں کو متحد کیا اور پرانے یہودی آبادکاروں کی مدد سے 1946ء میں دونوں قابض برطانیہ اور قدیم باشندے عربوں کے خلاف گوریلا اور چھاپہ مار جنگ کا آغاز کر دیا۔

ہر گروپ کے یہودی کمانڈر کو یہ اندازہ تھا کہ بیک وقت دو محاذوں پر جنگ سے ان کے وسائل سکڑ جائیں گے جس کا نتیجہ انتہائی خوفناک تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ بن گوریان نے حکم دیا کہ اس پالیسی اور حکمت عملی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، چنانچہ جلد ہی ہر طرف دہشت گردی اور ظلم و زیادتی کا بازار گرم ہو گیا۔ برطانوی سپاہی یہودیوں کو "ہاگانا" کے شبے میں بے دریغ قتل

کرنے لگے اور جواب میں یہودی گوریلے برطانوی سپاہیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناتے اور ان کی بیرکوں پر بموں سے حملے کرنے لگ گئے۔ عربوں کے دیہات پر دہشت گردانہ حملے، لوٹ مار اور آتشزنی کی وارداتیں ہونے لگیں۔

جھوٹی اطلاعات، افواہوں کی گرم بازاری اور گمراہ کن پروپیگنڈے کے زور پر "ہاگانا" نے برطانوی اور عرب آبادی میں یہ تاثر پھیلانا شروع کر دیا کہ یہودی گوریلوں اور خفیہ کارروائیاں کرنے والوں کی تعداد اور استعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے جتنا کہ برطانوی اور عرب اندازہ لگا رہے ہیں لیکن جلد ہی یہودیوں کی طاقت بکھرنے اور منتشر ہونے لگی۔

موقع ملنے پر 1946ء کے موسم میں امریکہ نے مداخلت شروع کی اور برطانیہ پر زور دیا کہ "ہالوکاسٹ" کے ایک لاکھ متاثرین کو فلسطین میں داخلے کی اجازت دے دی جائے۔ امریکہ کی یہ درخواست رد کر دی گئی اور لڑائی میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ آخرکار برطانیہ فروری 1947ء میں اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ مئی 1948ء تک سرزمین فلسطین سے نکل جائے گا۔ اس کے بعد یہ اقوام متحدہ کی سردردی ہو گی کہ وہ دیکھے اسرائیلی ریاست کا مستقبل کیا ہو گا؟

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ عربوں کے ساتھ فیصلہ جنگ سے کہیں ایک نئی پیدا ہوتی ہوئی قوم کے بال و پر کٹ جائیں بن گوریان نے خفیہ کارروائیوں کو مزید مؤثر بنانے پر زور دیا اسے اور اس کے کمانڈروں کو احساس تھا کہ ان کی کامیابی کا انحصار بہترین جاسوسی نظام اور انٹیلی جنس پر تھا۔ چنانچہ انہوں نے عربوں کی فوجی طاقت اور مورال بارے اہم معلومات حاصل کر لیں۔ انہوں نے قاہرہ (مصر) اور امان (اردن) میں اپنے یہودی جاسوسوں کی ڈیوٹیاں لگائیں کہ وہ مصر اور اردن کے جنگی پلان چرا کر لائیں۔

چنانچہ جب یہودیوں نے اپنی آزادی کی جنگ شروع کی تو انٹیلی جنس اور جاسوسی کی وجہ سے انہیں بے پناہ کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لڑائی کے دوران ہی بن گوریان کو یہ احساس بھی ہوا کہ فوجی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی حل بھی بروئے عمل آنا چاہیے۔

آخرکار جب 1949ء میں فوجی کامیابی حاصل ہو گئی تو زمانہ امن کے لیے انٹیلی جنس کے شعبے اور جاسوسی کے خفیہ اداروں کے لیے کوئی لائحہ عمل موجود نہ تھا جس کی وجہ سے ان میں آپس کی چپقلش شروع ہو گئی۔

اسرائیل کا پہلا وزیراعظم بننے کے بعد بن گوریان نے اس مسئلہ کا کوئی سنجیدہ حل نکالنے کی بجائے اندرون و بیرون ملک کام کرنے کے لیے انٹیلی جنس کے پانچ شعبے بنا دیے بیرون ملک کام کرنے والے انٹیلی جنس کے شعبے نے اپنے آپ کو برطانیہ اور فرانس کے سیکورٹی کے اداروں کے نمونے پر منظم کرنا شروع کر دیا۔ ان ملکوں کی سیکورٹی ایجنسیوں نے بھی اسرائیل کے ساتھ مل کر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اٹلی میں موجودہ امریکہ کی آفس آف دی سٹریٹجک سروسز (O.S.S) کے چیف جیمز جیسس اینگلٹن کے ذریعے واشنگٹن سے رابطہ پیدا کیا گیا۔ اس کی اسرائیل سے تعلق داری دونوں ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی تھی۔

اتنے شاندار آغاز کے باوجود بن گوریان کا ایک انتہائی مؤثر اور فعال انٹیلی جنس کا خواب اس کی قوم کی پیدائش کے ابتدائی مراحل میں ہی چکنا چور ہو گیا جب اس کے وزیروں اور افسروں نے اختیارات کی چھینا جھپٹی شروع کر دی۔ ان کے درمیان اکثر دھینگا مشتی ہوتی رہتی تھی۔ انٹیلی جنس جیسی پالیسی کون بنائے گا؟ کون جاسوسوں کی ابتدائی رپورٹوں کو دیکھے گا؟

جاسوسوں اور مخبروں کو کون بھرتی کرے گا؟ ان کی رپورٹیں سب سے پہلے کس کے سامنے پیش ہونی چاہئیں؟ ان رپورٹوں کو سیاسی رہنماؤں کے سامنے پیش کرنے کے لیے سمری کو تیار کرے گا؟

وزارت خارجہ اور وزارت دفاع میں اس بات پر تنازعہ چل رہا تھا کہ دوسرے ملکوں میں جاسوسی اور خفیہ کارروائیوں کا اختیار اُن کا ہے۔

جب یہ سیاسی لوگ اپنے اختیارات، مفادات اور قوت فیصلہ کے بارے میں آپس میں دست و گریبان تھے، عرب گوریلے ان کی بچھائی ہوئی بارودی سرنگوں اور نصب کردہ بموں کے ذریعے یہودی بے دریغ مارے جا رہے تھے، شام، مصر، اردن اور لبنان کی مسلح افواج بھی اسرائیل کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھیں لاکھوں عرب مجاہدین اسرائیل کے خلاف جہاد میں شامل ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ دنیا کی کوئی قوم اس طرح کے خطرات، حالات اور ماحول میں معرض وجود میں نہیں آئی جس طرح کے ناساعد حالات اور خطرات اسرائیل کی پیدائش کے وقت موجود تھے۔

اسرائیل کے لوگ بن گوریان کو اپنا نجات دہندہ اور محافظ سمجھ کر پُر امید نظروں سے اس سے امید لگائے ہوئے تھے کہ وہی ان کی حفاظت بقاء اور تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہے۔ جیسا کہ ماضی میں اسرائیل کے بعض عظیم رہنما یہ فرض ادا کرتے رہے ہیں لیکن بن گوریان کو احساس تھا کہ وہ کوئی خدا کا فرستادہ پیغمبر نہیں ہے وہ صرف ایک سخت جان سٹریٹ فائٹر ہے۔ جس نے عربوں کے خلاف اپنی قوم کی آزادی کی جنگ جیتی ہے اور اپنے سے کئی گنا عربوں کی متحدہ طاقت کو شکست دی ہے۔ یہودیوں کی تاریخ میں ایسی فتح کی مثال حضرت داؤد (علیہ السلام) کے بعد کہیں نہیں ملتی، جنہوں نے لڑکپن میں چرواہے کی حیثیت سے گولیاتھ جولیت کو شکست دے کر اور قتل کر کے اس کے لشکر کو سن فلسطین سے مار بھگایا تھا۔

چار سال کی طویل مدت تک بن گوریان خفیہ ایجنسیوں کے درمیان جاری اختیارات اور طاقت حاصل کرنے کی چپقلش، جھگڑے اور ٹانگ کھینچنے کی قباحت کو اپنی صدارت میں ہونے والے اجلاسوں میں سلجھانے کی کوشش کرتا رہا وزارت خارجہ نے قاہرہ (مصر) میں موجود ایک فرانسیسی سفارتکار کو اپنا جاسوس بھرتی کرنے کا عمدہ پلان بنایا تھا۔ یہ نوجوان، جسے جاسوسی کے کام کا کوئی تجربہ ہی نہ تھا، چند ہفتوں میں ہی مصری خفیہ ایجنسی کے افسروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس سے یورپ میں اسرائیل کے جاسوسی کی خدمات انجام دینے والے کئی ایجنٹ بے نقاب ہو گئے، کیونکہ ان کے پاس اپنے مخبروں کو پیسے دینے کے لیے معقول رقم ہی نہ تھی۔ لبنان میں (عیسائی) دروز ملیشیاء کو اپنے مقاصد کے لیے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش اس وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی کہ اسرائیلی خفیہ اداروں کی آپس کی چپقلش کی وجہ سے یہی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ملیشیا کو کس طرح استعمال کیا جائے اسرائیلی انٹیلی جنس حکام اکثر بڑے بڑے پُر کشش منصوبے ترتیب دیتے تھے اور پھر ان پر عمل درآمد کے وقت ایک دوسرے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔ لیکن سبھی اپنی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل کے جتنوں میں مبتلا تھے۔

اس وقت کے سب طاقتور لوگ، اسرائیلی وزیر خارجہ، آرمی چیف آف سٹاف اور سفارتکار آپس میں اس بات پر ٹھسن کی ہو رہے تھے حکومتِ وقت میں سب سے زیادہ تعداد ان کے پسندیدہ آدمیوں کی ہونی چاہیے اگر ایک کی خواہش ہوتی تھی کہ حکومت کی اولین ترجیح اقتصادی اور سیاسی اطلاعات پر ہونی چاہیے تو دوسرا دور

دیتا تھا کہ جاسوس ادارے انٹیلی جنس کو صرف دشمن کی ملٹری طاقت کے بارے میں ہی جاسوسی کرنی چاہیے۔ فرانس میں اسرائیل کا سفیر اس بات پر زور دے رہا تھا کہ جاسوسی کا محکمہ اُن خطوط پر استوار ہونا چاہیے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانس کی تحریک مزاحمت نے اختیار کیے تھے لہٰذا اسرائیل کے ہر یہودی کو متحرک ہونا چاہیے۔

جمعہ کے روز، 2 مارچ 1951ء کو بن گوریان نے اپنی پانچ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہوں کو اپنے دفتر میں طلب کیا اس نے انہیں بتایا کہ وہ بیرون ملک کام کرنے والی خفیہ ایجنسیوں کو ایک ہی ایجنسی میں مدغم کرنا چاہتا ہے جس کا نام ہوگا۔ "ہاموساد لے تیوم" باہمی رابطے کا ادارہ۔ اس کا ابتدائی بجٹ 20 ہزار اسرائیلی پونڈ ہوگا۔ اس بجٹ سے 5 ہزار پونڈ "خصوصی مہمات" پر خرچ کیے جائیں گے۔ لیکن یہ خرچہ میری پیشگی اجازت اور منظوری سے ہوگا۔" نئی ایجنسی اپنا سٹاف موجودہ ایجنسیوں سے ہی بھرتی کرے گی۔ روزمرہ کی زبان میں نئی جاسوس ایجنسی کو صرف "موساد" کہا جائے گا۔

"موساد" اپنے تمام انتظامی اور سیاسی امور کے لیے وزارت خارجہ کو جوابدہ ہوگی۔ تاہم "موساد" کے اندر جاسوسی کے دیگر شعبوں کے سینئر ارکان بھی شامل ہوں گے۔ اندرون ملک سیکورٹی کا شعبہ شن بیت کہلائے گا۔ ملٹری میں جاسوسی کے شعبہ کو امان کہا جائے گا۔ اسی میں نیوی اور ایئر فورس بھی شامل ہوگی۔ ان دوسرے شعبوں کے افسروں کا کام "مساد" کو اپنے مؤکلین کی ضروریات سے آگاہ رکھنا تھا، تاہم اختلاف رائے کی صورت میں معاملات وزیر اعظم کے دفتر کو بھیجے جائیں گے۔

بن گوریان نے "موساد" میں شامل دوسری ایجنسیوں کے سینئر افسروں کو خطاب کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

"تم اپنی ضروریات کے سامنے کی فہرست "موساد" کو دو گے، پھر تمہارا یہ کام نہیں ہوگا کہ تم یہ جاننے کی کوشش کرو کہ "موساد" نے تمہاری ضروریات کا سامان کہاں سے خریدا اور کیا قیمت ادا کی ہے؟"

نئی جاسوس ایجنسی براہِ راست بن گوریان کی نگرانی میں کام کر رہی تھی۔ اس ایجنسی کے اولین سربراہ ریوین شیلوح کو وزیر اعظم نے اپنے پہلے ہی حکم نامے میں کہا۔

"موساد" براہِ راست میرے ماتحت کام کرے گی۔ میری ہدایات کے مطابق "آپریشن" کرے گی اور ہر وقت مجھے آگاہ رکھے گی۔ چنانچہ اس ایجنسی کے لیے قواعد و ضوابط طے کر لیے گئے۔

ستمبر 1929ء میں یروشلم میں بیٹھ کر جن یہودی رہنماؤں نے عربوں کے مزید حملوں سے بچنے کے لیے ان کی جاسوسی کرنے کا لائحہ عمل سوچا تھا 28 سال بعد دنیا کی ایک خوفناک ترین جاسوس ایجنسی "موساد" کی صورت میں سامنے آگیا۔

مئی 1951ء میں "موساد" کے قیام کی دستاویز پر بن گوریان کے دستخط کرنے کے صرف 9 ہفتے بعد، عراقی خفیہ ایجنسیوں نے بغداد میں "موساد" کی سازش پکڑ لی۔ دو اسرائیلی ایجنٹ گرفتار کر لیے گئے اور ان کے ساتھ درجنوں عراقی یہودی اور رشوت لے کر ان سے تعاون کرنے والے عرب بھی پکڑ لیے گئے۔ اس طرح عراق اور مشرقِ وسطیٰ کے دیگر حصوں سے خفیہ طور پر یہودیوں کے انخلاء کی سازش بے نقاب ہو گئی۔ 28 افراد پر غداری کا مقدمہ چلا کر سزائیں دی گئیں دونوں اسرائیلی ایجنٹوں کو سزائے موت۔ 17 افراد کو عمر قید اور باقی افراد کو عراقی عدالتِ انصاف نے بے گناہ قرار دے کر رہا کر دیا۔

دونوں اسرائیلی ایجنٹوں کو بعد ازاں اس خطیر رقم کے بدلے میں جو عراقی وزیر داخلہ کے سوس اکاؤنٹ میں جمع کرائی گئی اس قید خانے سے رہا کر دیا گیا جہاں انہیں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا تھا۔

اس کے فوراً بعد ہی "موساد" پر ایک اور مصیبت نازل ہو گئی فوج کے سیاسی شعبے کا ایک پرانا جاسوس تھیوڈور گروس عرصہ دراز سے روم میں کام کر رہا تھا۔ جو اب "موساد" کی ماتحتی میں آ گیا تھا۔ جنوری 1952ء میں اسرائیل کی اندرونی ملک سیکورٹی کے شعبے "شن بت" کے سربراہ ایسر ہیرل کو مخبری ہوئی کہ گروس ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ مصری خفیہ ایجنسی کے لیے جاسوسی کر رہا تھا۔ ہیرل نے خود روم پہنچ کر گروس کو اپنے ساتھ تل ابیب لانے کے لیے یہ بہانہ بنایا کہ اسے ترقی دے کر "شن بیت" میں ایک اونچی سینئر پوسٹ پر فائز کیا جا رہا ہے گروس پر خفیہ ملٹری عدالت میں مقدمہ چلا کر اور سزا دے کر جیل میں ڈال دیا گیا اسے 15 سال کی سزا دی گئی اور وہ جیل میں ہی پرلوک سدھارا۔

مایوس اور دل شکستہ ریون شلوح نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا جس کے بعد ہیرل کو "موساد" کا نیا سربراہ بنایا گیا جس نے طویل ترین عرصے۔ 11 سال تک اپنے عہدہ پر کام کیا اس کے بعد "موساد" کے کسی سربراہ کو اتنا طویل عرصہ جاسوس ادارے کی قیادت کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

ستمبر 1952ء کی صبح کو "موساد" کے جن سینئر افسران نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں ہیرل کا خیر مقدم کیا تھا وہ اس کی شخصیت کی ظاہری شکل و صورت سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے تھے اس کا قد بمشکل چار فٹ آٹھ انچ، لمبے کان اور بمشکل عبرانی زبان، مرکزی یورپی لہجے میں بول سکتا تھا۔ اس کا خاندان 1930ء میں لٹویا سے ہجرت کر کے اسرائیل آیا تھا اس کے پہنے ہوئے کپڑے ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ انہیں کپڑوں میں سو کر آیا ہو۔

اس نے جمع ہونے والے افسران سے جو پہلے الفاظ کہے، وہ تھے۔

"ماضی کو بھول جاؤ، آئندہ کسی غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم سب اکٹھے آگے بڑھیں گے۔ ہم کسی سے بات نہیں کریں گے، ماسوائے اپنے آپ کے۔"

ہیرل کے ان الفاظ کا مطلب تھا؟ اس نے اسی روز مثال قائم کر دی دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے ڈرائیور کو طلب کیا۔ ڈرائیور پوچھ بیٹھا کہ کہاں چلنا ہے؟ اس نے ڈرائیور کو وہیں کھڑے یہ کہتے ہوئے ڈس مس کر دیا کہ یہ ایک خفیہ مشن تھا پھر وہ خود گاڑی ڈرائیو کر کے روانہ ہو گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں اپنے سٹاف کے لیے پیسٹریوں کا لفافہ تھا۔ اس نے سٹاف پر اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا کہ وہ سٹاف سے سوال کر سکتا ہے سٹاف اس سے نہیں۔

اسرائیل اور اس کی نوزائیدہ خفیہ تنظیم "موساد" کے لیے یہ انتہائی نازک وقت تھا لیکن ہیرل نے اپنے طرز عمل اور کارکردگی سے اپنے عملے میں انتہائی ہر دلعزیزی حاصل کر لی اور ان کے حوصلے بلند کر دیے حالانکہ قبل ازیں وہ انتہائی مایوسی اور بددلی کا شکار تھے۔ ہیرل نے ذاتی طور پر اپنے دشمن عرب ملکوں کا خفیہ طور پر سفر کیا اور وہاں "موساد" کے جاسوسی کے نیٹ ورک کو منظم کیا۔ جو بھی امیدوار "موساد" کی تنظیم میں شامل ہونے کی خواہش کرتا تھا ہیرل ذاتی طور پر اس کا انٹرویو کرتا تھا اس کو ایسے لوگ پسند تھے جن کا ماضی، اس کے اپنے ماضی کی طرح، سختیاں برداشت کرتے، مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے گزرا ہو۔ اس نے اپنے ایک سینئر مددگار کو اپنی پالیسی واضح کرتے ہوئے بتایا تھا۔ "میں ایسے لوگوں کو "موساد"

میں بھرتی کرتا ہوں جو ہمارے دشمن کو جانتے ہیں۔ جو عربوں کے ساتھ رہتے ہوئے انہیں کی طرح سوچتے ہیں لیکن تیزی سے سوچتے ہیں۔"

ہیرل کا صبر و سکون بھی اتنا ہی مثالی تھا جتنا کہ اس کا غصہ اور غیض و غضب اپنے سٹاف سے اس کا حسن سلوک اور پیار بے مثل تھا۔ جو لوگ اس کے اندرونی اور قریبی حلقے سے باہر تھے انہیں بے اصولے اور موقع پرست کے طور پر شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ضدی، ہٹ دھرم، خود پسند، جو اپنے آپ کو فلسفی اور کٹر مذہبی رہنما سمجھتے تھے ہیرل ان سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا، اور کٹر مذہبی (آرتھوڈوکس) یہودیوں کو وہ واضح طور پر ناپسند کرتا تھا۔

بن گوریان (وزیراعظم) کی حکومت میں کئی کٹر مذہبی جنونی شامل تھے جنہوں نے جلد ہی ایسر ہیرل کی مزاحمت اور مخالفت کا آغاز کر دیا اور اس کی برخاستگی کی کوششیں شروع کر دیں لیکن "موساد" کے چیف نے اپنے ہم خیال وزیراعظم سے قریبی ربط و ضبط قائم رکھا۔

اب "موساد" کا اس دور کا ریکارڈ ہیرل کی عمدہ کارکردگی کا نمایاں ثبوت ہے۔ مصر کے خلاف صحرائے سینائی کی جھڑپوں میں اسرائیلیوں کی کامیابیوں میں ہیرل کے جاسوسوں کا نمایاں ہاتھ اور کردار تھا اس نے ہر عرب ملک کے دارالحکومت میں اپنے جاسوسوں اور مخبروں کا جال پھیلا رکھا تھا جہاں سے انتہائی معلومات، اطلاعات حاصل ہوتی تھیں اس کے خلاف ایک سازش اس وقت شروع ہوئی جب 1954ء میں اس نے امریکن خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے نئے سربراہ ایلن ڈلس سے ملاقات کے لیے واشنگٹن کا سفر اختیار کیا ہیرل نے جاسوس ایجنسی کے پرانے اور کہنہ مشق سربراہ کو تحفہ جو خنجر پیش کیا اس پر زبور کی یہ آیت کندہ تھی۔

"اسرائیل کا محافظ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ آتی

ہے۔" اس ہیرل نے جواب دیا۔
"تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ جاں نثار رہوں گا۔"

اس سے دونوں خفیہ ایجنسیوں "موساد" اور سی آئی اے کے درمیان مضبوط رشتہ قائم ہو گیا۔ ڈلس نے "موساد" کے لیے جدید ترین ہتھیاروں اور اوزاروں کا انتظام کیا جس میں خفیہ گفتگو سننے کے آلات کھوج لگانے کی ڈیوائس، ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے کیمرے اور کچھ ایسی خفیہ کٹیں جن کے بارے میں ہیرل نے اعتراف کیا کہ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسی ایسی حیرت انگیز چیزیں بھی جاسوسی کی دنیا میں موجود ہیں۔

1961ء میں ہیرل نے مراکش کے ہزاروں یہودیوں کو اسرائیل پہنچانے کے آپریشن کی نگرانی کی ایک سال بعد اتحک "موساد" چیف حکومت وقت کے خلاف اسرائیل کے حامی یہودیوں کی مدد کے لیے سوڈان پہنچا ہوا تھا اسی سال اس نے ایتھوپیا کے بادشاہ ہیل سلاسی کے خلاف بغاوت کو کچلنے میں مدد کی کیونکہ بادشاہ ایک عرصے سے اسرائیل کا حلیف تھا۔

لیکن اسرائیل کے اندر، کابینہ میں شامل مذہبی انتہا پسند یہودی اس کی پالیسیوں اور خودسری کے خلاف گلا پھاڑ پھاڑ کر شکایات کے انبار لگا رہے تھے کہ ایسر ہیرل بڑی حد تک آمر مطلق بن کر ان کے مذہبی جذبات کے برعکس طرز عمل اختیار کیے ہوئے ہے وہ اپنے ایک ذاتی ایجنڈے پر عمل پیرا ہے تاکہ ملک کے سیاسی میدان میں اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ سکے۔ وزیر اعظم بن گوریان کی سیاسی پالیسی ان اندرونی لڑائی جھگڑوں اور آپس کی چپقلش سے بالاتر تھیں لیکن ہیرل کی خودسری کی وجہ سے دونوں کے تعلقات میں بھی سرد مہری در آئی تھی پہلے جہاں وزیر اعظم نے ہیرل کو مکمل خود مختاری اور آزادی دے رکھی تھی، اب معمولی سے معمولی "آپریشن" کی مکمل تفصیلات پوچھنی شروع کر دی تھیں ہیرل نے اس نئی صورت حال کی مزاحمت کی کوشش کی لیکن زبان سے کوئی حرف شکایت ادا نہ کیا۔ لہٰذا اس کے خلاف "کانا پھوسی" کی مہم میں شدت آ گئی۔

بچے کا اغوا

فروری 1962ء میں ایک کٹر مذہبی جنونی فرقے کے ہاتھوں آٹھ سالہ بچے جوئیل شوبیکر کے اغوا نے ملک میں ہنگامہ خیز صورت حال پیدا کر دی لڑکے کا نانا نہمان شتارکس ایک مذہبی انتہا پسند فرقے منتوری کارتا کا ممبر تھا۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو "محافظ دیوار گریہ" کہلاتا تھا۔ شک تھا کہ بچے کے اغواء میں ملوث ہے۔ پولیس پہلے ہی بچے کی تلاش کے لیے وسیع پیمانے پر مصروف عمل تھی لیکن لڑکے کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا پولیس کی انکوائری میں تعاون نہ کرنے کی وجہ سے نہمان کو مختصر عرصے کے لیے زیر حراست بھی رکھا گیا تھا۔ مذہبی انتہا پسند یہودیوں نے بوڑھے نہمان کو "شہید" قرار دے کر ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے بینر اٹھا کر بن گوریان کے خلاف مظاہرے کیے اور کہا کہ وہ نازیوں سے کچھ مختلف نہیں ہے جس نے ایک ضعیف العمر یہودی کو قید کر رکھا ہے چنانچہ نہمان کو خرابی صحت کی بنیاد پر رہا کر دیا گیا۔ اس کے باوجود مظاہرے جاری رہے۔

وزیر اعظم کے سیاسی مشیروں نے خطرہ ظاہر کیا کہ موجودہ صورت حال میں بن گوریان اگلا الیکشن ہار جائے گا علاوہ ازیں اگر عربوں کے ساتھ اگلی جنگ ہوئی تو مذہبی انتہا پسند یہودی ان کا ساتھ دے سکتے ہیں پریشان وزیر اعظم نے اس وقت "موساد" کے سربراہ ہیرل کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ "موساد" لڑکے کو تلاش کرے ہیرل نے وزیر اعظم کو دلیل دی کہ یہ جاسوس ایجنسی کا کام نہیں ہے (کیونکہ "موساد" کا کام اندرون

ملک نہیں بیرون ملک آپریشن کرتا ہے)۔ ہیرل نے بعد ازاں کہا۔

"ہمارے تعلقات برف کی طرح سرد ہو چکے ہیں۔ وہ بار بار مجھے کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں پولیس کی فائل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ وزیراعظم نے کہا کہ" میں تمہیں ایک گھنٹے کا وقت دیتا ہوں۔"

فائل کافی ضخیم تھی لیکن ہیرل کے اندر ایک کوندا سا لپکا کہ والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش مذہبی جنونیوں کے دباؤ کے بغیر آزادانہ ماحول میں کریں۔

بچہ جوسل اپنے والدین آرتھر اور عیدا شوہمکر کے گھر مارچ 1953ء کو پیدا ہوا تھا خاندان کی مالی مشکلات کی وجہ سے جوسل کو پرورش کے لیے اس کے نانا کے پاس یروشلم بھیج دیا گیا تھا۔ بچے نے اپنے آپ کو کٹر مذہبی حصار میں پایا، روحانی طور پر پورے شہر سے الگ تھلگ اور تنہا۔ نہمان نے اپنے فرقے کے انتہا پسندانہ نظریات بچے کے دل و دماغ میں سرایت کرنے شروع کر دیے۔

جب جوسل کے والدین اس سے ملنے آئے، نہمان نہایت شد و مد سے ان کے مذہبی طور طریقے اور رویوں پر تنقید کی۔

نہمان کی تلخ و ترش باتوں سے تنگ آ کر جوسل کے والدین نے کہا کہ وہ اپنے بچے کو واپس لے جانا چاہتے ہیں اس پر نہمان نے اعتراضات شروع کر دیے کہ بچے کی جوانی میں کام آنے والی مذہبی تعلیم اور عبادات کے لیے سکھائے گئے طریقے ضائع ہو جائیں گے۔ اس پر ان کے درمیان مزید تلخ کلامی پیدا ہو گئی اور والدین خالی ہاتھ واپس چلے گئے اگلی مرتبہ وہ بچے سے ملنے یروشلم آئے تو بچہ غائب ہو چکا تھا۔

اس واقعہ نے مذہبی اور سیکولر یہودیوں کو بن گوریان حکومت کے خلاف احتجاج کا بہانہ مہیا کر دیا اور قوم حکومت کی حمایت اور مخالفت میں تقسیم ہونے لگی پارلیمنٹ میں بن گوریان کی لیبر پارٹی بعض دیگر مذہبی گروپوں کے ساتھ سودا بازی کر کے اپنی اکثریت قائم رکھنے میں کامیاب رہی لیکن ان گروپوں نے حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مذہبی انتہا پسندوں کے حق میں کئی فوائد حاصل کر لیے اور قوانین منظور کرا لیے اور ان کے مطالبات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آزاد خیال یہودیوں کا مطالبہ تھا کہ جوسل کو ہر صورت میں اس کے والدین کے حوالے کیا جائے۔

قائل کے مطالعہ کے بعد ہیرل نے بن گوریان کو بتایا کہ وہ "موساد" کے ذرائع اور وسائل اس کام کے لیے استعمال کرنے پر آمادہ ہے۔ اس نے بچے جوسل کا سراغ لگانے کے لیے چالیس تجربہ کار ایجنٹوں کی ایک ٹیم قائم کر دی۔ ان ایجنٹوں میں سے کئی ایک نے اس بات پر احتجاج بھی کیا کہ ان کے علم اور تجربے کو غلط کام کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

اس نے ایک مختصر تقریر کے ذریعے ان کے احتجاج کو خاموش کر دیا۔

"اگرچہ ہم اپنے معمول کے کام کے خلاف جا رہے ہیں لیکن یہ ایک نہایت اہم کیس ہے۔ یہ اپنے سوشل اور مذہبی پس منظر کی وجہ سے اہم ہے یہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ حکومت کی اتھارٹی داؤ پر لگی ہے پھر انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے بھی یہ کیس اہمیت رکھتا ہے۔"

ٹیم کو اپنے انکوائری کے آغاز کے پہلے ہفتے میں ہی اندازہ ہو گیا کہ اس تحقیقات کے نتائج کس قدر بھیانک اور خوفناک ہوں گے۔

انکوائری جاری رہی اور اس دوران کئی عجیب و غریب حالات و واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے "موساد" کے دس ایجنٹوں نے لندن کے نواحی ہنڈن کے ایک معبد میں ہفتے کی صبح کی عبادت میں شرکت کی۔ مشتعل اجتماع نے ان کی گرفتاری کے لیے پولیس طلب کر لی کیونکہ ان مذہبی بہروپیوں کی جعلی داڑھیاں نوچ لی گئی تھیں گرفتار ایجنٹوں کو اس وقت خاموشی کے ساتھ رہا کر دیا گیا جب اسرائیلی سفیر نے وزارت داخلہ سے رابطہ قائم کیا اور مداخلت کی ایک پرانے تجربہ کار کٹر مذہبی ربی کو اس بہانے سے پیرس آنے کی دعوت دی گئی کہ ایک امیر اور مالدار خاندان اس سے مذہبی دعائیں کرانا چاہتا ہے ہوائی اڈے پر اس کا استقبال دو ایسے اشخاص نے کیا جو یہودی مذہبی رہنماؤں والا لباس، لمبے سیاہ کوٹ اور ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔ دراصل یہ افراد "موساد" کے ایجنٹ تھے ان کی رپورٹ ایک دلچسپ مزاحیہ کہانی کا منظر پیش کرتی ہے۔

"ربی صاحب کو بڑی عزت و تکریم کے ساتھ پیرس کے مضافاتی علاقے کے بنگلے میں لے جایا گیا۔ معصوم ربی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہے دو کنجریوں نے جنہیں ہم نے پہلے سے پیسے دے کر اس کام کے لیے تیار کر رکھا تھا، اچانک ربی صاحب پر چڑھ دوڑیں۔ ہم نے پولورائڈ کیمرے سے تصاویر اتار کر اسے دکھائیں اور اسے بتایا کہ ہم یہ تصاویر تمہارے عبادت خانے کو بھجوا دیں گے اگر وہ ہمیں یہ نہیں بتائے گا کہ اغواء شدہ لڑکا کہاں ہے؟ آخرکار ربی نے ہمیں یقین دلایا کہ اسے لڑکے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے، چنانچہ ہم نے تصاویر اس کے سامنے ہی ضائع کر دیں۔"

ہیرل کی طرف تحقیقاتی سرگرمیوں کے بڑھنے کے نتیجے میں ایک بنیاد پرست یہودی ربی شائی فریڈر "موساد" کے ہاتھوں ظلم کا نشانہ بنا۔ اس ربی کو پیرس اور جنیوا کے سفر کے دوران اٹھا لیا گیا تھا۔ انتہائی سخت

تفتیش کے بعد جب "موساد" کے ایجنٹوں کو اس کے بھی بے گناہ ہونے کا یقین ہو گیا تو ہیرل نے حکم دیا کہ ربی شائی کو سوئٹزرلینڈ میں "موساد" کے ایک محفوظ ٹھکانے پر اس وقت تک محبوس رکھا جائے جب تک تمام انکوائری منطقی انجام تک نہ پہنچ جائے خوف یہ تھا کہ ربی شائی رہا ہونے کے بعد اپنے بنیاد پرست مذہبی رہنماؤں کو "موساد" کی ان سرگرمیوں سے آگاہ کر دے۔

ایک اور شخصیت پر نمایاں شک و شبہ کا اظہار کیا گیا، یہ خاتون میڈلین فرائے تھی جس کا تعلق فرانس کے ایک کھاتے پیتے اور امیر خاندان سے تھا اور جس نے بہت سے یہودی بچوں کو نازیوں کے ہاتھ لگنے اور ڈیتھ کیمپوں سے بچایا تھا، یہ جنگ عظیم دوم کے دوران فرانس کی تحریک مزاحمت کی ہیروئن تھی اور جنگ کے بعد اس نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

اس کے خلاف تحقیقات سے پتہ چلا کہ وہ مذہبی فرقے "نیتوچری کارتا" کی ممبر تھی اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے اکثر اسرائیل آتی جاتی رہتی تھی اور اس نے کئی مرتبہ اغوا شدہ بچے جوسل کے نانا سے بھی ملاقاتیں کی تھیں اس کا اسرائیل کا آخری دورہ تقریباً انہیں دنوں ہوا تھا جبکہ بچے کو غائب کیا گیا تھا اس کے بعد وہ اسرائیل نہیں گئی تھی۔

اگست 1962ء میں "موساد" کے جاسوسوں نے پیرس کے نواح میں اس کی موجودگی کا سراغ لگا لیا جب "موساد" کے ایجنٹ اس سے ملے اور اپنا تعارف کرایا میڈلین نے عملاً ان پر حملہ کر دیا ایک ایجنٹ نے اسرہیرل کو پیرس بلا لیا۔

اس نے میڈلین کو وضاحت کی کہ جوسل کے والدین کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی گئی ہے اخلاقی طور پر والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے بچے کی جس طرح چاہیں تعلیم و تربیت کریں۔ کسی بھی والدین کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ میڈلین بھی معترض تھی کہ وہ جوسل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ہیرل نے محسوس کیا کہ اس کے اپنے آدمی بھی میڈلین کی بات پر یقین کر رہے ہیں۔

ہیرل نے میڈلین کو کہا کہ وہ اپنا پاسپورٹ پیش کرے اس کی تصویر کے نیچے اس کی بیٹی کی تصویر چسپاں تھی اس نے اپنے ایک ایجنٹ سے کہا کہ وہ جوسل کی تصویر لے کر آئے دونوں تصویروں میں چہرے کے خدوخال تقریباً ایک جیسے تھے ہیرل نے اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب کی بات کی۔

"مجھے ہر وہ چیز مل گئی ہے جسے میں جاننا چاہتا تھا اس کی عشقیہ زندگی سے لے کر اس کے تعلیمی دور، اپنا کیتھولک مذہب چھوڑ کر یہودی بنیاد پرستوں کے گروپ میں شامل ہونے تک کی تمام تفصیل۔ میں میڈلین کے پاس دوبارہ گیا اور اسے بتایا کہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں اس نے جوسل کا حلیہ بدلنے کے لیے اس کے بال رنگ کیے تھے (تاکہ وہ لڑکی نظر آئے) اور اسے اسرائیل سے باہر سمگل کیا جا سکے۔ وہ صاف ہی مکر گئی میں نے اسے سمجھایا کہ جس ملک (اسرائیل) سے وہ محبت کرتی ہے اس کا مستقبل خطرے میں ہے۔ جن لوگوں سے وہ پیار کرتی ہے وہ یروشلم کی گلیوں میں ایک دوسرے پر سنگ زنی کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود وہ کسی بات کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی رہی۔ میں نے کہا۔ لڑکے کی ایک ماں ہے جو اس سے اسی طرح پیار کرتی ہے جس طرح تم نے یہودی بچوں سے پیار کرتے ہوئے دوسری جنگ عظیم میں ان کی زندگیاں محفوظ بنائی تھیں۔

اس جنگ عظیم کی یاددہانی نے اس پر کچھ اثر دکھایا اور وہ وضاحت سے بتانے لگی کہ کس طرح اس نے اسرائیل کی سیر کے لیے ایک سیاح کی حیثیت سے سمندری

راستے سے جدہ کی بندرگاہ سے سفر کیا تھا کشتی میں سفر کے دوران ای کی مہاجرین کے ایک خاندان سے دوستی ہو گئی تھی جن کی ایک بچی جوئیل کی ہم عمر تھی اس نے بچی کو اپنے ساتھ جدہ کی بندرگاہ پر کشتی سے اترنے میں مدد کی تھی اور افسر نے بچی کو میڈلین کی اپنی اولاد دیکھتے ہوئے اپنے ریکارڈ میں اندراج کر دیا تھا لہٰذا ایک ہفتہ بعد ہی انہیں امیگریشن پولیس والوں کی ناک کے نیچے سے گزرتے ہوئے اپنی "دختر نیک اختر" کے ساتھ زیورچ پرواز کر گئی تھی روانگی سے قبل میڈلین نے جوئیل کو نہ صرف لڑکیوں والے کپڑے پہننے پر آمادہ کر لیا تھا بلکہ اس کے بال بھی رنگ دیے تھے۔

جوئیل کو کچھ عرصہ سوئٹزرلینڈ کے ایک یہودی مذہبی سکول میں رکھا گیا جہاں ربی شائی فریئر پڑھایا کرتا تھا اس کی حراست میں لیے جانے کے بعد میڈلین جوئیل کو لے کر نیویارک پرواز کر گئی اور وہاں بچے کو ایک ایسے خاندان کی نگرانی میں دے دیا جو یہودی فرقے "نیٹوری کارتا" کا ممبر تھا۔ ہیرل نے اس سے مزید صرف ایک سوال پوچھا۔

"کیا آپ مجھے اس خاندان کا نام اور ایڈریس بتانا پسند کریں گی؟"

کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ آخر میڈلین نے پُرسکون انداز میں بتایا۔

"وہ 126 پین سٹریٹ، بروکلین، نیویارک کے پتے پر رہ رہا ہے اور اب اس کو یناکلے گاٹز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

جب سے ان کے درمیان بات چیت شروع ہوئی تھی ہیرل کے چہرے پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نظر آئی اس نے مسکراتے ہوئے میڈلین سے کہا۔

"میڈلین! تمہارا بہت بہت شکریہ! میں تمہیں مبارکباد دیتے ہوئے "موساد" میں نوکری کی پیش کش کرتا ہوں۔ تم جیسی ذہین عورت اسرائیل کے لیے بہترین خدمات انجام دے سکتی ہے۔" لیکن میڈلین نے انکار کر دیا۔

"موساد" کے ایجنٹ ہوائی جہاز کے ذریعے نیویارک روانہ ہو گئے وہاں ائیر پورٹ پر امریکن خفیہ ایجنسی ایف بی آئی کے نمائندے امریکن اٹارنی جنرل رابرٹ کینیڈی کے حکم پر ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ کیونکہ بن گوریان نے ذاتی طور پر درخواست کر کے رابرٹ کینیڈی کو تعاون کی درخواست کی تھی دونوں خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹ ائیر پورٹ سے 126 پین سٹریٹ پہنچے مسز گارٹنر نے گھر کا دروازہ کھولا۔ یہ ایجنٹ اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے مکان میں گھس گئے۔ اس کا خاوند عبادت میں مصروف تھا۔ اس کے قریب ایک زرد رو بچہ، جس کے سر پر یہودیوں والی مخصوص ٹوپی اور چہرے کے ایک طرف بنیاد پرست مذہبی یہودیوں کی طرح کی سیاہ بالوں کی لٹ لہرا رہی تھی، بیٹھا ہوا تھا۔

"ہیلو جوئیل! ہم آپ کو گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں"

"موساد" کے ایجنٹوں میں سے ایک نے پیار سے بچے سے کہا۔

بچے کی تلاش کا کام شروع کیے ہوئے "موساد" کے آٹھ ماہ لگ گئے تھے۔ اس مشن پر تقریباً دس لاکھ امریکن ڈالر کے برابر رقم خرچ ہو چکی تھی۔

لیکن بچے جوئیل کی ملک میں بحفاظت واپسی سے بھی مذہبی اور سیاسی گروپوں کے درمیان کشیدگی ختم نہ ہو سکی۔ ہرنئی حکومت ان انتہا پسند اور بنیاد پرست مذہبی گروپوں کے رحم و کرم پر ہوتی تھی جو منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں آ گئے تھے۔

اسرائیل واپس لوٹا تو اسے پارلیمنٹ کے ایک اور

طاقتور گروپ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، اس مخالف گروپ کی قیادت ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی "امان" کا نیا سربراہ جنرل میئر امت تھا جس طرح ہیرل نے اس کے پیش رو سے اخماض برتتے ہوئے جوسیل کی تلاش کا مشن اپنے ہاتھ میں لے کر جاسوس ایجنسی کے بے پناہ وسائل، افرادی قوت اور وقت کا ضیاع کیا تھا اب وہ امت کی سخت تنقید اور اعتراضات کی زد میں تھا۔

ملٹری انٹیلی جنس "امان" کا نیا فیلڈ کمانڈر امت اسرائیل کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی سیاسی صورت حال کی وجہ سے وزیراعظم بن گوریان کے معتمد ترین حلیفوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے وزیراعظم کو اس بات پر قائل کر لیا کہ "موساد" کے سربراہ کو اپنے عہدے پر متمکن ہوئے طویل مدت گزر چکی ہے اور اس نے اپنی خودسری اور اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے جاسوس ایجنسی کے بے پناہ وسائل "ضائع" کر دیے ہیں بن گوریان نے اس کے نقطہ نظر سے اتفاق کر لیا۔ آخر کئی ہفتوں کے ناخوشگوار تحقیقات تنقید و اعتراضات کے بعد 25 مارچ 1963ء کو جبکہ وہ پچاس سال کی عمر کو پہنچا تھا ایسر ہیرل نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا جب وہ اپنے دیرینہ ساتھیوں سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے "موساد" کے ہیڈ کوارٹر سے رخصت ہو رہا تھا تو سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سب کو علم تھا کہ "موساد" کے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

چند گھنٹوں بعد ہی ایک دراز قد، عقابی نگاہوں اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا شخص "موساد" ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا۔ یہ "موساد" کا نیا سربراہ میئر امت تھا، اب کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ "موساد" کی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں ہونے جا رہی ہیں۔

اپنے دفتر میں داخل ہونے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد "موساد" کے نئے سربراہ نے اپنے محکمے کے مختلف شعبوں کے انچارجوں کو اپنے دفتر میں بلا بھیجا۔ وہ ایک اجتماع کی صورت میں اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور اس نے سب کو گہری نظروں سے جانچا اور پھر اپنی سخت اور گونجدار آواز میں، جیسے وہ میدان جنگ میں آرڈر دیا کرتا تھا۔ بولا:

"آئندہ گمشدہ بچوں کی تلاش کا کوئی مشن نہیں ہو گا۔ کوئی غیر ضروری سیاسی مداخلت نہیں ہو گی۔ وہ بیرونی تنقید و مداخلت سے ان کی حفاظت کرے گا لیکن اپنے کام میں ناکامی کو برداشت نہیں کرے گا۔ اور ایسی صورت میں ان کے جاب کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔ وہ محکمہ دفاع سے زیادہ سے زیادہ فنڈ لینے کے لیے جدوجہد کرے گا تاکہ جاسوسی کے جدید ترین آلات سے محکمے کو آراستہ کیا جا سکے اور پہلے سے جو کمیاں رہ گئی ہیں انہیں پورا کیا جا سکے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس چیز کو میں سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں یعنی "ہیومنٹ" وہ فن جو خفیہ اطلاعات کے حصول کا فن کہلاتا ہے سے ذرا بھی اغماض برتا جائے۔ یہ "موساد" کا سب سے بڑا فن اور آرٹ ہونا چاہیے۔"

اس کے عملے نے محسوس کیا کہ وہ ایک ایسے افسر کے ساتھ کام کر رہے ہیں جو ان کے "آپریشن" کو روز کے روز جانچتا اور تجزیہ کرتا ہے اور سالوں بعد نکلنے والے نتائج کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ اس نے "موساد" کو ہر قسم کے جدید ترین فوجی ہتھیاروں اور بہترین ٹیکنالوجی اور تکنیکی مہارت سے مسلح کر دیا۔

عراقی جہاز کا اغوا

میئر امت کے "موساد" کی کمانڈ سنبھالنے کے کچھ ہی عرصہ بعد، پیرس کے اسرائیلی سفارتخانے میں "سلمان" نامی ایک نوجوان داخل ہوا، اور اس نے دس لاکھ امریکی ڈالر کے بدلے میں ایک ایسی حیران کن اور

ناقابل یقین پیشکش کی جس نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ پیشکش اس وقت کے انتہائی جدید اور خفیہ طور پر تیار کردہ روسی جنگی جہاز مگ 21 سمگل کر کے اسرائیل کے حوالے کرنے کی تھی (یہ اس وقت کا خوفناک ترین فائٹر جیٹ تھا)۔ سلمان نے حیرت زدہ اسرائیلی سفارتکار سے عام کاروباری لہجے میں کہا۔

"کسی کو بغداد بھیجئے اس نمبر پر فون کر کے جوزف سے رابطہ کیجئے اور ایک ملین ڈالر تیار رکھئے۔"

اسرائیلی سفارتکار نے یہ خبر سفارتخانے میں "موساد" کے ایجنٹ کو پہنچائی جس نے فوراً ہی یہ "خوشخبری" اپنے ہیڈکوارٹر تل ابیب، سلمان کے دیئے ہوئے فون نمبر سمیت بھیج دی۔

کئی روز تک میئر امیت اس سوچ بچار میں لگا رہا کہ ہوسکتا ہے سلمان کوئی فریبی اور دھوکا باز ہو۔ یا ایک جنونی شخص ہو یا "موساد" کے جاسوس ایجنٹ کو پھانسنے کے لیے عراقی حکومت کا ہی کوئی پلاٹ ہو۔ ایسی صورت میں عراق میں خفیہ طور پر کام کرنے والے کئی دوسرے جاسوسوں کے بے نقاب ہونے اور پکڑے جانے کا خدشہ موجود تھا۔ لیکن مگ 21 کو حاصل کرنے کی خواہش بھی ایسی دلکش تھی جسے دبانا ممکن نہ تھا۔

اس فائٹر جیٹ کی ایجن کے استعمال کی استعداد، بلند پروازی، رفتار، اس میں نصب شدہ ہتھیاروں اور گھوم جانے کی صلاحیت اور کم ترین وقت میں اس کی سروس نے اسے عرب دنیا کا سب سے مؤثر ترین فائٹر جیٹ بنا دیا تھا۔ اسرائیلی ایئرفورس کے اعلیٰ افسران تو اس جہاز کو بلیو پرنٹ کی جھلک دیکھنے کے بھی کئی ملین ڈالر بخوشی دینے کو آمادہ بیٹھے تھے چہ جائیکہ جہاز ہی ان کے ہاتھ لگ جائے "موساد" کا سربراہ میئر امت اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے اس رات بستر میں لیٹ گیا۔

"میں اسی کے بارے میں غور کرتے ہوئے سویا۔ جب میں سو کر اٹھا تو تب بھی میرے دماغ میں اسی کی سوچ تھی۔ غسل کرتے وقت بھی میرے حواس پر یہی چھایا ہوا تھا کھانے کے دوران بھی اسی پر میری سوچ کی سوئی اٹکی ہوئی تھی۔ جو بھی فالتو لمحہ مجھے میسر آتا تھا میں اسی کے بارے میں سوچتا تھا کسی بھی انٹیلی جنس ایجنسی کے لیے دشمن کی جدید ترین ایجادات اور صلاحیتوں پر نظر رکھنا پہلی ترجیح ہوتی ہے لیکن انہیں حقیقتاً حاصل کر لینے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا نہ کبھی ماضی میں ایسا ہوا تھا۔"

پہلا مرحلہ کسی ایجنٹ کو بغداد بھیجنے کا تھا میئر امت نے سب سے پہلے ایجنٹ لیے ایک جعلی نام کا انتخاب کیا اس نے بطور انگلش جنٹلمین جارج بیکن کے نام سے اس کا پاسپورٹ بنوایا۔

"کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی یہودی کا بھی ایسا نام ہوسکتا ہے۔"

بغداد میں اپنے قیام کے دوسرے ہفتے کے شروع میں اس نے اس فون نمبر پر رابطہ کیا جو سلمان نے دیا تھا۔ پھر ایک نہایت مہذب اور سلجھی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں جوزف بول رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے فون کیا۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا میں پیرس کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ میں نے سوچا "رابطہ" درست ہے۔

بیکن نے اگلے اس کی دعوت پر دوپہر کے وقت کافی پینے کے لیے بغداد کے ایک کافی ہاؤس میں ملنے کی دعوت قبول کر لی۔ مقررہ وقت اور جگہ پر ایک خوش رو شخص نے مسکراتے ہوئے جوزف کے نام سے متعارف کرایا۔ اس کے چہرے کی رنگت زردی مائل اور بال سفید تھے دونوں کو ملاقات کا ماحول ماورائے حقیقت لگ

رہا تھا اسرائیلی جاسوس نے مزید لکھا ہے:

"جوزف نے کہا کہ وہ بیان نہیں کرسکتا کہ اسے مجھ سے مل کر کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں اس کا دور کا رشتہ دار ہوں۔ پھر اس نے موسم کے بارے میں بات چیت شروع کردی اور کہنے لگا کہ ریسٹورانوں میں خدمات کا معیار کس قدر گر گیا ہے جیسا کہ اس کیفے کا حال ہے میں نے دل میں سوچا کہ خفیہ والے فوراً میری زندگی کا چراغ گل کردیں گے۔ اگر انہوں نے سن لیا کہ میں بابا جی سے کیا باتیں کر رہا ہوں۔ کیونکہ میں ایک دشمن ملک میں ہوں میں نے فیصلہ کیا یہ شخص جو کوئی بھی ہے اس سے جاننا چاہیے کہ اس کا سلمان سے پیرس میں کیا تعلق ہے۔ کیونکہ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص عراق کو انٹیلی جنس کا بندہ نہیں ہوسکتا اب میری تشویش پکڑے جانے کی فکرمندی قدرے کم ہوگئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے دوستوں کو اس "مال" کی خریداری میں گہری دلچسپی ہے۔ جس کا ذکر اس کے دوست نے پیرس میں کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ سلمان میرا بھتیجا ہے جو پیرس میں رہتا ہے وہ پیرس کے ایک کیفے میں بیرا گیری کا کام کرتا ہے یہاں، بغداد سے تمام اچھے بیرے بیرون ملک جاچکے ہیں۔"

پھر جوزف میز پر جھک کر مجھ سے پوچھنے لگا:

"تم "مگ" کے بارے میں بات کرنے آئے ہو؟"

"میں تمہارے لیے اس کا انتظام کرسکتا ہوں لیکن اس کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہوگی، نقد و نقد"۔

عکن نے اندازہ لگایا کہ جوزف جتنا بظاہر جو نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے۔ بوڑھا بظاہر احمق نظر آتا تھا۔ عکن نے جب اس سے چند مزید سوال پوچھنے کے لیے زبان کھولی تو وہ بولا۔

"یہاں نہیں! ہوسکتا ہے کوئی ہماری گفتگو سن رہا ہو۔"

انہوں نے اگلے روز دریائے دجلہ کے کنارے ایک پارک کے بنچ پر ملاقات کا وقت طے کیا۔ یہ دریا شہر کے درمیان سے گزرتا ہے۔

اس رات عکن کو بہت کم نیند آئی وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اسے آہستہ آہستہ کسی جال میں تو نہیں پھانسا جا رہا۔ اگر عراقی انٹیلی جنس کی طرف سے نہیں تو کچھ ایسے ہوشیار چالاک لوگوں کی طرف سے، جو جوزف کو آگے لگائے ہوئے ہیں۔

اگلے دن کی میٹنگ میں جوزف کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل ہوئیں اور اس کے حقیقی مقصد کا کچھ تھوڑا بہت پتہ چلا:

اس کا تعلق عراق کے ایک نہایت غریب یہودی خاندان سے تھا۔ اس کا بچپن بغداد کے ایک امیر عیسائی خاندان کی نوکری کرتے ہوئے گزرا تھا۔ اس نے تیس سال تک اس خاندان کی نہایت ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ خدمت کی تھی کہ اچانک اسے نوکری سے برخاست کردیا گیا اور الزام یہ لگایا گیا کہ وہ خوراک کی چوری کرتا تھا اس نے اپنی پچاسویں سالگرہ کے روز اپنے آپ کو بغداد کی گلیوں میں لاوارث پایا۔ اب وہ اتنا بوڑھا ہوچکا تھا کہ کسی دوسری نوکری کا ملنا ناممکنات میں سے تھا وہ محنت مزدوری سے بہت تھوڑی رقم کما پاتا تھا اس کے دماغ میں اپنے یہودی خاندان کے شہر قرب کا سودا بھی سمایا ہوا تھا اس نے اپنا یہ سوال اپنی بیوہ بہن مانو کے سامنے بھی رکھا۔ جس کا بیٹا منیر عراقی ایئرفورس میں پائلٹ تھا۔ مانو نے اعتراف کیا کہ وہ اسرائیل جانے کی زبردست خواہشمند ہے۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اسرائیل جائیں۔ کیونکہ عراق میں تو اس بات کا تذکرہ بھی انہیں جیل کی سلاخوں کے

پیچھے پہنچا سکتا تھا۔ پھر خاندان کے جو لوگ پیچھے رہ جاتیں گے عراقیوں کے ہاتھوں انہیں شدید تشدد، مار پیٹ اور قید و بند کا سامنا کرنا پڑے گا اور بہت ممکن ہے انہیں قتل ہی کر دیا جائے پھر اسرائیل کو ہجرت کرنے کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ ماں نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان کہا کہ یہ ایک ناممکن العمل خواب ہے۔

لیکن جوزف کے دماغ میں ہجرت کا خیال جم چکا تھا منیر رات کے کھانے کے دوران اکثر بتایا کرتا تھا کہ اس کے کمانڈر کے خیال میں جنگ میں اڑاتا ہوں، اسرائیل اس کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوگا۔

"انکل جوزف! شاید اس لاکھ امریکن ڈالر تک۔"

یہ رقم بھی جوزف کے دماغ میں جم کر رہ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا اس رقم میں سے اعلیٰ حکومتی اہلکاروں کو رشوت دے کر عراق سے نکلنے کا راستہ بن سکتا تھا۔ اس کثیر رقم کی مدد سے وہ اپنے پورے خاندان کو عراق سے نکال لے جائے گا۔

وہ جتنا اس پر سوچ بچار کرتا تھا، اسے یہ کام قدرے آسان نظر آنے لگا تھا منیر اپنی ماں سے بے پناہ پیار کرتا تھا وہ ماں کی خوشنودی کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ملین ڈالر کے لیے طیارے کی چوری بھی کر سکتا تھا اس طرح جوزف کو اپنے خاندان کو عراق سے نکالنے کے لیے منصوبہ بندی کی بھی ضرورت نہیں رہے گی وہ یہ کام اسرائیلیوں سے لے گا، کیونکہ سب کو پتہ تھا کہ اسرائیلی ایسے کاموں کے بہت ماہر ہیں یہی وجہ تھی کہ اس نے سلمان کو پیرس میں اسرائیلی سفارت خانے بھجوایا تھا۔

"اور میرے دوست! تم یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو؟" جوزف نے عکن سے پوچھتا ہوا سوال کیا۔ عکن نے الٹا سوال کر دیا۔ "منیر کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ کیا یہ چیز اس کے علم میں ہے؟"

"ہاں ہاں! اس نے مگ جہاز چوری کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ وہ نصف رقم ابھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور بقایا رقم اس وقت ادا کی جائے گی جب وہ اپنا کام مکمل کرے گا۔"

عکن انتہائی زیرک اور زود فہم تھا۔ اب تک اس نے جوزف سے جو باتیں سنی تھیں۔ ان سے تو یہ منصوبہ انتہائی سہل اور قابل عمل نظر آتا تھا۔ لیکن سب سے پہلے اسے تل ابیب میں "موساد" کے ہیڈ کوارٹر میں جاسوس ایجنسی کے سربراہ میئر امت کے علم میں تمام چیزیں لانی تھیں۔ دارالحکومت میں "موساد" کا سربراہ دوپہر سے شام تک عکن کی رپورٹ کو سن کر اس پر غور کرتا رہا۔

"جوزف رقم کس جگہ وصول کرنا چاہتا ہے؟" اس نے آخر عکن سے پوچھا۔

"سوئٹزر لینڈ کے ایک بنک اکاؤنٹ میں۔ جوزف کے ایک ماموں زاد کو علاج کے لیے رقم کی فوری ضرورت ہے اور یہ علاج بغداد میں ممکن نہیں ہے۔ عراقی حکام علاج کے لیے اسے سوئٹزر لینڈ جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اس کی خواہش ہے کہ جب وہ وہاں پہنچے تو رقم پہلے سے اس کے بنک اکاؤنٹ میں جمع ہو چکی ہو۔"

"تمہارا جوزف بڑا دور اندیش اور دانا آدمی لگتا ہے۔" میئر امت نے تبصرہ کیا۔

"اگر رقم ایک دفعہ اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو گئی، ہم واپس نہیں لے سکیں گے۔" پھر اس نے عکن سے ایک ٹیڑھا سوال کر دیا۔

"تمہیں جوزف پر اس قدر اعتماد اور بھروسہ کیوں ہے؟" عکن نے جواب دیا۔

"میں اس پر اس لیے اعتماد اور بھروسہ کرتا ہوں کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی متبادل نہیں ہے۔"

چنانچہ میئر امیت نے آدھا ملین (پانچ لاکھ) ڈالر جنیوا کے کریڈٹ سویز بنک کی مرکزی برانچ میں جمع کرانے کی اجازت دے دی۔ وہ پیسے کو زیادہ اہمیت دینے کی بجائے جوئے کی بازی لگا رہا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا۔ جیسا کہ "موساد" کے اکثر حکام کا بھی خیال تھا کہ اگر جوزف فراڈ ثابت ہوا تو اس کا عہدہ اور مستقبل دونوں اس فراڈ کی نذر ہو جائیں گے۔

اب وقت آ گیا تھا کہ وزیر اعظم بن گوریان، وزیر اعظم کے چیف آف سٹاف زتہاک رابن کو بھی اعتماد میں لیا جائے۔ دونوں نے "موساد" کے چیف کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ میئر امیت نے ابھی تک دونوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے عراق سے "موساد" کے تمام جاسوسی نیٹ ورک کو وہاں سے نکال لیا ہے۔

"مشن کی ناکامی کی صورت میں میں نہیں چاہتا وہاں کسی کی گردن کاٹی جائے، سوائے میری اپنی گردن کے۔ میں نے پانچ ٹیمیں بنا دی ہیں۔ پہلی ٹیم کا کام تھا کہ بغداد اور میرے درمیان رابطے کا کام کرے۔ وہ ریڈیو (وائرلیس) کا استعمال اسی صورت میں کریں گے جبکہ کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے ورنہ میں ان کی طرف سے کوئی پیغام سننا نہیں چاہوں گا دوسری ٹیم کسی کے علم اور نظر میں آئے بغیر بغداد میں موجود رہے گی۔ اس ٹیم کے بارے میں نہ تو عکن کو اور نہ ہی پہلی ٹیم کو کوئی علم ہوگا۔ اس ٹیم کا کام یہ ہوگا کہ کسی بھی مصیبت اور مشکل میں عکن اور اس کے ساتھ جوزف کو بھی ملک سے نکالنے کی ممکنہ حد تک کوشش کرے۔ تیسری ٹیم کا کام جوزف کے خاندان پر نظر رکھنا ہے۔ چوتھی ٹیم کا کام کردوں سے رابطہ کر کے جوزف کے خاندان کو ان کی مدد اور تعاون سے ملک سے نکال لانا ہے۔ ان دنوں عراق کے خلاف اسرائیل کردوں کو اسلحہ سپلائی کرتا تھا۔ پانچویں ٹیم واشنگٹن اور ترکی کے ساتھ رابطے میں رہے گی کیونکہ مِگ جہاز، عراق سے اڑان بھر کے، ترکی کی فضائی حدود سے گزر کر اسرائیل پہنچے گا۔ واشنگٹن جس نے شمالی ترکی میں اپنے ہوائی اڈے قائم کر رکھے ہیں، ترکی کو یقین دلائے گا کہ مِگ یونائیٹڈ سٹیٹ کی طرف پرواز کرے گا لہٰذا ترکی کو تعاون کرنا چاہیے۔ عراقی ائیر فورس حکام کو شبہ تھا کہ اس کے پائلٹ منحرف ہو کر مغرب کی طرف پرواز کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا وہ جہازوں کے فیول ٹینک ہمیشہ آدھا بھر کے رکھتے تھے تاکہ جہاز لمبی فلائٹ پر نہ جا سکے۔ یہ ایک ایسی مشکل صورت حال تھی کہ جس کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

ابھی کچھ دیگر مشکلات بھی تھیں، جوزف نے فیصلہ کیا کہ وہ نہ صرف اپنا کنبہ بلکہ وہ اپنے نزدیک و دور کے رشتہ داروں کو بھی عراق کی ظالم حکومت کے نرغے سے نکالنا چاہتا ہے اس کا اصرار تھا کہ اس کے 143 افراد خاندان کو ہوائی جہاز سے عراق سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچایا جائے۔

"موساد" کے سربراہ میئر امیت نے جوزف سے اتفاق کر لیا اور ایک نیا دردسر مول لے لیا۔ بغداد سے عکن نے خفیہ پیغام بھیجا کہ منیر اپنا خیال تبدیل کر رہا ہے۔ "موساد" کے سربراہ کو اندازہ ہو گیا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ منیر آخر ہے تو ایک عراقی تھا۔ عراق نے اس کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ اسرائیل کی خاطر اپنے ملک سے غداری کرنا اسے بے چین کر رہا تھا۔ ہم "دشمن" ہیں۔ اسے تمام عمر یہی سبق پڑھایا گیا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اسے قائل کیا جائے بجائے

جہاز، اسرائیل کی بجائے سیدھا امریکہ جائے گا۔
چنانچہ میں نے جہاز پکڑا اور واشنگٹن پہنچا اور ڈائریکٹر آف سی آئی اے سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی مسٹر رچرڈ ہیلمز سے ملاقات کی۔ اس نے میری بات غور سے سنی اور کہا "یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" وہ ہمیشہ میرے ساتھ بہت اچھے طریقے سے پیش آتا تھا۔ اس نے اس چیز کا اہتمام کیا کہ بغداد میں امریکن سفارتخانے میں موجود ملٹری اتاشی منیر کے ساتھ ملاقات کرے۔ ملٹری اتاشی نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اغوا شدہ جہاز امریکیوں کے حوالے کیا جائے گا۔ اس نے روس کے خلاف منیر سے اور بھی بہت سی باتیں کیں اور کہا کہ اس مدد کے لیے امریکہ اس کی بہت قدر و منزلت کرے گا چنانچہ منیر اس کی باتوں سے قائل ہو گیا اور اپنے منصوبے پر عمل کرنے پر راضی ہو گیا۔
باقی سارا عمل اصل منصوبے کے مطابق تکمیل پانے لگا۔ جوزف کے بیمار رشتہ دار کو جنیوا جانے کی اجازت مل گئی۔ جنیوا پہنچ کر اس نے جوزف کو پوسٹ کارڈ لکھا۔ "ہسپتال میں سہولیات انتہائی شاندار ہیں، مجھے مکمل صحت یابی کا یقین دلایا گیا ہے۔" یہ پیغام دراصل اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ بقایا پانچ لاکھ ان کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے گئے ہیں۔
اس یقین دہانی کے بعد جوزف نے عکن کو بتایا کہ اس کا خاندان عراق سے نکلنے کے لیے تیار ہے۔ اس سے ایک رات قبل جب کہ منیر نے جہاز اغوا کر کے عراق سے بھاگنا تھا جوزف اپنے خاندان کے ساتھ موٹروں کے ایک قافلے کے ساتھ شمالی سرد پہاڑی علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ عراق میں کسی بھی چیک پوائنٹ حفاظتی چوکی پر روکا نہیں گیا کیونکہ بغداد کے اکثر باشندے گرمیوں میں ٹھنڈے پہاڑی علاقوں کی طرف سفر کیا کرتے تھے پہاڑوں کے قریب میں کرد باشندے، اسرائیلی رابطہ کاروں کے ہمراہ ان کے انتظار میں تھے۔ وہ انھیں پہاڑوں کے درمیان ایسے علاقے میں لے گئے جہاں ترکی کے ہیلی کاپٹر ان کے منتظر تھے۔ راڈار کی نظروں سے بچنے کے لیے یہ ہیلی کاپٹر انتہائی نیچی پرواز کرتے ہوئے انھیں ترکی حدود میں لے آئے۔
ایک اسرائیلی ایجنٹ نے منیر کو پیغام بھیجا۔
"تمہاری بہن کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے زچہ بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔"
اسی طرح ایک اور خفیہ پیغام بھی منیر تک بحفاظت پہنچ گیا۔
اگلی صبح 15 اگست 1966ء کو طلوع آفتاب کے وقت منیر نے روزمرہ تربیتی اڑان بھری اور ایک دم انتہائی تیز رفتاری سے جہاز اڑاتا ہوا ترکی کا بارڈر پار کر گیا۔ عراقی ایئر فورس حکام کو اتنا موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ دوسرے پائلٹوں کو منیر کے جہاز کو مار گرانے کا حکم دے سکتے۔ ترکی میں داخل ہوتے ہیں امریکہ کے فینٹم طیاروں نے اسے اپنے حصار میں لے کر ترکی کے ایک ہوائی مستقر پر لا اتارا۔ وہاں جہاز میں تیل بھرا گیا اور دوبارہ محو پرواز ہو گیا اس نے اپنے ہیڈ فون میں نہایت واضح پیغام سنا۔
"تمہارا خاندان بالکل محفوظ ہے اور تم سے ملنے کے لیے تمہاری طرف محو سفر ہے۔"
ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد مگ جہاز اسرائیل کی شمالی ایئر فورس بیس پر لینڈ کر گیا۔ اس واقعہ کے بعد "موساد" پوری دنیا میں ایک بہترین، تیز طرار اور خطرناک ترین انٹیلی جنس ایجنسی کے طور پر جانی جانے لگی۔
(گورڈن تھامس کی کتاب "موساد کے پوشیدہ جنگجو" کی تلخیص و ترجمہ)
* * *